حیرت بھری آنکھ میں چین

سلمیٰ اعوان

سلمیٰ اعوان

ناول:

تنہا (سابق مشرقی پاکستان)

لہو رنگ فلسطین

یہ میرا بلتستان (پاکستان کا شمالی حصہ)

ثاقب (۱۹۶۵ء کی جنگ کے پسِ منظر میں)

گھروندا اک ریت کا

زرغونہ

شیبہ

افسانوی مجموعے:

کہانیاں دنیا کی

بیچ بچولن

خوابوں کے رنگ

برف میں دھنسی عورت کچھ کہتی ہے

ذرا سنو تو فسانہ میرا

The Sky Remained Silent

سفرنامے:

سندر چترال

میرا گلگت و ہنزہ

مصر میرا خواب

روس کی ایک جھلک

عراق اشک بار ہیں ہم

استنبول کے عالم میں منتخب

سیلون کے ساحل، ہند کے میدان

اٹلی ہے دیکھنے کی چیز

شام امن سے جنگ تک

تیرے افق بے حدود و بے ثغور

دیگر:

جو دیکھا، جو سُنا، جو بیتا (تحریریں)

عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں (تحریریں)

باتیں دنیا اور دل کی (کالم)

حیرت بھری آنکھ میں چین

سلمٰی اعوان

بک کارنر جہلم

انتساب

چین گو اپنا یار ہے مگر جب مجھ جیسی حاسدی عورت کا ظرف چھوٹا ہو تو مخلص یار کی آسمان میں تھگلی لگانے کی کاوشیں بڑی چھبتی ہیں۔ چین میں دن تو جیسے تپتے توے پر بیٹھے کٹے تھے۔ ہیں اپنے لیڈروں کو کوسنوں کی سان پر چڑھایا، کہیں عوام کے لتے لیے، کہیں خود پر تبرّ بھیجے کہ بول بتا بطور فرد تو نے کیا کردار ادا کیا؟ اور کہیں اوپر والے کے سامنے شکووں کی پٹاری کھولی۔

کیا کروں میرے ربّ؟ بڑے بے آبرو ہو گئے ہیں دنیا بھر میں ہم۔ نظر کرم کیا اتنی مشکل ہے؟ اور ''کن'' کہنے میں تجھے اتنی دشواری۔ بتا تو سہی۔ کیوں؟

چینی شاعری وقت کے آئینے میں......

محبت کے بیج

جنوب کی سرزمین پر سرخ بیریاں اگتی ہیں
ہائے بہار میں بے چارے درختوں کا بوجھ کتنا بڑھ جاتا ہے
اکھٹا کرو انھیں کہ تمھاری مٹھی بھر جائے
یہ تمھاری محبت بھری میٹھی یادوں کو
پھر سے زندہ کر دیں گے

تم ہمارے آبائی شہر سے آئے ہیں
(تمھیں) معلوم ہونا چاہیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے
جس دن تم منقش کھڑکی سے جدا ہوئے
کیا سنہری آلوچوں والا درخت کھلا ہوا تھا

وانگ دی

(699-761)

جنوبی ساحلوں بارے خواب

تمھارے نظاروں کا میں بڑا مداح ہوں
طلوع صبح ساحل، دریا پر کھلے پھول
آگ سے زیادہ شفق رنگ دکھتے ہیں
بہار میں سرسبز لہریں اتنی نیلی اور شفاف دکھتی ہیں
کہ جیسے سفائر ہوں
اب تعریفوں کے سوا اور کیا کروں

پے چو آئی (Bai Juyi)

(772-846)

نوحہ بہار

گانے والے پرندے کو مارو
اسے شاخوں پر گانے مت دو
جب یہ گاتا ہے تو، میرے خواب چور ہو جاتے ہیں
اور یہ مجھے لیاؤسی [1] سے دور رکھتا ہے

چن چنگ چھو (Jin Changxu)

(721-714)

---

[1] لیاؤسی اندرونی منگولیا میں دریائے لیاؤ Liao کے مغرب میں واقع ایک علاقہ ہے۔

خاموش رات کے خیالات

بستر کے سامنے روشن چاندنی
فرش پر برف کے ٹکڑوں کا گمان پڑا
سر اٹھایا اور چاند کو دیکھا
سر جھکایا اور گھر بارے سوچا

لی پے (Li Bai)

اُسے یاد رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں
اس کے خط کی باقیات برداشت کرنے کا بھی حوصلہ نہیں
اس کے بارے خبر حاصل کرنے کا بھی کائی ذریعہ نہیں
خط بھیجنے کے لیے اُسے کہاں تلاش کروں
آسمانوں میں چانگ مجھے نہیں پہچانتی
صحن گرنے والے پھولوں سے بھرا ہوا ہے
غم ناک خوش بودار گھاس سے بھرا ہوا ہے
غم ناک خوش بودار گھاس سرسبز ہے
بہار کتنی تنہا تنہا سی ہے

ون تھنگین (Wen Tingyun)

(812-870)

چانگ: چاند کی دیوی

اگرچہ میں مرد پیدا نہیں ہوئی

مگر میری جان ان سے زیادہ طاقت ور ہے

ہم جیت نہیں سکتیں

قابلیت ولیاقت

مرد ہی اعلیٰ ترین عہدے سنبھالتے ہیں

لیکن ہمارے دل عہدے دار مردوں سے زیادہ خالص ہیں

میرا اندر اس زیادتی پر آگ کی طرح جلتا ہے

عیار مرد مجھے جاننے کا دعویٰ کیسے کر سکتےہیں

دلیری اس نوع کے عوارض کو کب جانتی ہے

چھوئے چن(Qui Jin)

(1857-1907)

میں وہ سمندر بننا چاہتا ہوں

جو اپنے آپ میں سورج کو سموئے

جو صبح کے گرم جوش قلم کو تھامے

اور بچوں کے سے انداز میں لکھے

اور مستقبل کے بارے میں پرامید رہے

گاؤلوشنگ(Guo Lusheng)

(1984)

فارم پر رہنے کے لیے واپسی

فطرتاً میں پہاڑوں اور پہاڑیوں سے محبت کرتا ہوں
حادثاً میں ایک گرد آلود جال میں گھر گیا ہوں
ایک بار ہی ایسا ہوا اور تیرہ سال بیت گئے
پنجرے میں قید پرندہ اپنے جھنڈ کے لیے ترستا ہے
تالاب میں مچھلی پرانے گہرے پانیوں کو یاد کرتی ہے

تھاؤ چھیان (Tao Qian)

(365-427)

اندر سے ایک آہ نکلتی ہے
کس چیز نے مجھے یہاں رہنے پر باندھا ہوا ہے
تصور میں اپنی جان من کو
اور جانے کیوں اِس گمان میں مبتلا ہوں
کہ وہ لوٹنے میں کسی کشتی میں مجھے چاہتی ہے
مگر وہ یہ کیسے جان سکتی ہے کہ اور کہیں غم زدہ یادوں میں گم ہوں

لیو یو آنگ(Liu Young)

(987-1053)

ترتیب

ذرا رکیے (سلمیٰ اعوان) 15
☆ میں تو چلی چین 17
☆ تھوڑا تھوڑا احوال ائیر پورٹوں کی دنیاؤں کا 25
☆ چھلانگیں مارتا آسمان کو چھوتا بیجنگ 33
☆ دیوارِ چین، چینی ثقافت و کلچر کا نمائندہ، اس کا لینڈ مارک اور تاریخی اثاثہ 41
☆ جانا ہمارا مسجد نیوجیا میں 56
☆ ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ سے ملاقات 64
☆ تھین آن من سکوائر سے جڑی یادیں 71
☆ چینی پاکستانی کلچر کی مشترکہ روایات و رسومات 79
☆ مادام، عمران خان کیا پیسے مانگنے آیا ہے؟ 90
☆ جانا میرا شاہراہ ریشم کی جانب 99
☆ عظیم شہر سیاہ 106
☆ شی آن، شاہراہ ریشم اور مسلم کواٹر 115
☆ پرانے بیجنگ کے کھانے، فوڈ سٹریٹ کی رونقیں اور وانگ فوجنگ سٹریٹ 128

☆ شہرِممنوعہ کے عشق کی پہلی کہانی 138
☆ تھیین آن من اور ریڈ سکوائر کے موازنوں میں نئے انکشاف 144
☆ موتھیان یوجانا بھی حسین تجربہ تھا 154
☆ تنگ شیاؤ سے ملنا 164
☆ ثقافتی انقلاب کی داستانیں 172
☆ شہرِممنوعہ سے ملاقات 181
☆ تسنیم، سلک مارکیٹ اور سپر پاور چین 189
☆ بیجنگ کا الف لیلوی ماحول اور کہانیاں 199
☆ اک نشہ، اک خمار سا لاؤشی ٹی ہاؤس کا 213
☆ گونگ چو کے لیے روانگی 221
☆ مسجد سعد بن ابی وقاصؓ 231
☆ دیکھنا دریائے پرل کے قیمتی موتی شائن کو 242
☆ چھوئے چن، چینی تاریخ کی پہلی انقلابی، عظیم فیمنسٹ شاعرہ 250
☆ پرانے بیجنگ کے گلی کوچوں کا حُسن 265
☆ ماؤ ایک حیرت انگیز کتاب 273
☆ آنا چی سے ملاقات 282
☆ چین کے مستی شاعر اور ان کی انقلابی شاعری 290
☆ مستی شاعروں کا ایک اہم شاعر گوچنگ 298
☆ چین کی قومی زندگی میں ستارہ بن کر روشن ہونے والا یان 310
☆ اختتامیہ، الوداع چین میرے ملک کے یارِ غار 318

ذرا رُکیے

آج کل میری ہر دوسری منچلی دوست کو کہیں افریقہ، کہیں مشرق بعید کے کسی نہ کِسی ملک جانے کی ہڑک اٹھتی رہتی ہے۔

''پلیز کسی ٹوئر شوئر کی منصوبہ بندی کرونا۔''

جوش وجذبے سے لبریز ایک بھرپور مسکراہٹ میرے اندر سے پھوٹتی ہے اور میرا دل ہیگرڈ Haggard کے ہوریس ہولی Horace Hollyاور لیوونیسی Leo vincey کے روپ دھارنے کو چاہنے لگتا ہے۔ زوروشور سے " کہاں چلیں اور کون کون ساتھی بنے گا" جیسے سوالوں پر بحث چھڑ جاتی ہے۔ تب بھول جاتی ہوں کہ عمر کے اِس حصّے میں ہڈیوں گوڈوں کے حالات کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ دل گو اللہ کے کرم سے درست ہے مگر کمزور کمزور سا بھی رہنے لگا ہے۔ تاہم اڈاری مارنے کی ھمک اور تڑپ چین لینے نہیں دیتی۔ سمجھانا پڑتا ہے سکون کر۔ اچھل کود مضر ہے اب۔ مگر کروں کیا کہ صورت کچھ غالب کے اِس شعر کی عکاس ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

سفر ہمیشہ لکھنے کے لیے کیے اور رُل کھل کر کیے۔ اور اپنے تئیں اِس سوچ اور عمل کو ہی بہترین جانا۔ تاہم ابھی حال ہی میں کچھ تنقید نگاروں بارے جان کر حیرت ہوئی کہ ان کے نزدیک یہ غلط ہے۔ اب غلط سلط کی تو بحث میں مجھے نہیں پڑنا اور نہ ہی وضاحتیں پیش

کرنی ہیں۔ ہاں اتنا سا ضرور کہنا ہے کہ اظہار خود نمائی کے انداز قدرت نے بھی اپنے بندوں میں جداگانہ وویعت کیے ہیں۔ اور جب جنگل میں مور ناچے تو دیکھنے والی آنکھ کا ہونا بھی ضروری ہے۔

استنبول کے کیپلی کارسی بازار کے ایک بینک میں کرنسی کی تبدیلی میں ہیرا پھیرا ہوگئی تھی۔ سیما پیروز ساتھ تھی۔ تین دن اکیلی نے تھانوں کے چکر کاٹے۔ سیما جھلاتے ہوئے کہتی تھی۔

''فائدہ؟ پیسہ بھی اجاڑ رہی ہو اور وقت بھی۔''

''تم بیوروکریٹ کی بیگم نہیں سمجھو گی۔''

میرے حسابوں تحریر کو زندگی اور رنگینی ملتی ہی ان تجربات سے ہے جو ہر دن موتیوں کی طرح آپ کی جھولی میں گرتے ہیں۔

ویسے خدا کی دنیا دیکھنے کا شوق بھی سدا ہم رکاب رہا۔ بلکہ اگر یہ کہوں کہ سرِ فہرست رہا تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اٹلی کی سیاحت میں نے اکیلے کی۔ پچیس دن بعد لوٹی تو محسوس ہوا تھا جیسے حج کر کے آئی ہوں۔ اُس سے جڑنے اور اُسے ہر پل دل میں بسانے کا کام اگر حرمین میں ہوتا ہے تو یہ کام میں نے میلان، روم، وینس پیسا اور لوکا میں کیا۔

آخر میں ایک معذرت بھی قبول کرلیں۔ چینی زبان بہت مشکل لگی۔ صحیح تلفظ والی آوازیں کہیں دس بار سننے پر واضح ہوتیں۔ بیٹی کی فیملی کی تو مت ماردی تھی۔ چینی اُستاد کی خدمات بھی لاپروائی کی نذر ہوگئیں کہ کاغذ ہی گما بیٹھی۔

تین سال ہوگئے ہیں اس کتاب کی گھمن گھیریوں میں چکریاں کھاتے ہوئے اب جو بھی ہے اور جیسی بھی ہے کی بنیاد پر قبول کرلیں۔

دعائیں

باب نمبر:۱

میں تو چلی چین

- بل کلنٹن اور چیلسی کو دیوار چین پر بھاگتے، چھلانگیں مارتے دیکھ کر کلیجے پر چھرے چھریاں چلنے لگی تھیں۔
- اسلام آباد چینی سفارت خانے میں گھیر دار شلواروں اور قمیضوں والے پاکستانی کروڑ پتی نہیں ارب پتی ہیں۔
- مرن جوگے ٹھٹھا اڑاتے تھے لو یہ باندری چین جائے گی۔

وہ مشہور زمانہ کہاوت تو آپ نے ضرور سُنی ہوگی۔ ارے بھئی وہی نا۔ ایک دیہاتی خوبصورت چادر اوڑھ کر میلہ دیکھنے گیا اور وہاں اس کی چادر کسی نے چھین لی۔ واپسی پر ہمسائے نے پوچھا۔

''ہاں تو بھئی سُناؤ میلہ کیسا تھا؟

''لو میلہ کب تھا وہ؟ نرا میری چادر لوٹنے کا بہانہ تھا۔''

کچھ ایسا ہی معاملہ میرے ساتھ بھی تھا۔ اگست کے ایک حبس بھرے دن میری اکلوتی بیٹی سعدیہ فون پر تھی۔ لہجے میں اس موسم کی کھٹی کھٹی تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''اماں عمران کی پروموشن کے ساتھ اس کی تقرری ٹیک اتاشی کے طور پر پاکستانی سفارت خانے بیجنگ میں ہوگئی ہے۔ فیملی کا ساتھ جانا ضروری ہوگا۔ اُف بچوں کی سٹڈیز بڑے مشکل مرحلوں میں ہے۔ وہ تو بیچارے ڈسٹرب ہو جائیں گے۔ کیسے وقت یہ پوسٹنگ

آئی ہے؟''

میں جیسے ہونٹوں پر تالہ لگائے اُسے سُنتی تھی۔ کہنا چاہتی تھی۔

''اے او میری بھولی بھالی نور چشم اب میں منہ پھاڑ کر یہ نہیں کہہ سکتی ہوں کہ یہ اوپر والے نے تیری آوارہ گرد ماں کے سیر سپاٹے اور اُسے ایک نیا جہان دکھانے کا شاہی بندوبست کیا ہے۔ تیری ماں ہمیشہ ہی تو اُسے شکووں کی سان پر چڑھائے رکھتی تھی۔ اجنبی سرزمینوں پر خجل خواری کے طعنوں سے بھی اُسے بڑا چھلنی کرتی تھی۔ اُسے بھی ترس آگیا رحمت نے جوش میں آکر کہا ہوگا کہ بی بی چل تو بھی عیش کر لے۔''

سالوں پہلے دیوارِ چین پر جب بل کلنٹن اور اس کی بیٹی چیلسی کو بھاگتے دوڑتے دیکھا تو جیسے کلیجے پر چھریاں سی چلنے لگی تھیں۔ اب کوئی اللہ کا بندہ پوچھے کہ آخر اِن چھریوں کے چلنے کی کوئی وجہ، کوئی سبب تو ہوگا۔ اور وہ کیا ہے؟ بتانا ذرا مشکل ہے۔ مگر آپ سے کیا پردہ؟ بس جان لیجیے کہ بڑی ہی لالچی اور حاسدی سی ہوں۔ دنیا کے وہ عجائبات جن کی دید اور جن پر قدم دھرنے سے میں ابھی تک محروم ہوں۔ اُن پر لوگوں کے چلنے پھرنے کے مناظر بس اندر جلتی سیر سپاٹے کی آگ کو بھانبڑ مچانے میں بدل دیتے ہیں۔ بھٹی میں بھنتے دانوں کی طرح تڑخنے اور اُچھلنے کودنے لگتی ہوں۔

ناشکری سے بھرا جملہ ہونٹوں پر مچلنے لگتا ہے۔ آخر اِن کی جگہ میں کیوں نہیں ہوں؟

حسرت اور جلنا کڑھنا کبھی کبھی اِس بات پر بھی ہوتا تھا کہ دیکھو تو ذرا لوگوں کے بیٹے بیٹیاں باہر کے ملکوں میں سیٹ ہیں۔ والدین کو بُلاتے ہیں۔ مہینوں اُنہیں اپنے پاس رکھتے اور خوب خوب سیر سپاٹے کرواتے ہیں۔

جب جب داماد کے کسی یار دوست کی امریکہ یا چین میں تقرری کا سُنتی تو بیٹی سے

پوچھنا ضروری سمجھتی۔

''اے ہے تمہارا میاں اتنا لائق فائق اور ذمہ دار افسر سمجھا جاتا ہے۔اسے کہیں نہیں بھیجتے؟''

''ارے توبہ کریں امی۔لاہور جیسے سکول سوائے کراچی کے کہیں نہیں۔کوئٹہ اسی لیےنہیں گئی تھی کہ بچے ڈسٹرب ہوجائیں گے۔اور جانتی ہیں؟ وہ کھلکھلا کرہنسی تھی۔پورے بیس Base کوہم میاں بیوی کے رشتے کی دال میں کچھ کالا کالا بڑا واضح محسوس ہونے لگا تھا۔ایک دفعہ تو بیس کمانڈر تک نے مشکوک سے انداز میں پوچھ بھی لیا۔

ارے یار مانی یہ تیرا کنوار کوٹھا مجھے بڑا کھلتا ہے۔تیرے عذر لنگ والے بہانے کہ والدین کوکوئٹہ کا موسم موافق نہیں۔اور بچے لاہور کے سکولوں میں سیٹ ہیں کچھ جی کونہیں لگتا۔سچ سچ بتا بیچ کا مسئلہ کیا ہے؟ اگر کچھ گڑ بڑ ہوگئی ہے۔بات کچھ الجھی گئی ہے تو یار مل جل کر سلجھا لیتے ہیں۔''

عمران تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے تھے۔

اب چین تقرری کا سُن کر میرا دل تو مانو جیسے بلیوں اُچھل رہا تھا۔پر اُسے ہراساں دیکھ کر ہونٹوں پر تالے لگالیئے یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں کہے نا۔

لو دیکھو میری ماں کو میری نہیں اپنے سیر سپاٹوں کی پڑی ہوئی ہے۔

اب دن رات دیکھ رہی تھی کہ ہَپوہان ہوئے پھر رہی ہے۔کہیں بیجنگ کے اسکولوں بارے معلومات،کہیں اُن کے معیار بارے جانچ پڑتال،کچھ اُداسی،کچھ تفکّر۔تھوڑا بہت ساس سسر کی تنہائی کا بھی خیال کہ دونوں اِس بہو کے ساتھ زیادہ قربت محسوس کرتے تھے۔

چلیئے سب مرحلے طے ہوئے اور ایک دن ماشاءاللہ وہ عازم چین ہوئے۔

پر ہوا یہ کہ جانے سے قبل وہ اپنی ملازمہ میری محبت میں یہ کہتے ہوئے کہ اِسے آپ اپنے ذاتی کاموں کے لیے رکھیئے۔ بدن اور سر کی مالش باقاعدگی سے کروایا کریں۔ اچھی لڑکی ہے۔

میں اُسے کہنا چاہتی تھی کہ ساری زندگی جوتیاں چٹخانے والی عورت کو اِن عیاشیوں کی ذرا عادت نہیں اور نہ ہی وہ ان کی عادی ہونا چاہتی ہے۔ وہ اپنے سب چھوٹے موٹے کام خود کرنے کی خواہش مند رہتی ہے تاکہ اس کے گٹے گوڈے ہاتھ پاؤں موبائل رہیں۔

پر کرتی کیا؟ وہ اسے میرے سر منڈھنا چاہتی تھی کہ لڑکی نہ اپنے گاؤں اور نہ ہی کسی اور کے گھر کام کرنے کے لیے راضی تھی۔ دراصل تو وہ ساتھ جانے کے لیے مری جا رہی تھی۔

''ہائے جی مجھے تو اپنے اٹیچی کیس میں بند کر کے ساتھ لے جائیں۔ ہائے جی کاش میں جہاز کے پروں سے لٹک جاؤں۔

اب اٹھارہ سالہ لڑکی کے منہ سے ایسی خواہشوں کا سُن کر مجھ جیسی ماں بیچاری کیا کہتی کہ یہ دنیا اِس ناہنجار وحشی انسان کی طاقت اور اُس کی توسیع پسندی کی ازلی بھوک کے سامنے کتنی لاچار اور بے بس ہوگئی ہے۔ دھرتی اور اس کے باسی کہیں چھوٹے، کہیں بڑے ٹکڑوں میں بٹ گئے ہیں۔ ان کے داخلی دروازوں پر اجازت ناموں کے بڑے بڑے قفل چڑھ گئے ہیں جنہیں ویزا کی چابیوں کے بغیر کھولا ہی نہیں جا سکتا۔

میرے گھر کی نوکرانیاں بڑی من موجی قسم کی ہیں۔ چھوٹی بہو کے ساتھ بیٹھ کر ٹھسے سے ناشتہ کرتی ہیں۔ یہ نئی لڑکی ماشاءاللہ سے اُن سے بھی چار ہاتھ آگے نکلی۔ سارا دن کمروں میں گنگناتی پھرتی۔ بچوں کے ساتھ درختوں پر چڑھتی، کرکٹ کھیلتی اور سارے

لونڈوں والے لفنگے کام کرتی۔

''لو یہ میری خدمت کے لیے چھوڑ کر گئی ہے۔ڈرتی ہوں کمبخت ماری کہیں ہڈی وڈی ہی نہ تڑوالے۔''

اب فون کیا کہ لڑکی کو کچھ دبکا شبکا لگاؤ۔اور پوچھا بھی۔

''ان ملٹری اتاشیوں کو ایک خادم ساتھ لے جانے کی اجازت تو ہوتی ہے۔تم لوگوں کا کیا مسئلہ ہے؟''

سُننے کوملا کہ آرمی والوں کو یہ سہولت میسر ہے مگر ایرفورس کو نہیں۔

دھیمے سے سیٹ ہونے کا بھی پوچھا کہ پھر اگلی بات اپنی کروں گی۔

لو جی وہاں تو ایک دل گدازسی داستان تھی کہ جن کی جگہ گئے ہیں وہ ابھی ادھر ہی ہیں۔ ہینڈ نگ ،ٹیکنگ دن لے رہی ہے۔گھر گو بڑا اور کھلا ہے مگر فی الحال تو ڈھائی کمرے ان کے پاس ہیں اور کچھ اتنے ہی ہمارے پاس۔ ہفتہ بعد روانگی ہے۔ پھر گھر کی ڈینٹنگ پینٹنگ ہوگی۔ابھی تو دعوتیں اڑا رہے ہیں۔رہا موسم میرے لیے تو خوشگوار ہی ہے البتہ آپ کے لیے قدرے ٹھنڈا ہے۔ ہاں امی لڑکی کو بُلوانے کا سوچ رہے ہیں۔ یہاں نوکر ضرور ہیں۔کام بھی ذمہ داری سے کرتے ہیں۔مگر مہنگے ہیں۔

اب تھی ناماں کے لیے آزمائش۔

بہرحال لڑکی کی تلی (ہتھیلی) پر پیسے رکھے اور اُسے کہا۔

''اپنے گھر جاؤ اور پاسپورٹ بنواؤ۔''

لڑکی نے سُنتے ہی قالین پر قلابازی لگائی۔سیدھی ہوئی اور بولی۔

''ماں جی جانے سے پہلے زردے کی دیگ پکوا کر اپنی موئی ماں کے شریکے میں خود بانٹنے جاؤں گی۔مرن جوگے میرا ٹھٹھا (مذاق) اڑاتے تھے کہ لو یہ باندری چین جائے

گی۔‘‘

کِھل کِھل کرتے ہوئے اُسے پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔جب ذرا نارمل ہوئی تو رازدرانہ انداز میں بولی۔

’’ماں جی دراصل باجی تو گئی ہی اس لیے ہیں کہ میں نے وہاں جانا تھا۔‘‘

اب مجھے ہنسی آئی۔واہ کیا حسین سا حُسن اتفاق ہے۔ماں سمجھتی ہے بیٹی اس کے لیے جارہی ہے اور ملازمہ کو یقین ہے کہ اس کی مالکن اس کے لیے چین بھیجی جارہی ہے۔رہی بیٹی تو اس کے نصیب میں بھی کچھ لکھا گیا ہے اس پر دونوں کا دھیان نہیں۔

لمبے چوڑے جھمیلے تھے جنہیں اپنے حسابوں حل کرکے اسلام آباد روانہ ہوئی۔کمبختوں نے لاہور میں کسی جیری،فیڈکس یا ٹی سی ایس کی بھی خدمات نہیں لی ہوئی ہیں۔چند مہینے پہلے سارا کام مینوئل تھا۔اب آن لائن کردیا مگر حاضری سفارت خانے میں لازمی ٹھہری۔

سفارت خانے کے ویزا سیکشن والے بیرونی حصّے میں بظاہر ماٹھے سے لوگوں کی لمبی قطاریں تھیں۔اُن کے اندر خانے کے احوال ہوسکتا ہے۔کروڑ پتیوں کے حسابوں میں جاتے ہوں۔مگر ظاہراً حال حُلیے کُلّی طور پر’’بیچاروں‘‘ کی صف والے تھے۔سیکورٹی پر متعین پاکستانی گارڈ ہی فرعون بنے ہوئے تھے۔اُن کے دبکے شبکے عام لوگوں کو ہراساں کیے دیتے تھے۔تاہم میں نے تو دومونڈھے مارے اور ذرا رعب دار انداز میں کہا۔

’’جانے دو گیارہ بجے کا ٹائم ہے۔‘‘

اسی گُر کے ساتھ دونوں اندر پہنچ گئی تھیں۔سفارت خانہ ضرور چینی تھا مگر صفائی ستھرائی سے لے کر بہت سے دیگر معاملات میں پاکستانی کلچر کا نمائندہ تھا۔اندر کا کراؤڈ بھی باہر جیسا ہی تھا۔بس تین بچیاں حجاب میں لپٹی ملیں۔بات چیت سے معلوم ہوا کہ دو وہاں

پڑھ رہی ہیں اور تیسری جاب کے لیے جا رہی ہے۔نمبر کی پکار پر جب کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوئیں تو کمبخت مارے نے لڑکی کی تو صورت دیکھتے ہی کہہ دیا کہ یہ تو نہیں جاسکتی۔

فوراً جی چاہا کہوں میاں ایسی بھی کیا اتابی شتابی۔شکل ضرور مسکین سی ہے پر اندر ذرا مسکین نہیں۔اور ہاں ذرا ساتھ لگے ایمبیسی کے کاغذات بھی دیکھ لو۔

تیزی سے الٹے پلٹے ہاتھ چلے۔ پھر انہیں ایک طرف رکھا اور بڑی بی کے پلندے جانب توجہ کی۔چلو شکر یہاں تھوڑی سی نرمی برتی گئی۔ایمبیسی کا خط ساتھ ہونے کی وجہ سے کیس سفیر کو بھجوادیا گیا۔چلو اب بیٹھو اور انتظار میں سوکھو۔

کوئی دو گھنٹے بعد کھڑکی کے پاس آنے کا اذن ملا۔نسرین کا پولیس سرٹیفیکٹ ضروری اور بڈھی کو استثنائی ملی۔اب وجہ کیا تھی؟ عمر یا دیگر ملکوں کے ٹھپوں کی تعداد۔**واللّٰہ اَعْلَمُ بِالصّواب۔**

تقریباً نو ہزار تین سو سنتالیس میں پڑنے والے اِس ناکام چکر نے دل بڑا پریشان کیا۔نسرین کی بوتھی مکمل طور پر لٹکی ہوئی تھی۔اس کا خیال تھا کہ اس کی ماں کا شریکہ اپنے ٹونے ٹوٹکوں سے اس کی راہیں کھوٹی کر رہا ہے۔ساری عمر ان بے سروپا باتوں پر یقین نہ کرنے والی اِس عورت کو اُس نوجوان لڑکی کو سمجھانا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔اُس کی بات میں بھی وزن تھا کہ تھانے کچہری میں اُس کے غریب بڑے باپ اور بھائی کی کِس نے سُننی ہے۔

واقعی اس بات پر شاید غور نہیں کیا تھا۔اب جو سوچا تو چھوٹی سی لڑکی کے ذہن میں بہت ہی سچی بات کھلبلی مچا رہی تھی۔اپنا ایک سسرالی عزیز یاد آیا جس کی ساری زندگی قبولے اور وہاڑی کے تھانوں میں تھانیداری کرتے گزری تھی۔اُسے فون کھڑکایا۔وہ کام جو پہاڑ جیسا نظر آتا تھا وہ صرف دو دنوں میں بہت سہولت سے ہوگیا۔

لڑکی کھلکھلاتی ہوئی باپ کے ساتھ آ گئی۔ابھی ایک اور بڑا سیاپا سر پر کھڑا تھا اور

وہ ویزا اپروٹیکٹر آفس لاہور میں لڑکی کی بمعہ اس کے باپ کے حاضری تھی۔ جہاں حلفیہ بیان ہونا تھا کہ وہ لڑکی کو اپنی مرضی سے بھیج رہا ہے۔

سچی بات ہے نسرین اگر منہ پھٹ اور ہتھ چھٹ قسم کی نہ ہوتی تو بیچاری کے چین جانے کی کہانی نے اوندھے منہ زمین پر آ گرنا تھا۔ وہاں تو نالائق اہلکاروں نے لڑکی کی تنخواہ کا معاملہ پچاس ہزار تک اٹھا دیا تھا۔ لڑکی خود میدان میں کُودی اور بولی۔

''نوکر کا تو میرے اوپر یونہی ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ وگرنہ تو میں ایک طرح اُن کی لڑکی ہی ہوں۔ میری شادی وادی سب اُس میاں بیوی نے ہی کرنی ہے۔ میرے باپ کا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنا اچھا بھلا میں خود سمجھتی ہوں۔ پانچ سال سے تیرے میرے گھروں میں کام کر رہی ہوں اور لوگوں کو پڑھنا سیکھ گئی ہوں۔ صاحب مہربانی کریں اور ٹھپہ لگائیں۔''

صاحب بھی کسی بھلی ماں کا تخم تھا۔ فوراً تعمیل ارشاد ہوگئی تھی۔

زردے کی دیگ پکانے کی نسرین کی آرزو کو بہرحال میں نے اڈہ لگنے نہیں دیا۔ ایسا اس کی ہمدردی میں ہرگز ہرگز نہیں تھا بس اپنی ہمدردی مطلوب تھی کہ آخر تو یہ ہر جانے کی کڑوی گولی مجھے ہی نگلنی تھی۔

چلو خدا کا شکر کہ یہ چھوٹے بڑے پل صراط طے ہوئے اور ہم دالوں، مصالحوں، چاول کے بوروں سے لدے پھندے ایر پورٹ پہنچ گئے۔

☆☆☆

باب نمبر:۲ تھوڑا تھوڑا احوال ائیر پورٹوں کی دُنیاؤں کا

- چین میں ڈاکٹری پڑھنے والے جیالے بچوں کی تو ایر پورٹ پر جیسے بہار آئی پڑی تھی۔
- پاکستانی طلبہ کو کسی پلاننگ، کسی تربیت کے ساتھ نہیں بھیجا جاتا ہے۔
- عروج کی طرف جاتی پاکستانی صنعت کے لیئے 1972-73 تباہی کا زمانہ تھا۔

سفر کے دوموڈ ہمیشہ سے میرے لئے بڑی کشش، عجیب سی سنسنی اور کچھ کچھ تھرل جیسے جذبات واحساسات کا نمائندہ رہے ہیں۔ٹرین اسٹیشن کی دنیا کا اپنا حسن اور ایئر پورٹ دنیا کی رنگینیاں اپنی جگہ، تاہم یہ ذریعہ سفر جس میں ماٹھے لوگوں کے احساس کمتری کی ''میں'' کی خاصی تسکین ہوتی ہے کہ بیچارے اپنے ہینڈ بیگوں اور اٹیچی کیسوں سے مہینوں اُن ٹیگوں کو اُتارنے کے بجائے اُن کی نمائش کرتے ہیں کہ واقفان حال جان لیں کہ وہ بھی خیر سے بڑی اونچی شے ہیں۔

نسرین کو رخصت کرنے اس کا پورا خاندان گاؤں سے آیا ہوا تھا۔ان کے چہروں پر مسرت کی تمتماہٹ تھی تو کچھ کی آنکھوں میں حسرت اور حسد بھی۔ بقول نسرین کے وہی بات اس کے بھاگ ہی اُونچے تھے۔

سچی بات لڑکی تھی ہی بڑی بھاگوان۔ابھی چند دن پہلے سعدیہ کی کال یاد آئی تھی۔ ہنستے ہوئے بتاتی تھی کہ یہاں بھی نسرین کی آمد کے بڑے چرچے ہیں۔دوست احباب سب پہلی بات اس ماہ جبین کے حوالے سے ہی کرتے ہیں۔

''تو بھئی کب آ رہی ہے آپ کی نسرین بیگم۔''

''ہاں تو بھئی کیوں نہ پوچھیں گے سیاپے تھوڑے ہیں ان لڑکیوں کو بھیجنے کے۔''

مجھے بھی پھپھولے پھوڑنے کا موقعہ مولا دے۔

''اب اللہ بیلی رب راکھا'' کہہ کر اندر داخل ہو گئے تھے۔

جب کاؤنٹر کے سامنے کھڑے باری کے انتظار میں تھے۔ دفعتاً قدرے مانوس سی صورت کو فوراً آنکھوں نے پکڑا۔ قریب ہونے پر حسینہ معین کا احساس ہوا۔ حسینہ کے ساتھ بھی اب ہماری طرح کچھ تھوڑی سی کے سلسلے منتھی ہو گئے ہیں۔ تھوڑی سی بھلکڑ، تھوڑی سی حواس باختہ اور کچھ کچھ سنکی سی۔

ہیلو ہائے کے بعد پوچھا کہ ''بھئی ارادے کہاں کے ہیں؟''

پتہ چلا اسلام آباد جا رہی ہیں۔ خیر لہجے میں اتنا تفاخر تو نہیں تھا کہ پاکستان آرمی نے 23 مارچ کے حوالے سے بُلایا ہے۔ ہاں البتہ اس پر ضرور زور تھا کہ ہر سال ہی بڑے اصرار سے مدعو کرتے ہیں۔

''بھئی آپ وی آئی پی جو ٹھہریں۔''

اب ان کی بورڈنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مشین پر اُن کا فالسئی رنگ کا اٹیچی کیس دھرا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے طول وعرض اتنا تھا کہ میں دونوں بازوؤں کو جی کھول کر جتنا پھیلا سکتی تب بھی وہ اُس میں بمشکل ہی سماتا۔ دہل کر میں نے اس کے دھان پان سے وجود کو دیکھا۔ لمبی سی ''آہ میں اُف'' کہا۔

اب کاونٹر کلرک اور ان کے درمیان مکالمہ شروع ہو گیا۔ پہلے مرحلے میں سامان زیادہ ہے کے سلسلے میں 3500 ادائیگی کریں کے لیے کہا گیا۔ جواباً انہوں نے پاک فوج کی مہمان ہونے کا جواز دیا۔ سیٹ پر بیٹھا ڈیوٹی کرتا آدمی بھی کوئی بڑا ایماندار قسم کا ہٹیلا اور

جھگڑالوسا تھا۔اُن کا یہ کہنا تو مانو جیسے گولے بارود کی طرح پھٹا۔تلخی سے بولا۔

''بی بی میرا اس سے کیا لین دین؟ وزن زیادہ ہے۔پیسے بھریں۔آپ چاہتی ہیں مجھے یہ ہرجانہ پڑے۔''

اب بحث و مباحثہ طول پکڑ رہا تھا۔اُس نے اپنے مینجر کی طرف دھکیل دیا۔اُن کے پاس گئیں وہ آیا۔1500 کی رعایت اور 2000 کا کہہ کر معاملہ نپٹا دیا۔

سوال ضرور دل میں اٹھا تھا۔

''ہم کب ایک ذمہ دار قوم بنیں گے؟''

پچپن منٹ کی فلائٹ نے پورا سوا گھنٹہ لیا۔کہیں ڈیرہ اسماعیل خان پر سے اڑتے ہوئے محفوظ راستوں کی تلاش ضروری تھی۔ظاہر ہے اب سفر نے طوالت تو پکڑنی تھی۔

''میرے مولا کون ان دو پاگل گوانڈیوں کو سمجھائے کہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑت تو کچھ ایسی ہی ہے جیسی ناخن اور ماس ہو۔اب ستّرے بہترے تو ہو گئے ہو۔کچھ عقل کو ہاتھ مارو۔ایک دوسرے کو مانو اور جینا سیکھو۔ہر وقت دوکان داریاں ہی چمکاتے رہتے ہو۔ایک کی انگلی نے اگر تماشہ کرتے ہوئے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا تو سمجھ لو دوسرے کا بیڑہ غرق ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا بھی ہو گا۔تو لازم ہے کہ زیادہ مہم جوئیاں اور سیاسی تماشے دکھانے سے بچا جائے۔''

رات کے گیارہ بجے خیر سے اسلام آباد کے نئے ایرپورٹ پر ڈولا اُترا تو ساری خوش فہمیوں اور انجوائے کرنے کا تھرل موت کی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا کہ پتہ چلا۔خیر سے سامان لو۔اٹھاؤ اور ہوٹل چلو۔یا اللہ موسیٰ ڈریا موت توں تے موت کھڑی اگے۔اب سامان کی اگرائی کے لیے چلے تو دیکھا کہ چند نوجوان بچے بچیاں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہمارے دائیں بائیں سے شوں شوں کرتے گزر رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ خیر سے چین

میں ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں۔ سامان والے ہال میں کنوئیر بیلٹ کے گرد کھڑے ماشاء اللہ سے اِن جیالوں کی بہار تو آئی پڑی تھی۔

مزید جانکاری کا تجسّس کشاں کشاں اِن کے پاس لے گیا اور شروع ہوا کُرید اور سوال جواب کا سلسلہ۔ جانا کہ ڈاکٹری کے ساتھ کچھ انجینیرنگ ، بزنس ایڈمنسٹریشن، اکاؤنٹس اور ماحولیاتی مطالعہ کے طالب علم بھی ہیں۔ اب یہ تو پوچھنا فضول تھا کہ پاکستان کی بجائے چین میں کیوں پڑھ رہے ہیں؟ ایک وجہ تو معلوم ہی تھی کہ میڈیکل اور انجینیرنگ میں میرٹ پر نہیں آئے ہوں گے۔ اُن کے مطابق چین میں پرائیوٹ میڈیکل اور نان میڈیکل تعلیم بمقابلہ پاکستان بہرحال سستی ہے۔ بیجنگ سے ملحقہ شہروں میں چھ، سات لاکھ سالانہ اور کوئی پچیس ہزار کا ماہانہ ہوسٹل خرچہ۔ چلو یہ تو خوشی کی بات تھی کہ پاکستانی والدین نے یہ حدیث کیا لڑکوں بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی پلّے سے باندھ لی ہے کہ بھئی علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے۔

اب میرے جیسی کے لیے یہاں تک ہی ٹھہرنا مشکل تھا۔ معیار تعلیم ، ذریعہ تعلیم اور دونوں نظاموں کے موازنے بارے بھی تو پتہ لگنا چاہیے۔

ذہین لڑکوں کا جواب تھا۔ ذریعہ تعلیم تو بے شک انگریزی ہے۔ اساتذہ بھی زیادہ تر پاکستانی، بنگلہ دیشی، نیپالی اور ملائی ہیں۔ تاہم تھیوری پر زور ہے۔ عملی کام صفر۔ میڈیکل کے بعد پاکستان میں ٹیسٹ دینا پڑتا ہے۔ چینی کتنے لوگوں کو آتی ہے اور چینیوں کو کیسا پایا ہے؟ کچھ کا جواب تھا ہماری یونیورسٹی میں پاکستانی ہی اتنے ہیں کہ ہمیں چینیوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ یعنی چینی طلبہ سے ربط و تعلق کم کم، ایک طرح نہ ہونے کے برابر۔ کچھ کا کہنا تھا بس اچھے ہیں۔

جوابات نے مجھے بتا دیا تھا کہ بھیجنے سے پہلے تربیت نہیں کی گئی۔ کسی پلاننگ سے

نہیں آئے۔ جانتے نہیں ہیں کہ پاکستان کے سفیر ہیں۔ چین جیسے دوست اور قابل رشک ترقی کرنے والے ملک سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ نجی طور پر ساری کوششیں ہیں کہ بیچارے سادہ لوح ماں باپ یہ فخر کر سکیں کہ دھی یا پُتر پڑھنے کے لیے چین گیا ہے۔

چلو بھاری بھر کم سامان کے ٹرالی میں ڈھونے میں نوجوان بچوں نے مدد کر دی۔ لفٹوں کے اندر ٹرالیوں سمیت داخل ہو کر باہر آنے اور عقبی سمت کھڑی ہوٹلوں کی سوزوکیوں میں سامان کی لدلدائی ہوگئی۔ تاہم روالپنڈی صدر کے رائل پیلس ہوٹل تک کے درمیان چالیس میل کے ٹوٹے کا سفر جب بدن تھکن سے چور اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہوں کرنا بڑا ذلیل کام تھا۔ یہ ہم نے بصد شوق نہیں بہ امر مجبوری کیا۔ ہوٹل اچھا تھا۔ لفٹ بند اور کھانا تقاضے کے بعد ملا تھا۔ وہ بھی نرا بے سوادا۔ ''پراں مارو مگروں لدؤ'' جیسے محاورے کا سچا ترجمان تھا۔

اب مزید کچھ باتیں حیرت میں اضافے کا باعث تھیں۔ لڑکے لڑکیوں کے درمیان جو تعلق اور قربت کے منظر دیکھنے کو ملے تھے۔ وہ کچھ کہانیاں تو ضرور سُنا رہے تھے مگر اُن کی گہرائی ایسی شدید ہے۔ اس کا احساس مجھے کمروں کی الاٹمنٹ کے وقت ہوا۔

پہلی لعن طعن خود کو کرتے ہوئے کہا۔

''چل ہٹ پرے ہو۔ اپنے وقت نہ ڈھونڈ۔ مگر کیا کرتی؟ فطرت سے مجبور تھی۔

تین بجے سوئے تو ساڑھے چار بجے تیز الارم سے اٹھ کر جب نیچے لاؤنج میں آئی تو طلبہ جوڑوں کی آنکھوں میں کہانیاں تھیں۔ جی سر پیٹ لینے کو چاہ رہا تھا۔ کیا والدین جانتے ہیں کہ کنواری بیٹیوں اور بیٹوں کی شب بسری کہاں ہو رہی ہے؟ ایرپورٹ کے سارے مخصوص تھکا دینے والے مرحلے طے کر کے شکر شکر کرتے ہوئے لاؤنج میں آ بیٹھے۔ یہاں طلبہ کے علاوہ پختہ عمر اور جوان مسافروں کی ایک نئی کھیپ تھی۔ ان کے چہرے مہرے

،لباس، حال احوال انہیں کہیں پنجاب کے کم ترقی یافتہ شہروں اور کہیں خیبر پختون خواہ سے تعلق کا بتاتے تھے۔ اب اِن لوگوں سے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔

معلوم ہوا کہ بزنس کرتے ہیں ۔ چائنہ آنا جانا اُن کے لیے معمول کی بات ہے۔ موتیوں، ہوزری، گارمنٹس، بیگز، پھلوں ،سبزیوں، دفاعی آلات وغیرہ وغیرہ۔ اب میرے سینے میں بھانپڑ نہ مچتا تو اور کیا ہوتا؟ کپاس پیدا کرنے والا ملک جس کا لائل پور کبھی پاکستان کا مانچسٹر تھا۔ زرعی ملک جس کے پھل اپنے ذائقے میں بے مثال، جس کی سبزیاں بہترین۔ پاکستانی گاجر اپنی مٹھاس رنگ اور ذائقے میں منفرد۔

عثمان پیرزادہ یاد آئے تھے جن کی بیٹی پاکستانی گاجریں اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال کر کینیڈا لے گئی کہ اپنی دوستوں کو دکھا سکے کہ اس کے ملک کی یہ سبزی کتنی خوش رنگ اور ذائقے دار ہے۔ اب اس ملک کی منڈیوں میں بہت سے پھل اور سبزیاں باہر سے آتی ہیں۔ یہ پھل جن کے ذائقے بے سوادے جنہیں کھا کر منہ بنے۔

پروردگار ہماری نالائقیوں نے ہمیں کہاں پہنچا دیا ہے؟

پاس بیٹھے ایک خوش شکل تیز طرّ ار لڑکے سے بات چیت ہوئی پتہ چلا کہ وہ گیس سلنڈروں کی بکنگ کے لیے جا رہا ہے۔ اب بھلا سوال کیوں نہ ہوتا؟ ہوا کہ یہ سلنڈر کیا پاکستان میں نہیں بن سکتے؟

بن سکتے تھے مگر اب نہیں۔ 1972-73 میں بننے بنانے کے عمل کا آغاز ہونے کی ضرورت تھی۔ ہر صنعت غلطیاں کرنے، سیکھنے اور چیزوں کو بہتر کرنے کے عمل سے گزرتی ہے۔ چالیس سال کے عرصے میں یہ ان مرحلوں سے گزر کر بہت آگے چلے گئے ہیں۔ زمانہ تو اب آرٹیفشل انٹیلیجنس کا آ گیا ہے۔

تو اب سوچتی تھی کہ بھٹو نے صنعتوں کو کیوں قومیایا؟ ایوب گو فوجی تھا پر صنعتی ترقی

تو ہوئی اور بہت ہوئی۔ انڈونیشیا، ملائیشیا، کوریا کی مثالیں سامنے ہیں۔ ہم تو ان سے آگے تھے۔ راتوں رات چلتی صنعتوں کو قومیانے میں لگ گئے۔ ایسے میں مزید صنعتوں کی گنجائش کہاں رہی؟

کرشماتی صفات والا بھٹو کہاں کا وژنری لیڈر تھا؟ کیا وہ دُنیا کی انقلابی تحریکوں اور اُن کی تاریخ سے واقف نہ تھا۔ یقیناً تھا۔ اُس نے 1917 کے روسی انقلاب کو بھی یقیناً پڑھا ہوگا اور جانتا ہوگا کہ انقلاب کے بعد جب ماسکو میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا۔ غیر تربیت یافتہ ان پڑھ بالشویک مزدوروں نے اپنے آپ کو صنعت وحرفت کا مالک سمجھنا شروع کردیا۔ پورے ملک میں طوائف الملکی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ گورکی نے اپنے ذاتی اخبار ''نوایا'' میں بالشویکوں پر نکتہ چینی کی تو اس کے اخبار کو بند کرنے کا مطالبہ ہوا۔ لوگوں کا ایک جمِّ غفیر لینن کے پاس جلوس کی صورت پہنچا۔ صورت اتنی گھمبیر تھی کہ لوگوں کو ان کی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس دلانا پڑا۔ سختی کرنی پڑی۔ تو یہاں بھی یہی ہوا تھا۔ تربیت کرنی ضروری تھی۔ انسانی جبلت میں ملکیت کی جبلت قدرت نے رکھی ہے۔ آپ اس کے خلاف تھوڑی سی مدت کے لیئے تو جاسکتے ہیں زیادہ دیر کے لیئے نہیں۔ غیر تربیت یافتہ، احساس ذمہ داری سے عاری لوگ سہولتیں چاہتے ہیں مگر کام کرنا نہیں۔

روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ چل اُٹھ تیرے رنڈی رونے نہیں ختم ہوتے۔ اندر نے لتاڑ دی تھی۔ جہاز میں لدلدائی ہوگئی۔ اس نے اڑان بھری۔ رات کا بھوکا پیٹ اب شور مچاتا، بھوکی آنکھ سامنے بیچ کا راستہ دیکھتی کہ کب ٹرالیوں کی کھن کھن سے فضا گونجے، قہوے اور ناشتے کی خوشبو بکھرے۔ پر وہاں تو حال تھا کہ اماں نہ پونیاں۔ پھر اٹھی۔ کچن میں پہنچی اور کہا۔

''ناشتہ۔''

''لنچ ملے گا۔ بریک فاسٹ تو پروگرام میں نہیں۔''

ذرا نرم، ذرا دھیمے لہجے میں کہا گیا۔

''ارے بھئی بلڈ پریشر کی دوائی کھانی ہے۔''

چلو تھوڑا دودھ دیا گیا۔ بے چاری پی آئی اے کتنی غریبڑی ہوگئی ہے۔

شکر ہے اس کراس کنٹری فلائٹ میں اچھی صورتیں تھیں۔ نوخیز کلیوں اور گلاب کے شگفتہ پھولوں کی ضرور کمی تھی۔ تاہم جوبن سے اک ذرا ڈھلکے ہوئے پھول تو بہر حال تھے۔ ہوائی میزبانوں کا نیا یونیفارم مجھے تو عجیب سا لگا۔ شاید ہمارے بوڑھے ذہن تبدیلی کو جلد نہیں اپناتے۔ محبت کے عملی مظاہروں کا منظر بھی مزے کا تھا۔ پاکستانی مرد ذہنیت یہاں بھی کارفرما تھی کہ اسلام آباد سے سوار ہونے والے طالب علم لڑکوں نے اپنی اپنی دوست لڑکیوں کی سیٹیں دوسرے مردوں اور لڑکوں کے ساتھ دیکھ کر اُن کی اکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی۔

بخدا انہیں تو جیسے پہیے لگ گئے تھے۔ کہیں منت سماجت اور کہیں واسطے طرلوں سے بالآخر وہ ان کا گرلز پورشن بنانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ تب جا کر انہیں چین نصیب ہوا۔ اور وہ اپنی سیٹوں پر ٹک کر بیٹھے۔ بڑا غریبڑا سا لنچ تھا۔ سارا جہاز پیک تھا۔ قسم کھانے کو ایک سیٹ خالی نہیں تھی۔ نماز ظہر بھی ہوئی۔ فضاؤں میں سجدے کے اِس منظر نے مجھے بھی ترغیب دی مگر ایک فٹ کے غسل خانے میں وضو کرنا جوئے شیر لانے والا کام تھا جو میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بس تو زبانی کلامی اپنی محبتیں اس کے پاس بھیج دیں۔

چنگی اں یا مندی اں

صاحب تیری بندی اں

☆☆☆

باب نمبر:۳ چھلانگیں مارتا آسمان کو چھوتا بیجنگ

- بیجنگ کی سڑکوں پر امریکہ، جرمنی، جاپان مہنگی ترین گاڑیوں کی صورت بھاگا پھرتا تھا۔
- فلک بوس عمارتیں جیسے کسی خودرو جنگل کی طرح اُگی نظر آتی تھیں۔
- 1960ء میں چینی کراچی کی بلند و بالا عمارتوں کو رشک بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔
- شہر مانگنے والوں سے پاک، صفائی ستھرائی میں بے مثال۔

بیجنگ ایرپورٹ بہت بڑا اور مشکلات سے بھرا ہوا تھا۔ابھی ابھی تو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس سے بھی دس گنا بڑا نیا ایرپورٹ تیار ہو چکا ہے۔بس کوئی دم میں افتتاح ہوا چاہتا ہے۔اور وہ خیر سے ساری دنیا میں اپنے حجم اور جسامت کے اعتبار سے نمبرون ہوگا ماشاءاللہ۔سپر پاور کے لیئے جلنے، بلنے، سڑنے کا ایک اور سنہری موقع۔

’’خدایا! اس کا تو ہر مرحلہ مشکلات سے بھرا ہوا تھا۔اپنی آمد کا اعلان سکینرز پر آکر کرو۔آگے آؤ، فارم بھرو، ہاتھ میں پکڑو اور کیبنوں کے سامنے بیٹھے لوگوں کے سامنے حاضر ہو جاؤ۔لائنوں کو زگ زیگ کی صورت میں سٹیل کے ڈنڈوں سے بیریر بنا کر مقید کر دیا تھا۔چلو شکر اِن مشکل اور تکلیف دہ سارے مراحل میں نوجوان پاکستانیوں نے بڑی مدد کی۔

کیبنوں کے عقب کا سارا پس منظر دیوار چین کے حسین اور موہ لینے والے

نظاروں کا تھا۔تھکن کی درد سے نڈھال گوڈے اطمینان سے کھڑے ان کی جاذبیت سے مجھے لُطف اندوز کررہے تھے۔

چلو یہ مرحلے کٹےاور سامان لینے کے لیے Luggage ہال کی طرف جانے کے لیئے برقی سیڑھیوں کی طرف آئے۔ان کی ڈھلانی گہرائی جیسے پاتال میں اُترنے والے کنویں جیسی ہی تھی۔آخری پوڑے کے عین قدموں میں مجھے اپنی بیٹی سعدیہ کھڑی نظر آئی۔

پل بھرکو رُک کر میں نے اُسے محبت پاش نظروں سے دیکھا اور لمحوں میں ہی وہ میری پیار بھری بانہوں میں سمٹ گئی۔گلے میں سفارتی کارڈ ڈالے، ہاتھوں میں سُرخ پاسپورٹ پکڑے اس نے پھرتی سے ہمارا سامان ٹرالیوں میں لدوایا اور ہمیں خودکار دروازوں سے باہر نکال کر ویٹنگ لاؤنج میں لے آئی۔

بچوں سے ملنے ملانے سے فارغ ہوکر میں نے بیٹی کو دیکھا۔اُسے ضرورت سے زیادہ سمارٹ یا دوسرے لفظوں میں کمزور دیکھ کر پریشان ہواٹھی تھی۔بار بار میرے اِس سوال پر کہ تم ٹھیک ہو؟

''ہاں ہاں امّاں بالکل ٹھیک ہوں۔''

پر میری تسلی نہیں ہو رہی تھی۔میرے چھوٹے نواسے نے شرارت آمیز نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے مجھے کہا۔

''ارے نانو آپ تو یونہی پریشان ہورہی ہیں۔ماما اتنا بازاروں میں گھومتی تھیں کہ سمارٹ ہوگئی ہیں۔''

اور یہ وضاحت میرے پوچھنے پر کہ بازاروں میں چکروں کی کیا ضرورت پڑگئی۔

وہ بولا تھا۔''نانو شاپنگ،شاپنگ۔''

ماں نے ہنستے ہوئے نٹ کھٹ بیٹے کو گُھر کا اور باہر چلنے کا اشارہ دیا۔

بیجنگ کا آسمان ابر آلود تھا۔ ہواؤں میں ٹھنڈک اور تیزی تھی ۔ دراصل سیکورٹی کے صبر آزما مرحلوں نے رات سر پر کھڑی کر دی تھی ۔اف بڑا چیختا چنگھاڑتا ماحول تھا۔

گاڑی میں بیٹھ کر باہر دیکھا۔ پُر ہیبت منظروں کا ایک سلسلہ تھا جو ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سچی بات ہے حیرت کا ایک سمندر دائیں بائیں موجیں مار رہا تھا۔ فلک بوس عمارتیں جیسے کسی خودرو جنگل کی طرح اُگی ہوئی تھیں ۔اِن کے گہرے رنگوں والے بیرونی حصّوں میں جڑے شیشوں سے منعکس ہوتی روشنیوں کی دودھیا چمک، اسفالٹ کی سڑکوں کی سیاہی اور سٹریٹ لائیٹس کی کم کم روشنی میں بھاگتا دوڑتا شُوں شُوں کرتا گاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ گویا کِسی طلسمی کہانی کے صفحات کھول رہا تھا۔ جنوں بھوتوں والی پراسراریت کی ایک نوسٹلجیائی کیفیت طاری ہونے لگی تھی ۔

کہانی بھی یاد آنے لگی تھی ۔ وہی کہانی ۔ چہار جانب سے اُمنڈتے پہاڑوں میں رہتے دیوؤں اور جنوں کی قید میں شہزادی کی ۔بچپن کی اس کہانی نے ماحول کی خوفناکی کا جو نقشہ ذہن میں تخلیق کر رکھا تھا۔ خدا گواہ ہے سارا ماحول اس کا عکاس نظر آتا تھا۔ ہاں البتہ شہزادی کون ہے؟ یہ سمجھ سے باہر تھا۔

سڑکوں پر جرمنی ،امریکہ ، جاپان بھاگا پھرتا تھا۔ مرسیڈیز ،اوڈی، رولس رائز، واکس ویگن ، ہونڈا، لیکسز دنیا کی ہر مہنگی سے مہنگی گاڑی یہاں دائیں بائیں چیختی چنگھاڑتی گزر رہی تھیں۔

تو پھر جینگوامن وائے Jianguomenwai کے علاقے DRC یعنی ڈپلومیٹک ریذیڈنسی کمپاؤنڈ کے چھٹے فلور کے ایک گھر میں داخل ہوئی۔ جہاں میری بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ داخلی دروازے پر چسپاں چاند تارے والے جھنڈے کی

تصویر یقیناً پاکستانی گھرانے کی نشان دہی کے لیے لگائی گئی ہوگی کہ عمارت میں چھوٹے چھوٹے ملکوں کے سفارت خانے بھی تھے۔ بہت آراستہ پیراستہ فلیٹ تھا۔ اِس آرائش و زیبائش کو دیکھتے ہوئے آنکھوں میں حیرت تھی۔ کشادگی لیے کمروں کی دیواریں مہنگی خوبصورت پینٹنگز سے سجی تھیں۔ چوبی فرش قیمتی چھوٹے بڑے قالینوں سے ڈھنپے نظر آئے تھے۔ کونوں میں سجاوٹی اشیاء بھی توجہ کھینچتی تھیں۔ پُوچھنے پُوچھانے کے دوران جانا کہ فرنیچر اور کچن کی چیزیں حکومت کی فراہم کردہ ہیں۔ ہاں یہ کچھ سجاوٹی چیزیں بے شک ہم نے خریدی ہیں۔

فطرتاً بیٹی حساس اور غیر ضروری نمود ونمائش سے گریزاں مزاج رکھنے والی ہے۔ پر یہاں یہ تام جھام سمجھ نہیں آیا۔

جی چاہتا تھا پُوچھوں اور پُوچھ بھی لیا کہ وطن کی محبت اور اس کی تیزی سے گرتی ہوئی اقتصادی زبوں حالی خالی خولی باتوں سے کہیں زیادہ عملی اقدام کا تقاضا کرتی ہے۔ ملک کا قیمتی زرمبادلہ اِس شوشا کی نذر کرنا کیا مناسب ہے؟

ممنائے لب و لہجے میں وہ معذرتیں پیش کر رہی تھی۔

''امّاں یہاں لوگ بہت رکھ رکھاؤ سے رہتے ہیں۔ پڑ واسیوں کی طرح تو نہیں رہا جاتا۔ تھوڑی بہت ٹپ ٹاپ تو کرنی پڑتی ہے۔''

رات گو ایک اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں تھی۔ تاہم نیند کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ نامانوس جگہیں، بستر تکیے کی تبدیلی کم کم ہی اثر انداز ہوتی ہے۔ جوانی میں تو اثر پذیری کی یہ شرح صفر فی صد تھی کہ جسم نیند نے ستھر ملّیا جتھے پے گئی رات کا عکاس تھا۔ یہاں مگر تھوڑی سی عجب بات ہوئی کہ بے حد اپنائیت بھرے ماحول جہاں آپ کے ساتھ آپ کے دل کا ٹکڑہ محو خواب ہو، آنکھ کا کھل جانا اور دیر تک نہ لگنا ذرا حیران کن تھا۔ یہ احساس کہ بھئی میں تو

صدیوں پرانے تاریخ ساز شہنشاہوں کے اس دیس میں ہوں جس کے ایک نہیں کئی عجوبوں نے اُسے زمانے بھر میں ممتاز اور منفرد کر رکھا ہے۔

گھر کے سامنے رنگ روڈ نمبر 2 پر ساری رات گاڑیوں کی بھاگ دوڑ اسی طرح جاری تھی جیسے کہیں آگ لگی ہو اور فائر بریگیڈ دھواں دھار رفتار سے بھاگتا جارہا ہو۔

صبح دم آنکھ کھلنے کی بیماری نے یہاں بھی نور پیر کے تڑکے ہی اٹھا کر بیٹھا دیا۔ بالکونی میں آئی۔ سامنے گہری سرمئی رنگت کی عظیم الشان عمارت پرسُرخ جھنڈا ہواؤں کے زور سے پھڑ پھڑاتا تھا۔ یہ کیمونسٹ پارٹی چائنا کی مرکزی کمیٹی کا پولیٹکل آفس تھا۔ اس بارے رات پتہ چلا تھا۔ چھدرے درختوں میں سے جھانکتے دروازے سے میری تصوارتی آنکھ اس کے عظیم رہنماؤں کو باری باری دیکھتی تھی۔ مچی مچی آنکھوں، کچھ پچکی، کچھ پھولی گالوں والے ماوزے تنگ، چواین لائی، ڈینگ شیاؤ پنگ، چیانگ زے من، ہوجن تاؤ اور شی چن پنگ آگے پیچھے اپنے فلسفے، اپنے سیاسی اور معاشی نظام اور چینی قوم کو نشاۃ ثانیہ کے خوابوں اور ان کی تعبیروں کے منصوبوں کے پلندوں کے ساتھ نظر آئے تھے۔

شی چن پنگ خواب دکھانے اور ان کی تعبیریں دینے میں کتنا ماہر ہو گیا ہے۔ کہتا ہے۔ ہزار میل کے سفر کا آغاز پہلے قدم سے ہی تو ہوتا ہے۔ بس اِس قدم کو لگن، جذبے اور نیک نیتی سے اٹھالو۔ اگلے قدم آسان ہو جائیں گے۔

عمارت کو تین سمت سے ڈھانپنے والا آسمان جس میں بیٹھا میرا خدائے واحد جس کی نظر کرم کی طلب گار یہ جاہل، کاہل اور نالائق مسلم اُمّہ۔

نمی آنکھوں کو گیلا کرنے لگی تھی۔ شکوے زبان پر پھیلنے لگے تھے۔ آخر کیوں؟ تو نے ایسے لیڈر ہمیں کیوں نہ مقدر کیئے؟ یقیناً تیری دلچسپی اب دنیا کے اس کھیل تماشے کی سرکس کے نئے کھلاڑیوں کو رنگ Ring میں اتارنے کی تیاریوں میں ہے۔

ٹپ ٹپ آنسو گالوں پر بہنے لگے تھے۔ پاکستان کی آبادی جتنا بیجنگ چار پانچ سال پہلے سموگ کا بُری طرح شکار ہوا تھا۔ انتظامیہ نے بڑی فیکٹریاں فوراً شہر سے باہر منتقل کیں۔ درخت جڑوں سے اُکھاڑ کر لائے گئے اور ان کی پلانٹیشن ہوئی۔ کہاں کی سموگ اور کہاں کی گرد آلود فضا۔

اس وقت میرے سامنے بیجنگ کا آسمان شفاف، آواخر مارچ کی خنکی سے بھرا تاحد نظر پھیلا فلک بوس عمارتوں کے بے انتہا خوبصورت جنگل میں گھرا حیران کرتا تھا۔ دائیں بائیں جاتی، مڑتی ایک دوسرے کو کاٹتی، کہیں جھپیاں ڈالتی شاہرائیں اور گاڑیوں کا طوفان پریشان کن تھا۔

''خدایا''۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ رشک اور حسد میں جلتی بُھنتی اندر آگئی تھی۔

1960 میں یہی چینی میرے کراچی شہر کی بلند و بالا عمارتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کاش ہمارے پاس بھی کراچی جیسا ایک شہر ہوتا۔

ناشتے کی میز پر بیٹی نے میرے محسوسات اور جذباتی کیفیات پر کہا۔

تیس میل مشرق، تیس چالیس میل مغرب، ایسے ہی جنوب اور شمال کی طرف آسمان کو چھوتا بیجنگ شہر ایک عجوبے سے کم نہیں۔

فروٹ باسکٹ میں سجی چھوٹی چھوٹی رسیلی شہد جیسی میٹھی نارنگیوں کو کھاتے ہوئے عمران نے میرے سامنے ٹائپ شدہ کاغذ رکھ دیا۔ یہ میرا پروگرام چارٹ تھا۔ میں نے نظریں دوڑائیں۔

پہلی بسم اللہ آج بیجنگ کا گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ایک ایریل ویو قسم کا جائزہ تھا۔ نمبر دو پر دیوارِ چین تھی، اس کے بعد بیجنگ کی اہم جگہیں جن میں شہرِ ممنوعہ Forbidden

تھین آن من سکوائر، تھیان شاؤ، قدیم بیجنگ کا مسلم ایریا اور چھ سو سالہ قدیم مسجد، City ٹمپل آف ہیون میوزیم، آرٹ اینڈ کلچرل سینٹر، پیکنگ اوپیرا، شی آن مسلم تہذیب کا علاقہ۔ بلٹ ٹرین سے کوئی پانچ گھنٹے کا سفر، گونگ زو Guangzhou۔ایک خوبصورت شہر جس کی اہمیت ہم مسلمانوں کے نزدیک وہاں صحابی رسول حضرت سعد بن ابی وقاص کے روضہ مبارک کی وجہ سے تھی۔ بات کتنی صحیح ہے واللہ علم بالصواب۔ بیجنگ سے ڈھائی گھنٹے کی پرواز، دن اور وقت کی ترتیب سب درج تھے۔

بھاپ اُڑاتا خوشبو بکھیرتا چائے کا دم پخت بڑا مگ میز پر آچکا تھا۔ رغبت سے ایک نظر اُسے دیکھتے ہوئے میرے اندر اُبھرتی ایک عجیب سی سوچ نے سوال کیا تھا۔اتنی گہری یاری والا ملک کہ مثالوں کے لیئے پہاڑوں اور سمندروں سے کم پر قناعت ہی نہ ہو۔اور میں جو کتابی کیڑا ہوں۔مطالعے کی رسیا ہوں اِس لمبی چوڑی فہرست میں دیوارِ چین اور ایک آدھ مزید نام کے سوا کسی سے واقف ہی نہیں۔

چائے کے چھوٹے سے پہلے گھونٹ نے مسرور کیا۔خود کو تسلی دی۔''کوئی بات نہیں۔یار سے ملنے آتو گئی ہوں۔'' کاغذ پر ایک بار پھر نظریں دوڑائیں۔

ایک فوجی کی زندگی میں جس قاعدے کلیے اور نظم وضبط کا رکھ رکھاؤ نظر آنا چاہیے وہ اس کاغذ سے عیاں تھا۔اس پروگرام میں کہیں میری مرضی شامل نہیں تھی۔ میرے خیال میں میری بونگیوں، بدحواسیوں، بھولنے، خجل ہونے اور ذلیل ہونے کے حسین تجربات سب کے بیڑہ غرق ہونے کے امکانات بڑے روشن اور واضح تھے۔

''لو بھئی ہم تو ہو گئے ناماننس۔''

خود کو سُنانے کے سے انداز میں اِس جملے سے چھلکتی بیزاری کی ہلکی سی سڑاند کا احساس ہوا تھا۔شاید اسی لیے اندر نے ذرا تنبیہی انداز میں پھٹکارہ بھی تھا۔

''اری او احمق سُن ذرا'' اب اگر قوم موسیٰ کی طرح خدا نے یہ من وسلویٰ کی نعمت تیرے مقدر میں کر دی ہے۔ کمبخت تو اُس ناہنجار قوم کی طرح ناشکری تو نہ بن۔ اس تخجل خواری کے لہسن پودینے والی چٹنی کے لیئے نہ مر۔ شکریہ بھیج اُوپر والے کو۔ سنکیانگ جانے کی آرزومند ہے۔ تو سفارتی ربط وواسطے اور ناطوں سے تیرا یہ سفر آسان ہو سکتا ہے۔''

شام تک داماد نے چاروں کھونٹ گھما کر میرا حشر نشر کر دیا تھا۔ صفائی کا وہ عالم کہ کھانے کی پلیٹ نہ ملے تو دال چاول فرش پر ڈال کر کھالو۔ شہر مانگنے والوں سے پاک صاف جگہ جگہ پڑی سائیکلیں۔ آپ نے کہیں جانا ہے۔ سڑک کنارے بنے سٹینڈ سے سائیکل اٹھاؤ۔ جہاں جانا ہے وہاں پہنچو۔ سائیکل کو وہیں چھوڑو اور آگے بڑھ جاؤ۔ کام پر جانے اور واپس آنے کے اوقات کے لیئے مخصوص نمبروں کی بسیں جن کے روٹ صبح وشام کے ان مختصر اوقات میں خاص بن جاتے ہیں کہ لوگوں کو انتظار کی زحمت نہ ہو۔

ستر اسّی کی دھائی میں سنتے تھے ساری چینی قوم سائیکلوں پر سوار ہے۔ پیڈل مارنے والے زمانے اب لد گئے ہیں۔ سائیکل تو اب تفریح کا ذریعہ ہے۔ عوام اب شاندار ایر کنڈیشن گاڑیوں، بسوں اور میٹرو میں سفر کرتی ہے۔ مخصوص یونیفارم پہننے والی عورت اب برینڈڈ کپڑے پہنتی اور ٹکا کے میک اپ کرتی ہے۔

☆☆☆

باب نمبر:۴ دیوارِ چین

چینی ثقافت و کلچر کا نمائندہ، اس کا لینڈ مارک اور تاریخی اثاثہ

- دیوارِ چین پر خوبصورت ترین شاعری ماؤ کی ہے۔
- بادہ لنگ Badaling حصّہ آرٹ اور کلچر کا حسین شاہکار ہے۔
- دیوارِ چین چینی لوگوں کی عظمت کو چار چاند لگاتی ہے۔

بلند آسمان اور نظر نواز بادلو
جنوب کی جانب سے آنے والی قازوں کا انتظار ختم ہوا۔
عظیم دیوار تک اُن کا نہ پہنچنا کوئی بہادرانہ فعل نہیں۔

تاریخ ساز چینی رہنما ماؤزے تنگ Mao Zedong کی یہ خوبصورت نظم مجھے اس وقت بے طرح یاد آرہی ہے۔ چین کی کیمونسٹ پارٹی کے چیئرمین اور ایک عظیم انقلابی لیڈر۔

اِس نام سے پہلا تعارف کب ہوا؟ 1969 اور 70 کے سالوں میں جب میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے گرلز ہال میں ہر دوسرے دن چین اور روس نواز طالبات کے ماؤ اور لینن سے یگانگت کے نعرے اور ماؤ کی ترجمہ شدہ طوفانی نظموں کو جوشیلی آوازوں میں جنونی لڑکیوں سے گاتے ہوئے سُنتی تھی۔ چین میرے لیے پاکستان کے ایک اچھے دوست کے

ساتھ ساتھ دیوارِ چین اور ماؤ کے حوالے سے بھی بڑا مانوس ہو گیا تھا۔

وہ ہیرو کیسے بن سکتا ہے۔

جس نے عظیم دیوار کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔

یہ نظم بھی کہیں پڑھی تھی۔ عزم و حوصلے سے لدی پھندی، جد و جہد، ہمت اور عمل کا سبق پڑھاتی تھی۔

اس وقت جب میں بھی ہیروئن بننے کے لیے عظیم دیوار کو ہاتھ لگانے جا رہی ہوں۔ دماغ کے کونے کھدروں میں پڑے کچھ نظموں کے ٹکڑے متوجہ کر رہے ہیں۔ سچ مچ میں نے خود کو بہت خوش قسمت سمجھا ہے۔

آواخر مارچ کی اِس خنک تیز ہواؤں اور چمکیلی کرنوں میں لپٹی دوپہر کو بادہ لنگ کے پارکنگ ایریا میں یادگار کے پاس کھڑی اِس منظر سے محظوظ ہو رہی ہوں۔ دنیا کے عجائبات میں سے ایک دیوارِ چین ہے۔ شفاف آسمان پر میری تشکر بھری نظریں جم سی گئی ہیں۔ لبوں نے اُس ہستی کا شکریہ ادا کیا ہے جس نے اتنی بڑی کائنات تخلیق کی اور مجھے یہاں آنا نصیب کیا۔

بالعموم کسی بھی ملک کی سیاحت کے لیے ہمیشہ میرا ایک طریقہ کار رہا ہے کہ اس کا آئی کون، اس کا لینڈ مارک، اس کی کوئی خاص الخاص چیز ہمیشہ سب سے آخر میں دیکھتی ہوں ۔ عجیب سی نفسیات ہے میری کہ جیسے کوئی امیر بڈھا یا بڈھی اپنے اثاثوں کی بندر بانٹ کے بعد ایک آدھ انتہائی قیمتی اور نادر آئٹم چھپا لیتی ہے کہ یہ تو اُسے اپنی کسی دل پسند ہستی کو دینا ہے۔ بس میں بھی کچھ ایسے ہی کسی نوسٹلجیا یا خود ساختہ لذت اور چسکے کے سحر میں خود کو قید کر کے اپنے سفری مزے کو دوبالا کرنے کی گھمن گھیریوں میں رہتی ہوں۔

مگر عجیب سی بات تھی کہ چینی ثقافت کے اِس آئی کون کو سب سے پہلے دیکھنے چلی

آئی تھی۔

شاید مجھے عجیب سی نہیں کہنا چاہیے کہ میں اِس بات سے آگاہ ہوں کہ اس بار سفری مہار میرے ہاتھ کی بجائے کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔

''تو پھر آج مجھے دیوار چین کے لئیے جانا ہے۔''

تو بس شکر شکر کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھی جس کی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولے بیٹی اور داماد کھڑے تھے۔

بیجنگ چھ سات رنگ روڈوں کے دائروں سے لپٹا ہوا ہے۔گاڑی نمبر۲ پر چڑھی۔ راستہ قدرت کے حسن سے کہیں زیادہ انسانی ہاتھوں کا مرہون منت تھا۔ پستہ قامت پہاڑیوں میں سرنگوں کی تعمیر ان کی طوالت کہیں کم اور کہیں زیادہ تھی۔

ہم جس راستے پر رواں دواں تھے یہ بادہ لنگ Badaling کا ہے۔اِسے بہترین اور سیاحوں کے لیے اہم کہا گیا ہے۔ویسے تو داخل ہونے کے تقریباً نو دس راستے ہیں۔عمران ان سب راستوں کی ہڈی ہڈی، جوڑ جوڑ اور ہر رگ ورید سے شناسا ہو چکا ہے کہ گذشتہ پانچ چھ سالوں سے پاک فضائیہ کی طرف سے چین اس کا آنا جانا ایسے ہی تھا جیسے کسی جاب کرنے والے لاہوریئے کے لیے گوجرانوالہ یا شیخوپورہ جانا۔

جنشانلنگ Jinshanling اور Jiankou والے حصّے پر وہ کئی مرتبہ ہائیکنگ کر چکا تھا۔اس کا کہنا ہے کہ اسمیں کوئی شک نہیں کہ سیمیتائی Simatai نامی حصّہ خوبصورت ہے اور فطرت کے حسین شاہکاروں سے مالا مال ہے۔مگر مطانیہ Mutinaya بھی بے مثل ہے اور سچی بات ہے کہ بادہ لنگ کا تو جواب نہیں۔خدا گواہ ہے۔ بندے کا سانس رکنے لگتا ہے۔سبزے سے لدی پہاڑیوں کی ڈھلانیں اور اس میں سانپ کی طرح بل کھاتی یہ دیوار۔

Jiankou خطرناک ہے۔جنگلی حیات یہاں کثرت سے ملتی ہے۔حکومت سے خاص اجازت لینا پڑتی ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ چین بارے،چینی کلچر بارے کوئی بات مکمل ہو ہی نہیں ہوسکتی جب تک اس میں عظیم دیوار کا حصّہ نہ ڈالا جائے۔

اب دنگ رہنے والی بات ہی ہے نا جب ساتویں صدی قبل مسیح سے پہلے شروع ہونے والا یہ عجوبہ سولہویں صدی بعد مسیح تک مسلسل سفر میں ہی رہا۔

کیا کن Qin،کیا ہان Han،کیا منگ Ming اور بقیہ شہنشاہ بھی تاریخ جن سے بھری پڑی ہے۔انیس بیس تو ہیں ہی۔نام بھی بڑے مزے کے ہیں۔سوئی Sui،ٹینگ Tang،سونگ Song وغیرہ وغیرہ۔خیر ہمارے کان تو اِن سبھوں سے کچھ بہت اچھی طرح مانوس بھی نہیں ہیں۔تو بھئی ان سبھوں نے اسے بہتر کرنے اور سنوارنے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔

تو لیجیئے گاڑی سے اُتر کر میں سرشاری کے عالم میں اپنے چاروں اور بکھری سنہری دھوپ میں گھومی ہوں۔شفاف نیلے آسمان،خنک ہواؤں کے رقصاں جھونکوں،پشت پر نیلگوں پانیوں کے ہلکورے لیتی جھیل،اوپر پہاڑی پر بل کھاتی دیوار اس پر بنی برجی،سبھوں کو شوق واشتیاق کی بلندیوں سے دیکھتی اور مسرور ہوتی ہوں۔

’’میرے پروردگار میں تیری کِس کِس نعمت کا شکریہ ادا کروں۔‘‘

سامنے ٹکٹ گھر جہاں عمران ٹکٹ کے لئے کھڑا ہے۔داہنے ہاتھ یادگار کے پاس بیٹی کچھ پڑھتی نظر آتی ہے۔بائیں ہاتھ سڑک سے ذرا پرے دیوار کے اوپر عظیم دیوار کا ایک دوسرا حصہ اور برجیاں نظر آرہی ہیں۔پارکنگ ایریا میں گاڑیوں کی آمدروفت کا شور برپا ہے۔

لیوپین Liu Pan پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر

سُرخ جھنڈا لہراتا ہے

اب ہم نے لمبا Tassel (یونیفارم) پہن لیا ہے۔

ماؤ کی نظم کے یہ ٹکڑے یاد آرہے ہیں۔ میں نے بھی لمبی چوڑی دعاؤں کی ردا اپنے اردگرد لپیٹ لی ہے۔ سامنے بے ڈھنگی ڈب کھڑبی سی بڑے بڑے پتھروں والی سیڑھیاں ہیں ان پر قدم رکھ دیا ہے۔ چڑھتی جارہی ہوں۔ اب رکی ہوں۔ اس چھوٹے سے دوراہے پر آکر جہاں ایک جانب کی سیڑھیاں اوپر برجی تک جاتی ہیں۔ دوسری جانب سیڑھیوں کا ہی ایک چھوٹا سا سلسلہ ایک چمکتے دمکتے رنگ رنگیلے آرٹ کے شہکاروں سے سجے پگوڈا کی طرف لے جاتا ہے۔

تو پھر اسی طرف جانا تھا نا۔ گئی۔ رنگوں کی پچی کاریاں اور چوبی کندہ کاری کے شہکار دیواریں، چھت، گلیارہ، اور ستون سب آرٹ کے ہیروں سے سجے سنورے ماحول کو رنگین اور چینی ثقافت کی بھرپور نمائندگی کررہے تھے۔ ماں بیٹی نے کچھ وقت وہاں گزارا۔

مخالف سمت جانے سے قبل ٹیرس پر کھڑے اس بے حد خوبصورت جوڑے کے پاس رکی تھی۔ خوبصورت لڑکا نابینا تھا۔ چھڑی ہاتھ میں پکڑی آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک لگائے اپنی دل کش ساتھی لڑکی کا ایک ہاتھ تھامے یہاں اس کی آنکھوں سے سیر کا لُطف اٹھانے آیا تھا۔ عمران نے چینی میں باتیں کیں تو سمجھ آیا کہ یہ محرومی ایک حادثے کی دین ہے۔ تاہم پُراعتماد بیوی کی محبت سے مالا مال ہے جس نے اُسے امید بھری زندگی دی ہے۔ حوصلہ اور اُمنگ سے نہال کیا ہے۔

یہ محبت بھی کیا چیز ہے؟ مشکل اور صبر آزما لمحوں میں ڈگمگانے نہیں دیتی ہے۔

سامنے بہت بڑے بورڈ پر گریٹ وال کی مختصر تاریخ درج تھی۔ تھوڑی دیر رک

کراُسے پڑھا۔ماضی بعید،ماضی اور حال سبھوں کا تذکرہ بڑا فخر اور امتیاز لیے ہوئے تھا۔سمجھدار قوموں کے پاس کچھ ہوتو وہ اس کی حفاظت کرتی،اُسے سجاتی،سنوارتی اور پیش کرتے ہوئے ایک گونا مسرت محسوس کرتی ہیں۔اب اپنے کیا بخیئے اُدھیڑوں۔

چڑھائی پھر شروع ہوئی۔پہلی حفاظتی بر جی تک پہنچی۔اس سے اوپر پھر سیڑھیاں تھیں۔وہ بھی دھیرے دھیرے کہیں بیٹی،کہیں عمران کا ہاتھ پکڑے،کہیں خود ہمت کرتے چڑھتی گئی۔چڑھتی گئی حتیٰ کہ پھر حفاظتی بر جی سے کشادہ آنگنائی میں آگئی۔چھوٹا سا آنگن جس کی دیواروں سے جھانکتے ہوئے نیچے کے دلفریب منظر،آسمان کا وسیع وعریض پھیلاؤ دیکھا۔

یکدم رکی۔آسمان پر بکھری فسوں خیزی نے جیسے میرے قدموں کو ساکت کردیا تھا۔ایک پاؤں اوپر کے پوڈے پر دوسرا نچلے پر جب مجھے ماؤ کی دو خوبصورت نظمیں یاد آئیں۔ذرا دیکھیئے نا۔

پہاڑوں کی چوٹیاں جیسے
سبز آسمانوں میں کُھبی ہوئی ہیں
آسمان گر جاتا
اگر چوٹیوں نے اُسے تھاما ہوا نہ ہوتا

میں اپنے گھوڑے کو کوڑا مارتا ہوں
اور نیچے نہیں اترتا
حیرت زدہ سا پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں
آسمان تو صرف تین فٹ پرے ہے

واقعی ایسا ہی تھا۔ جیسے ہاتھ بڑھاؤں گی تو چھولوں گی۔ دیر تک اس منظر سے لطف اٹھایا پھر آگے بڑھی۔ ایک جانب کی سیڑھیاں ذرا نیچے ٹمپل میں لے جاتی تھیں۔ اس جانب ابھی قدم بڑھائے ہی تھے جب عمران نے ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ اُوپر چلنا ہے۔ اب پھر سیڑھیاں تھیں، بر جی تھی۔

پھر ایک اور دل کش منظر تھا۔ رنگ رنگیلا پگوڈا سٹائل کا کمرہ آرٹ کا شاہکار سامنے چھوٹا سا صحن پھر سیڑھیاں جو یقیناً کسی اور خوبصورت سے منظر کا دروازہ کھولتی تھیں۔ یہاں بینچ تھے۔ جن پرستانے کے لیے بیٹھ گئی۔ تھوڑے سے بادام اور پستہ لیا۔

یہیں ایک چینی خاندان بیٹھا تھا۔ خاکروب صفائی کر رہا تھا۔ اُسے تھوڑا سا ڈرائی فروٹ دینے کی کوشش کی۔ خوشی ہوئی۔ بہت شائستگی اور آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات سے انکار کیا۔ عمران موٹے موٹے دانوں والی اُبلی ہوئی چھلّی لے کر آیا۔ وہ بھی دینے کی کوشش کی۔ پھر انکار ہوا۔

''یہ کیسی رجی پجّی قوم ہے۔ خود سے کہتی ہوں۔ بھری نیتوں والے لوگ ہیں۔ انہوں نے تو اس مثال کی بھی دھجیاں اڑا دی ہیں کہ غریب کتنا بھی امیر کیوں نہ ہو جائے اس کے اندر سے غریبی نہیں نکلتی۔ ان سے زیادہ غریبی کس قوم نے دیکھی ہوگی۔ ان سے زیادہ فاقے کن لوگوں نے کیے ہوں گے مگر دیکھیں تو ذرا۔ پیٹ کے بھرے، نظر کے بھرے ہوئے، ہاتھوں کے سوچاری۔''

میں سامنے صحن کو دیکھتی تھی۔ کہیں کوئی کاغذ کا ٹکڑا، چھوٹا موٹا بکھرا ہوا کوئی تنکا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہر پندرہ منٹ بعد وہ کوچی فرش پر پھیرنے لگتا۔

اب چھلّی کھاتے ہوئے پھر ماؤ کی نظم پڑھنے لگی ہوں۔

اٹھو اٹھو۔ غلام نہیں بنے رہنا

وہ لوگ جو غلام نہیں بنے رہنا چاہتے
ہمارے خون اور گوشت سے فائدہ اٹھائیں
ہمیں نئی عظیم دیوار بنانی ہے

تھوڑا تازہ دم ہو کر کھڑی ہو گئی ہوں۔ اپنے سامنے 21196 کلومیٹر اس شاہکار کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو جو کسی خوفناک اژدھے کی مانند نظر آتا ہے کو دیکھتے وقت کے اندھیرے اجالوں میں ڈوبتے ہوئے خود سے سوال کرتی رہی۔ دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتی رہی۔ پڑاؤ آیا تھا۔ رکنا پڑا۔

دائیں ہاتھ ٹورسٹ شاپ تھی۔ شاپ کیا تھی؟ آرٹ کا نمونہ تھی۔ ایک شاہکار تھی۔ چینی نوادرات سے بھی سجی ہوئی تھی۔ قیمتیں پوچھیں۔ باوا کے مول کی تھیں۔ فی الفور توجہ اِس کی چھت کی نقاشی جانب ہوئی۔ اِدھر اُدھر تھوڑی سی ہل جُل، تھوڑی سی دل پشوری کی۔

باہر نکلی۔ سامنے بہت بڑا میدان سیاحوں سے بھرا پڑا تھا۔ آمنے سامنے کھانے پینے کی دکانیں۔ دور فاصلے پر درختوں اور دیوار کے عقب میں پارکنگ ایریا میں کھڑی دیوہیکل ٹورسٹ بسیں۔

خوشگوار میٹھی سی دھوپ، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اور لوگوں کا بھریا میلہ۔ یہاں اگر غیر ملکی تھے تو مقامی لوگوں کی بھی کثرت تھی۔ ویسے تو ملک بھی بڑا اور آبادی تو ماشاء اللہ خیر سے نظر لگنے والی۔ اگر اپنے ہی نکل آئیں تو کسی غیر کو چپّہ بھر کھڑے ہونے کو جگہ نہ ملے۔

سعدیہ کافی لے آئی تھی۔ ایسے خوبصورت لمحوں میں کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پینا اور اِس ماڈرن چین کے بانی ماؤ کی اس کہاوت کو یاد کرنا کہ جس نے عظیم دیوار نہیں دیکھی وہ تو سچا انسان ہی نہیں کس قدر مسرور کن عمل تھا۔

سچ تو یہی ہے کہ یہ چینیوں کی ثقافتی زندگی میں ایک سمبل، دنیا کے عجائبات میں ایک بے مثل تعمیری نمونہ اور چینیوں کے عزم و حوصلے کا ایک جیتا جاگتا شاہکار ہے۔

اس وقت یہ چین کے لینڈ مارک، اس کے آئی کون کے طور پر اُبھر کر بہت نمایاں ہوئی ہے۔ یہ ماضی میں دفاعی مضبوطی کا باعث تھی۔ زمانوں سے، صدیوں سے اس قوم کی طاقت اور اُن کے استحکام کے اظہار کا ذریعہ تھی۔ اس نے اس سوچ اِس احساس کو تقویت دی کہ بڑی کامیابیاں مشترکہ کاوشوں اور مضبوط قوتِ ارادی سے ہی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال چینیوں کے اس قومی ترانے سے بھی ملتی ہے جو 1937 سے 1945 کی جاپانیوں کیخلاف دفاعی جنگ میں کمپوز کیا گیا تھا۔

کہ اب نئی عظیم دیوار ہمارے گوشت اور خون سے تعمیر کرو۔

اس کا ایک اور حد درجہ متاثر کن کردار اپنی شاعری، اپنی نثر، اپنے محاوروں، اپنی کہاوتوں اور اپنی ضرب الامثال سے چینی ادب اور ثقافتی ورثے کو مالا مال کرنے کی صورت میں بھی سامنے آیا ہے۔

چین کبھی ناکام نہیں ہوگا
اور عظیم دیوار کبھی نہیں گرے گی

تو یہاں مجھے پیٹرز برگ کا وہ بوڑھا موسیقار یاد آیا ہے۔ شہر جنگ عظیم اول کی تباہ کاریوں سے نڈھال اور انقلاب کی خون ریزیوں سے خستہ حال ہو چکا ہے۔ اِن دنوں شہر پر بمباری شدت اختیار کر گئی ہے۔ سرخ فوج لینن کے حکم پر بوڑھے موسیقار کو شہر چھوڑنے کا کہتی ہے۔ وہ پیانو کی keys پر انگلیاں رکھتا ہے۔ دل کو چیر دینے والی دُھنیں فضا میں بکھر جاتی ہیں۔

''سنو وہ کہتا ہے اگر میں چلا گیا تو فصیلِ شہر گر جائے گی۔''

سالہا سال بعد جنگ عظیم دوم میں پیٹرز برگ جو پہلے پیٹروگراڈ پھر لینن گراڈ بن گیا تھا۔ایک بار پھر جنگ کی ہولنا کیوں کا سامنا کر رہا تھا۔سرخ فوج پھر بوڑھے موسیقار کو شہر چھوڑنے کا کہتی ہے۔اس کی بوڑھی انگلیاں پھر پیانو کی keys کو چُھوتی ہیں اور وہاں وطن کی سلامتی اور اس کی عظمتوں کے نغمے پھوٹ نکلتے ہیں۔

سنو میں چلا گیا تو یہ فصیل شہر گر جائے گی۔

یہ وطن اس کی محبت، اس کے ساتھ گندھے چاہتوں اور عقیدتوں کے رشتے کیسے کیسے معجزوں کو تخلیق کرتے ہیں۔تم جاننا چاہتے ہو تو لو سنو۔

عظیم دیوار کہاں ہے

یہ تو لوگوں کے دلوں میں بستی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کی باقیات، اس کی نشانیاں، اس کی قلعہ نما کوٹھریاں، اس کی برجیاں، اس کے سگنل ٹاورز اور رکاوٹی دیواریں صرف اینٹ، چونے، پتھروں کا آمیزہ ہی نہیں ان میں چین کی طویل ثقافتی زندگی کی جھلک بھی ملتی ہے۔

طرز تعمیر کے امیرانہ قابل فخر قومی ورثے جس میں بیک وقت آرٹ کی فنکاریاں، رنگوں کی بوقلمونیاں اور حسن کے لشکاروں کی دلفریبیاں دامن دل کو پکڑ پکڑ کر کہتی ہیں۔

''کہاں جاتی ہو بیٹھو یہاں اور دیکھو ہمیں۔''

تاریخ بتاتی ہے کہ کیا سلطنتیں، کیا بادشاہتیں، کیا عام و خاص، کیا امیر و غریب سبھوں نے اس میں اپنا اپنا حصّہ ڈالا۔اور آنے والی نسلوں اور حکمرانوں کو بتایا کہ انہیں بھی اس قومی ورثے کو چار چاند لگانے ہیں تا کہ دنیا چین اور چینی لوگوں کی عظمت کو سمجھ سکے۔اس کے سب سے مشہور اور خوبصورت حصّے پہلے چینی بادشاہ 206-220 قبل مسیح ہی

میں بنے۔موجودہ حصے منگ اور Qing سلطنتوں کے مرہونِ منت ہیں۔

فضا میں جیسے یکدم ہی بہت سے قہقہوں کی پھلجھڑیاں پھوٹیں۔شور ہنگامہ دو بسیں دیوار پار کے پارکنگ ایریا میں آ کر رکی تھیں۔کائنات کی رنگارنگی سارے میدان میں بکھر گئی تھی۔ ماحول رنگین تو پہلے ہی تھا۔اب تو گویا چار چاند لگنے والی بات ہوگئی تھی۔ بھانت بھانت کی بولیاں ہوا میں بکھر رہی تھیں۔

انڈونیشیا اور ملائشیا کے ٹولے تو باقاعدہ پھڑ پھڑاتے جھنڈوں تلے لام ڈور کی صورت نظر آئے تھے۔ سچی بات ہے حج کے دنوں کی یادتازہ ہوگئی تھی۔نیوزی لینڈ اور جرمنی کے چقندر رنگے جب ہنستے کھلکھلاتے میدان میں داخل ہوئے۔ ہمارے قریب آ کر موٹی موٹی عورتیں بیٹھیں۔ سچی بات ہے انہیں خاموش نظروں سے دیکھنا بھی دلچسپ شغل تھا۔ افریقہ والوں کی بھی پوری بس خالی ہوئی تھی۔وہ تو خیر سے ''آپ اپنی پہچان ہیں ہم'' کے مصداق بندے کو کسی قسم کے مغالطے میں پڑنے ہی نہیں دیتے۔کھلا کھلا اشتہار ہیں۔

ہمارے سامنے ایک چینی خاندان آ کر بیٹھ گیا تھا۔میاں بیوی ایک بچہ نانا نانی۔ تین سال کا بچہ چار بڑوں کا وہ کھلونا تھا جس کے ناز اٹھاتے وہ سرشاری میں ڈوب ڈوب جاتے تھے۔عمران بتارہا تھا کہ چین میں خاندانی نظام کی بنیادیں بہت گہری ہیں۔والدین کا بہت خیال اور احترام کیا جاتا ہے۔چونکہ بچہ ایک ہی پر پابندی تھی اس لیے اس میں دادا دادی، نانا نانی، ماں باپ کی جان ہوتی ہے۔کسی چھوٹی موٹی بیماری میں بچہ اگر اسپتال جاتا ہے تو ساتھ چار بندوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔

میں نے دائیں جانب دیکھا۔ بہت دور چوٹی تک عمودی سیڑھی پر ایک ابنوہ امنڈا پڑا تھا۔

میرے قریبی بینچ پر ایک نوجوان آ کر بیٹھا ہے جس کے ہاتھوں میں ایک بڑی

سی کتاب تھی۔ کتاب پر ایک ایسے منظر کی جھلک نظر آئی جس نے مجھے بے کل کر دیا۔ میں فی الفور اٹھ کر اس کے پاس گئی اور اُسے چند لمحوں کے لیے کتاب دینے کی درخواست کی۔ بیبا بچہ ہی لگتا تھا کہ کسی قسم کا کوئی سوال جواب کے بغیر کتاب میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ یہ ایک پکچر بک تھی۔

ٹائیٹل پر گُنگ کرنے والا، دل کو تھامنے والا ایک منظر جگمگا رہا تھا۔ عظیم دیوار کے سمیتائی Simatai حصّے کا ایک سین۔ کتاب کو کھولا۔ اندر کے دونوں صفحوں پر پھیلے ٹائیٹل کور والے منظر کے ساتھ چار پانچ لائنوں کا تعارف بھی درج تھا۔ صفحات سین کی چھوٹی سی چھوٹی تفصیل کو اُجاگر کر رہے تھے۔ گویا فوٹو گرافر کے کمال فن کی داد رہے تھے گویا تخلیق کار کے گیت گا رہے تھے۔

عظیم دیوار کا یہ سیمیتائی Simatai وہ حصّہ تھا جو بیجنگ کے نزدیک منگ سلطنت کے زمانے میں بنایا گیا۔ یہ ایک دلنواز سُر کی طرح آپ کے اندر کو زیر و زبر کرتا اور کسی بے انتہا خوبصورت گیت کی لے کا سا تاثر دیتا، دھڑکتی سانسوں کو منجمند کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ایک کہاوت بھی درج تھی کہ سمیتائی کا یہی وہ عمودی حصّہ ہے جو عظیم دیوار کا حیرت انگیز عجوبہ ہے۔ یہ پہاڑوں کی ڈھلانی پاتال سے اوپر اٹھتا، پہاڑوں کی چوٹی تک جاتا اور وہاں سے پھر عمودی صورت وادیوں میں گرتا ہے۔ میں نے ورق پلٹا۔ اگلا منظر پچھلے والے کو مات دے رہا تھا۔ کچھ حصّے ایسے تھے جو رات کے عکاس تھے جنہیں دیکھتے ہوئے بندہ کائنات کے تخلیق کار کی صناعی پر عش عش کر اُٹھتا ہے۔

نام بھی تھے۔ کہیں ''بادلوں کی سیڑھی'' اور کہیں ''جنت کا پُل''۔ ہونٹوں پر ہنسی بکھری۔ دونوں صفحوں پر بکھرا ہوا سین آنکھیں پھاڑتا اور سوال کرتا تھا۔

''تو یہ جنت کو مانتے ہیں۔ پل صراط سے گزر کر ہی بندہ جنت میں داخل ہوتا

ہے۔''

بادلوں کی سیڑھی والا حصّہ بہت تنگ نظر آتا تھا۔اوراس کی مشابہت من وعن سیڑھی ہی کی طرح تھی۔جس پر چڑھ کر جنت کے پُل پر پہنچا جاتا ہے۔پار گہری وادیاں تھیں۔

اگلا صفحہ پلٹا۔منظر پھر دونوں صفحوں پر پھیلا ہوا تھا۔

دیوار کے اِس Huanghuacheng والے حصے کا بھی دیکھنے سے تعلق تھا۔منگ کے زمانے کا یہ حصّہ ٹاؤن Jiudure میں واقع ہے۔بیجنگ سے کوئی 65 کلومیٹر پر یہ قدیمی حصّہ خوبصورت جھیل کے گرد واقع ہے۔گرمیوں میں یہ جنگلی پھولوں سے بھر جاتا ہے۔اسے نام بھی یہی دے دیا گیا ہے۔

Huanghuacheng کا مطلب پیلے پھولوں کا شہر ہے۔کیا منظر تھا؟ لاہور اپریل مئی میں املتاس کے پھولوں سے بھرا کس قدر خوبصورت لگتا ہے۔کچھ ایسا ہی منظر اُس وقت میرے سامنے تھا کہ جس نے نگاہوں کو ساکت کر دیا تھا۔پھولوں اور شاہ بلوط سے بھرا ہوا۔

سچی بات ہے اِسی جگہ کے دو منظر اگلے صفحات پر بھی تھے۔ایک میں یہ ڈریگون کی طرح نظر آیا جو نیلے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے والا ہو۔دوسرے میں قلعہ کا منظر تھا۔YaoZiyu اس قلعے میں سکالرنامی درخت جسے چھونے سے برکتیں ملتی ہیں۔میں نے چار سطروں والے حصے فوراً موبائل میں قید کیے اور آگے بڑھنے کے لئے ورق پلٹے۔

میری تو آنکھیں پھٹ گئیں۔دونوں صفحوں پر پھیلے ایسے منظر تھے کہ خوبصورت آرٹ ورک ہیروں کی طرح جگمگا رہا تھا۔یہ حصّہ دیوار Jinshan کے چھوٹے بڑے پہاڑوں پر بنی ہوئی ہے۔جو Luanping اور Miyun کے درمیان حد فاصل ہے۔اس کے واچ ٹاورز اور وہ بھی انواع واقسام کے،خطاطی والی اینٹیں کیا کمال کی چیزیں تھیں۔

واچ ٹاورز کی تعمیری انفرادیت، وہ بھی مختلف النوع اوپر سے یوں لگتے تھے جیسے روشنی کے مینار ہوں۔ سنگلاخ پتھروں میں سے جھلکیاں مارتا شاہانہ کروفر بندے کو سحرزدہ کرتا تھا۔

کتاب اور اِس کے تصویری منظروں نے مجھے اپنے آپ میں جکڑ لیا تھا۔ سچی بات ہے میں تو گردوپیش سے بے نیاز تھی۔

دفعتاً نوجوان میرے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سارے وجود نے جیسے جھٹکا سا کھایا۔ اُسے یوں سر پر کھڑے دیکھ کر بدحواس سی احمقوں کی طرح دیکھنے لگی تھی۔ لڑکے نے کتاب لینے کے لیئے ہاتھ بڑھائے۔ ملتجی نظروں سے اُسے دیکھتے اور منمناتے ہوئے التجا کی کہ وہ چند لمحے اور مجھے دیکھنے دے۔ لڑکے نے اپنی ساتھی کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اُسے بلا رہی ہے۔

''ہائے کیسے واپس کی۔ کہوں گی دل پر پتھر رکھ کر۔'' واپس کرتے پُوچھا کہ کہاں سے خریدی تھی۔ لڑکا تو جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ ایک طرح چھینتے ہوئے بھاگنے لگا تھا۔ دیوار کے اس طرف کتنی دیر تو میں سوگواری ہی میں بیٹھی رہی۔ کمبخت نے یہ بھی بتانے کی تکلیف نہیں کی کہ اس نے کہاں سے خریدی ہے؟ چلو بیجنگ میں کوشش تو کروں گی۔ خود کو دلاسا دیا۔

اور جب میں اپنے سامنے دور آسمان کی نیلاہٹوں کو چھوتی اِس درّے نما دیوار کو دیکھتی تھی جس پر عشاق والہانہ انداز میں چڑھتے نظر آتے تھے۔ مجھے کچھ عرصہ قبل پڑھی ہوئی ایک نظم یاد آئی تھی۔ یہ ایسی ہی تھی جیسی ہمارے ساحر لدھیانوی نے تاج محل پر ہمارے اور اپنے جیسے لوگوں کے لیے لکھی تھی۔

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

یہ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

چینی غلاموں کے پاس

اپنے ملک کی حفاظت کے لئے

اپنی ہڈیوں اور پٹھوں کے پتھر

توڑنے کے لئے ہی تو ہیں

یقیناً یہ عظمت کی لو دیتی بلند دیوار

ان سب کی حفاظت کرتی ہے؟

یا شاہوں کی

اور میرے اندر نے کہا تھا۔ یہ ماؤ جیسے زیرک نے کیسی اوندھی بات لکھی۔ بھلا ایسے حفاظتی حصاروں سے غریبوں کا کیا لینا دینا۔حملہ آوروں سے انہیں کیا ڈر؟ نہ پیسہ پاس، نہ ہیرے جواہر، نہ قیمتی ساز و سامان ۔متراں نے دو وقت کی روٹی ہی تو کھانی ہوتی ہے وہ تو مل ہی جاتی ہے۔

باتھ روم جانے کا تجربہ بھی مزے کا تھا۔ ہمارے ہاں کی عام فوجی بیرکوں کی طرح باتھ روم اسی انداز کے پارکنگ ایریا میں ڈھلان پر بنے ہوئے تھے۔ایک لمبی قطار میں کوئی پندرہ اور وہ سب کے سب زمینی ۔ایک کا دروازہ کھولتی وہ منہ چڑاتا دوسرے کا کھولتی وہاں وہی سین ۔تپ چڑھ گئی۔پھپھولے پھٹنے لگے۔

''کمبختو یہ تم محنت کشوں کے گٹے گوڈے تو سب ٹھیک ٹھاک ہی ہوں گے کہ تمہارے درد دل رکھنے والے لیڈروں نے تمہیں کھانے پینے کی خالص اشیاء دینے کی کوشش کی۔کسی نے اگر کوئی دو نمبری کرنا چاہی تو اُسے پھاہے لگانے میں پل نہیں لگایا۔مگر یہ ہم بدقسمت لوگ جو اپنے عیاش اور ذات کے پُجاری حکمرانوں کے باعث ناقص غذاؤں

اور جعلی دواؤں کے پُر وردہ جوانی میں ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

اب تمہیں کیا بتاؤں کہ ہمارے غریب پر جوانی تو بس ایک لہر کی مانند آتی اور گزر جاتی ہے۔ تو اب ہمارے گٹے گوڈے اِس قابل کہاں کہ میں اِس زمینی چولہے پر بیٹھوں اور ان کا کڑاقہ بجواؤں۔ بہرحال اس اوپر والے کا احسان ہی تھا ناکہ آخری ایک دانہ غالبًا سوغات یا تحفے کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ چلو شکر شکر کہا۔

چین زندہ باد کا نعرہ بھی لگایا۔

☆☆☆

باب نمبر: ۵ جانا ہمارا مسجد نیو جیا میں

- کبھی سائیکل چین کی تمدنی زندگی کا اشیائے خوردنی کی طرح کا ہی ایک حصّہ تھی۔
- مانگنا اور ہاتھ پھیلانا چینی قوم نے اپنے مزاج سے نکال دیا ہے۔
- مسجد کے مختلف حصّوں کی زیارت کرنا میرے حسابوں بڑا ایمان افروز تھا۔

ڈھلتی شام کی دھوپ میں پھیکا پن تھا۔ کچھ ایسا ہی جو اداس کرنے والا ہو۔ پتا نہیں مجھے دوسرے ملکوں کی شامیں کیوں ہمیشہ افسردہ کرنے والی لگتی ہیں؟ چلو یہاں تو جذبات کی یہ کیفیت نہیں ہونی چاہیے تھی کہ بہت اپنوں اور پیاروں کے درمیان تھی۔ مگر بندہ اب اپنے اِن الٹے پلٹے احساسات کا کیا کرے؟ بالکونی میں بھی ہر دو گھنٹے بعد کھڑے ہونا، تیز ہوائیں پھانکنا، کہیں ماٹھی، کہیں چوکھی دھوپ بھرے آسمان کو دیکھنا اور اُوپر والے سے گلے شکوے کرنا میرے لئے چائے پینے جیسا ہی اہم کام ہوتا تھا۔ آج بھی یہ مشغلہ جاری تھا جب سعدیہ نے کمرے کے عقبی دروازے سے کہا۔

''آپ فوراً تیار ہو جائیے۔'' نیو جیا مسلم سٹریٹ NiuJie Muslim Street چلنا ہے۔ عصر وہیں پڑھنی ہے۔ مسلمانوں کا محلّہ دیکھنا ہے اور کچھ سیر سپاٹا پرانے بیجنگ کے Hutongs کا بھی کرنا ہے۔ چلو ہنسی چہرے پر پھیل گئی۔ یہاں جانے کی بڑی تمنا تھی۔ پہلے دن جب عمران شہر سے طائرانہ سا تعارف کروا رہا تھا تو جی چاہا کہوں یہاں کی قدیم ترین مسجد میں تو لے چلو۔ سر زمین پر رکھ کر کچھ مانگ لوں۔ اپنے لیے نہیں ملک کے لیے۔

پر چپکی رہی کہ جانے کتنا تھکا ہوا ہے؟ دفتر سے آتے ہی تو نکل کھڑا ہوا تھا۔ تیاری میں میں نے کون سے گدھے گھوڑے جوتنے تھے یا ہار سنگھار کرنے تھے۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھی اسی پر کوٹ پہنا۔ چپہ بھر لمبے بالوں میں کنگھا چلایا۔ ہونٹوں کو ذرا سا لال کیا۔ لیجئے تیار تھے۔ باہر کی دنیا سہ پہر کی ماند ماندسی دھوپ میں بڑی حسین نظر آئی تھی۔ سڑکوں کو دیکھتی تھی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے صفائی ستھرائی کا وہ عالم کہ جس کے لیے کہا جاتا ہے پلیٹ نہ ملے تو دال چاول فرش پر ڈال کر کھالو۔ ذہن میں تصویریں ابھر رہی تھیں۔ عورتوں کے جتھے، مردوں کے پرے سائیکلوں پر پیڈل چلاتے۔ مگر وہ تصویریں 1970,80 کی دہائیوں میں اخبارات، رسائل اور ٹی وی پر دیکھی ہوئی کہیں قصہ پارینہ تھیں، جب سائیکل چین کی تمدنی زندگی کا اشیائے خوردنی کی طرح کا ہی ایک حصّہ تھی۔ سائیکل سواری کی مقبولیت کا وہ حال کہ چین صرف اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر پوری دنیا میں مشہور تھا۔ اسے Kingdom of Bicycles کے عنوان سے جانا جاتا تھا۔ اب حسرت سے کہتی ہوں کیا قوم ہے؟ ٹپوسی مار کر کوٹھے پر چڑھی۔ بیچ کی سیڑھیاں تو اڑا کر رکھ دیں۔ جیسے ہمارے ہاں سائیکل سے موٹر سائیکل، چھوٹی گاڑی پھر کہیں بڑی گاڑی کا سفر وہ بھی نصیب سے۔ یہاں افلاس سے افلاک تک کا سفر بس چار دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔

عمران بتاتا تھا۔ سائیکل آج بھی استعمال میں ہے مگر یہ مخصوص جگہوں پر پڑی ہوتی ہیں۔ استعمال کرنے والا خود ہی لاک اور ان لاک کرتا ہے۔ جہاں جانا ہوتا ہے جا کر سائیکل کو وہیں چھوڑ سکتا ہے۔ سال بعد جب میرے بچے اور اُن کے بچے چین گئے تو میرے پوتوں کے پاس سائیکل کے حوالے سے بڑی دلچسپ کہانیاں تھیں۔ انہوں نے رج کر سائیکلیں چلائیں۔ چینی یار لوگوں نے سابق امریکی صدر جارج بش اور ان کی بیگم کو بھی سائیکل پر چڑھا دیا تھا۔ جب وہ 1975 میں بیجنگ میں امریکی سفیر تھے۔ دونوں میاں بیوی

تحفے کی سائیکلوں کو بیجنگ کی سڑکوں پر خوب خوب دوڑاتے پھرتے۔ یونگ دنگ من برج سے مڑے۔اسی کے پہلو ندی ساتھ ساتھ چلی۔دائیں طرف سائے شی کھاؤ سٹریٹ سے سیدھے مسلم محلے پہنچ گئے۔Caishi Kou سڑک سے ہی سبز گنبد کے اشکارے نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔

نیوجیا Niujie دراصل مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔مسجد کوئی 966 ء کے درمیان تعمیر ہوئی۔جس کا سنگِ بنیاد عرب عالم دین ناصرالدین نے رکھا تھا۔بیجنگ کے اِس نیوجیا Niujie علاقے میں ہوئی Hui مسلمانوں بارے چینی تاریخ دانوں اور محقق دانوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ان میں دو نام ڈاکٹر Wen Fei Wang اور Shangyi Zholl بہت اہم ہیں۔ڈاکٹر ون فی وینگ Won Fiwang ، East Asian Languages and Civilization میں ایک محقق اور تنقید نگار کی شہرت رکھتی ہیں۔ڈاکٹر Shangyi Zholl بھی جونارمل یونیورسٹی آف پیکنگ کے شعبہ ریسرچ کے استاد ہیں۔ The Growth and Decline of Muslim Hui پر اِن کا تحقیقی کام بہت اہمیت کا حامل ہے۔خوبصورت علاقہ تھا۔ فلک بوس عمارتیں قطار در قطار شائستگی سے ایستادہ تھیں۔سڑکیں کشادہ اور دکانیں سرخ و پیلے کے امتزاج سے چمک رہی تھیں۔دو باتوں نے توجہ کھینچی تھی۔پہلی بار مانگنے والے دو بندے یہاں اس علاقے میں نظر آئے تھے۔ بوڑھی عورت اور ادھیڑ عمر کا آدمی۔ کچھ دینے سے قبل کھڑی سوچتی رہی یہ مانگنے اور ہاتھ پھیلانے کی ریت آخر ہم مسلمانوں سے ہی کیوں جڑی ہوئی ہے؟ یہ مانگنے والے یقیناً صورت سے چینی ہی لگتے تھے۔ اِن چند دنوں میں اس قوم کا جو مجموعی مزاج اور رویہ نظر آیا تھا۔سعدیہ اور عمران سے جو جو باتیں سُنی تھیں۔اس سے یہی جانا تھا کہ ہاتھ پھیلانا تو اس قوم نے اپنے مزاج سے ہی نکال دیا ہے۔تو پھر یہ گندی عادت مسلمانیت سے

کا ہے کو جڑ گئی ہے۔

دوسری کا تعلق خالصتاً ہمارے نصف ایمان سے تھا۔یعنی صفائی آدھا ایمان ہے۔ یہاں آدھے ایمان سے وابستگی کا وہ اظہار نہ تھا جسے میں کافروں کے ہاں مسلسل دیکھتی چلی آرہی تھی۔ پتہ نہیں ہم مسلمان ہر معاملے میں ڈنڈیاں کیوں مارنے لگے ہیں؟ دوکانیں بڑی رنگ رنگیلی سی تھیں۔دوکانوں کے باہر سرخ رنگ کے گول پھندنے والے ڈیکوریشن پیس جو غالباً چین کا برکت وخوشحالی کا علامتی نشان ہیں یہاں بھی یہ کم وبیش اکثر دکانوں کے ماتھوں پر جھومر کی طرح لٹکتے نظر آئے تھے۔ایک اور چیز ہماری مسلمانیت کی تسکین کرتا جذباتی سا منظر کہ کِسی کِسی دکان کے دروازے پر کلمہ طیبہ کا چسپاں ہونا آنکھوں کی چمک بڑھانے اور قلب کو سرشار کرنے کا باعث تھا۔سبزیاں دیکھیں۔ جہازی سائز مولیاں اور بینگن۔اف میرے اللہ ٹبر کے لیے ایک بینگن ہی کافی ہے۔ چونکہ یہاں مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد ہے۔اس لیے بہترین حلال گوشت کے لیے بھی یہ علاقہ بیجنگ میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔یہیں حلال گوشت کی قدیم ترین دُکان ہے جو کہیں 1912ء میں قائم ہوئی تھی۔ مزے کی بات یہاں بہترین چائے کی دکانیں تھیں۔مٹھائی اور پیسٹری کی بھی۔ بند خریدا۔ 1.5 یوآن کا۔ہائے اتنا مہنگا۔ایک تو کمبخت ضرب تقسیم کی گندی عادت جان نہیں چھوڑتی۔

بیسن میں لُتھڑے چکن پیس دیکھ کر تو گویا منہ ہی پانی سے بھر گیا تھا۔

’’بھئی انہیں تو خریدنا ہے ہر صورت۔‘‘یہیں ایک بڑے سے سٹور میں جائے نماز،ٹوپیاں،تسبیحاں،حجاب اور احرام وغیرہ بھی ملتے ہیں۔عمران نے ایک دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ چاولوں کے لیے خصوصی شہرت کی حامل ہے۔ چلتے چلتے ایسا من موہنا سا منظر آنکھوں سے ٹکرایا تھا کہ جس نے رک جانے پر اصرار کیا تھا۔رکی اور پلٹ کر ایک لمبی نظر اپنی پشت پر ڈالی۔ پانچ چھ دکانوں کی ایک قطار کی آرائش لاجواب تھی۔کتنی

دیر کھڑی انہیں تکتی رہی، تکتی رہی۔حتیٰ کہ سعدیہ نے آواز دی۔لمبی ملگجی سی دیوار کے ساتھ چلتے جس کے اندر سے جھانکتے درخت پر کھلے سفید پھولوں کو مسکرا کر دیکھتے اور آگے بڑھتے ہوئے ایک چھوٹے سے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔یہ ایک انوکھا سا منظر تھا۔قدامت کے دل کش چینی فن تعمیر میں ڈوبا ہوا وہی پگوڈا نما چھجے دار شیڈ والا۔پہلی نظر میں مسجد کا تاثر ہرگز نہیں سامنے آیا تھا۔اسلامی فن تعمیر کی بھی کوئی علامت بظاہر نظر نہیں آتی تھی۔مگر ذرا سا ہی غور کرنے پر اسی چھجے دار پگوڈا اسٹائل کے نیچے عین محرابی صورت ڈیوڑھی نما راستے پر کلمہ طیبہ لکھا نظر آیا۔تسکین کی ایک لہر رگ وپے میں دوڑی تھی۔

اس کے اندر کے مختلف حصوں کی زیارت کرنا میرے حسابوں بڑا ایمان افروز تھا کہ وہاں وہ سب کچھ تھا جسے دیکھنے کی مجھے چاہت اور تمنا تھی۔چوبی منقش ستون، محرابیں اور قرآنی آیات سے سجی دیواریں۔اس وقت شام تھی۔اندر کی اس خاموش شام میں اس کے حسن نے پورے ماحول کو متاثر کر رکھا تھا۔ہم نے سوچا سب سے پہلے اس کے بقیہ حصّے دیکھ لینے چاہیں۔گوچہل پہل اور گہما گہمی والی فضا نہ تھی۔پتہ نہیں اللہ کے گھر رونق دیکھنا کیوں اچھا لگتا ہے۔مسجد کے مردانہ اور زنانہ حصّوں کو دیکھ کر مرکزی جگہ پر جب واپس آئے دیکھا کہ صحن میں کافی لوگ تھے۔جاننے پر پتہ چلا کہ یہ تین خاندان تین ملکوں سے ہیں۔

ایک کا تعلق چین کے شہر لانچو سے تھا۔میاں بیوی اور بچہ۔تھوڑی سی باتیں ہوئیں۔لانچو میں مسلمان کافی تعداد میں ہیں۔دنیا کی بہترین چائے کے لیے بھی یہ علاقہ خصوصی شہرت کا حامل ہے۔دوسرا خاندان انڈونیشیا کا تھا۔اچھے محبت والے لوگ ملنسار سے۔تیسرا خاندان جو اس دوران نظر آیا۔وہ ملائیشیا سے تھا۔نوجوان لڑکا نیوی میں ملازم، سانولے رنگ کی خاتون جو اس کی شریک حیات تھی کوالالمپور میں سیکنڈری اسکول میں ریاضی کی استاد تھی۔دو چھوٹی چھوٹی بچیاں ساتھ تھیں۔تاہم عجیب سی بات تھی کہ بچیوں کے اجسام

پر گرم کپڑے نہیں تھے۔ دونوں میاں بیوی خود اچھی طرح لپٹے لپٹائے تھے۔ گو مارچ کا آواخر تھا مگر ٹھنڈ تو خاصی تھی۔ ہواؤں میں وہ تیزی تھی جو تندی کے حساب میں جاتی ہے۔ بڑے بڑے رک سیک ساتھ تھے۔ پورے ٹورسٹ تام جھام کے ساتھ لدے پھندے تھے۔ایک دل گدازسی داستان بھی ساتھ تھی۔ تین دن مرکزی بیجنگ کے کسی مہنگے ہوٹل کے بعداب کسی سستے کی تلاش میں نکلے تھے۔ پوچھتے پوچھاتے یہاں آگئے۔اب رہنمائی کے طالب تھے۔داہنے ہاتھ انتظامی دفاتر کے کمرے تھے۔عمران نے اُسے وہاں جانے اوراُن سے مشورے کا کہا۔مرد نے بیوی کو وہیں مسجد کے پہلے داخلی دروازے کے پاس جہاں ہم سب کھڑے تھے چھوڑااورخودکھوج کے لئے چلا گیا۔

ہم نے بھی سوچا کہ عصر کی اذان سے پہلے پہلے ہمیں مسجد کا ایک تفصیلی سا چکر لگا لینا چاہیے۔مسجد کے مختصر سے لان کے جھاڑ جھنکار نے دل کوملال سے بھر دیا۔ہائے اِسے تو سرسبز رکھنا ضروری تھا۔چلو مانا موسم کی انتہائی شدت نے اس پر اپنے اثرات چھوڑے ہوئے ہیں۔بہرحال اِس ساری افسردہ کیفیت کوایک طرف رکھتے ہوئے سامنے کی طرف بڑھے۔کتب خانہ کشادہ بھی تھااور کتابوں سے بھی بھرا ہوا تھا۔شیشے کی بند الماریوں سے آنکھیں لڑالڑا کر دیکھا مگر وہ یا تو چینی میں تھیں یا پھر عربی میں۔کمرے کی فضا میں نیلگوں اورارغوانی رنگ نمایاں تھا۔جس کے امتزاج نے ماحول میں بے نام سی اداسی اور کچھ کچھ تاریکی کا سااحساس نمایاں کررکھا تھا۔عورتوں کا حصہ خاصا قابل رحم تھا۔فائبر گلاس کے لمبے مستطیل نما سبز شیڈ کی چھت کچھ اچھا تاثرنہیں چھوڑتی تھی۔کمرے کا سارافرش دریاں ٹائپ غریبڑے سے قالینوں سے ڈھنپا ہوا تھا۔ایک کمرے میں مقامی دستکاری کی چیزیں تھیں۔ کمرہ بند تھا۔مسجد کا مردانہ حصہ پھربھی بہت بہتر تھا۔فضا میں اذان کی آواز گونجی۔مگر یہ وہ تاثر پیدا نہ کرسکی جوایک خوش الحان موذن کی رسیلی آواز کرتی ہے جو سننے والے پر جادوئی سے

احساس کا تاثر چھوڑتی ہے۔ سیاہ پینٹ لمبی سیاہ شیروانی ٹائپ گوٹ پر سفید عمامہ پہنے ایک ادھیڑ عمر چینی عقب سے آیا۔ مسجد کے صحن میں کھڑا ہوا۔ چھ بندے اُسی طرح کے لباس میں آئے اور عین امام کے پیچھے اور دائیں بائیں پھیل گئے۔ اللہ اکبر کے ساتھ نماز باہر کھلے صحن میں ادا ہونے لگی۔ ہاں البتہ ایک بڑا دلچسپ سا منظر بھی دیکھنے کو ملا۔ اقامت اور رکوع کے دوران دو تین نمازیوں کو اِدھر اُدھر بھی دیکھتے ہوئے پایا۔

1969ء یادوں میں ابھرا تھا جب میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں تھی اور رمضان کے آخری دنوں میں عید منانے کے لیے اپنی کلاس میٹ اور ہوسٹل میٹ ریبا کے ساتھ باریسال سے صاحب رائے جا رہی تھی۔ سفر فیری لانچ پر تھا۔ عصر کی نماز لوگوں کو پڑھتے دیکھا تو ہنسی آئی تھی۔ تانک جھانک کا بس ایسا ہی سلسلہ جاری تھا۔ ہم ابھی وہیں تھے جب کوئی بارہ تیرہ لوگ اندر آئے۔ سر پر چینی ٹوپیاں اور لمبی داڑھیاں۔ یہ بیجنگ کے چینی تھے اور سب کا تعلق تبلیغی جماعت سے تھا۔ عمران سے جب وہ باتیں کرتے تو چینی کی بجائے انگریزی بولتے تھے۔ لہجہ گو اچھا نہ تھا تاہم بات چیت میں روانی تھی۔ انہوں نے رائے ونڈ کا ذکر کیا جس کے سالانہ اجتماع میں وہ اکثر جاتے رہتے تھے۔ ملائی خاتون کا شوہر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ اس تبلیغی گروپ سے باتیں کرنے لگی۔ گفتگو سے پتہ چلا کہ ملائیشیا اور چین کا ایک گہرا تعلق ہے۔ ملائیشیا میں چینیوں کی خاصی تعداد آباد ہے۔ مسجد کے سیر سپاٹے اور لوگوں سے بات چیت میں وقت کا تو احساس ہی نہ رہا۔ اب مغرب سر پر کھڑی تھی۔ سوچا اِسے بھی نپٹا لیں وگرنہ قلق رہے گا کہ عین وقت نماز اللہ کے گھر سے نکل آئے۔ Hutong دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہیں ایک ریسٹورنٹ سے ہم نے کافی لی۔ چکن اور بند دونوں کا تیاپانچہ کیا۔ شام گہری ہو رہی تھی جب واپسی کی۔ Hutongs کا سیر سپاٹا پھر کسی وقت پر اٹھا دیا تھا۔

باب نمبر:٦ ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ سے ملاقات

- ظفر محمود چین پر ایک اتھارٹی جیسی حیثیت کی حامل شخصیت ہے۔
- ہر چینی قیادت پاکستان کے لیئے بہت مخلص رہی۔
- آئیڈیل لوگ اور آئیڈیل نظام کہیں نہیں ملتا۔
- اگر آپ چین سے محبت کرتے ہیں تو پاکستان سے بھی محبت کریں۔

بیجنگ میں مجھے کِس ادیب اور کِس شخصیت سے ملنے کی ضرورت ہے؟ شعیب بن عزیز سے بہتر بھلا میرا کون صلاح کار ہوسکتا ہے؟ شعیب کے لیے چین تو بس گھر آنگن والی بات تھی۔ وہ صلاح کار بھی بڑا اچھا ہے اور بیوروکریسی والے نخرے ٹخروں سے بھی ذرا دور دور ہی ہے۔فون کھڑکھڑایا۔ مدعا گوش گزار کیا۔

’’ظفر محمود سے بات کرو۔ چین پر اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔‘‘

ظاہر ہے اب ظفر محمود کو ہی آواز دینی تھی۔سودی۔انہوں نے ایک فون نمبر لکھوایا۔ ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ کا نام بتایا۔یہ بھی کہا کہ موصوف شعبہ پاک چین سٹڈیز پیکنگ یونیورسٹی کے سربراہ ہیں۔اُن سے ملنا آپ کے لیے ضروری بھی ہے اور فائدہ مند بھی۔

عمران نے سفارت خانے کے پریس آتاشی سے بات چیت کے بعد بتایا کہ ایمبیسی ان کی صلاحیتوں کی بہت معترف ہے۔ وہ پاک چین دوستی کے حوالے سے بہت اہم اور متحرک شخصیت ہیں۔

پس تو آج ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ سے ملنے جانا تھا۔کل شام عمران نے بات کی تھی۔ وقت مانگا تھا۔اپنا حوالہ دیا تو تصدیق مانگی جو اس نے فوراً دی اور دس بجے صبح کا وقت

طے ہو گیا تھا۔

پیکنگ یونیورسٹی کہیں اللہ میاں کے پچھواڑے ہی تو تھی۔ عمران نے اِسے بیجنگ کا جنوب کہا تھا۔ میرے حسابوں سمت خواہ مشرقی ہو یا مغربی، شمالی ہو یا جنوبی، سین ہر جا ایک سے ہوں گے سو فی صد درست تھی۔ وہی نظر نواز عمارتیں، کہیں آسمان کو چھوتی اور کہیں درمیان میں لٹکتی مٹکتی، وہی اور ہیڈ برجوں پر چڑھتے اترتے لوگ، وہی کناروں پر سائیکلوں اور سکوٹیوں پر بیٹھی عورتیں اور لڑکیاں، وہی ٹریفک کا اژدھام، گاڑیوں کی ریل پیل اور وہی میرے حاسدی دل سے اُٹھتی ہوکیں۔

یونیورسٹی بارونق جگہ پر تھی۔ شاندار عمارتوں کے سلسلے، سرسبز لان اور طلبہ کی دائیں بائیں آنیاں جانیاں۔

اپنا وقت یاد آیا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی یاد آئی تھی۔ جہاں کہیں چین نواز اور کہیں روس نواز لڑکیاں ماؤ اور لینن کے نعرے لگاتی تھیں۔ تب سوچا کرتی تھی یہ ماؤ اور لینن کتنے بڑے لیڈر ہیں؟ کوئی بیٹھا چین میں اور کوئی روس میں ہے۔ پر اجنبی ملکوں کے لڑکے لڑکیاں ان کے لیے جنونی اور پاگل ہو رہے ہیں۔

اور تب کیا میں نے لمحہ بھر کے لیے بھی کبھی سوچا تھا کہ میں عمر کے کسی حصّے میں اِن دونوں بڑے لوگوں کے دیس جاؤں گی۔ یقیناً نہیں۔ تب اڑان اتنی اونچی نہ تھی۔

گاڑی جب پارکنگ ایریا میں پارک کی تو وقت یہی کوئی پونے دس کا تھا۔ ایک دو لوگوں سے پوچھا۔ توجہ سے سمجھایا۔ کچھ صحیح چلے کچھ غلط۔ ڈپارٹمنٹ تو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سامنے ایک سہ منزلہ عمارت تھی۔ سوچا چلو ذرا گھومتے پھرتے ہیں۔ ایک جانب قدرے ویرانے میں اُترتی سڑک پر ہو لیے۔

پھر کال کی۔ تھوڑی سی راہنمائی اور جھیل کی طرف آنے کی ہدایت ملی۔ راستے

پتھریلے تھے۔ باڑیں خوبصورت اور گردونواح حسن ورعنائی سے بھرا ہوا تھا۔ خصوصی طور پر وہ بلندوبالا منفرد ٹائپ کا پگوڈا جس کے عین سامنے انتظار کا کہا گیا تھا۔

سامنے ایک وسیع وعریض جھیل پھیلی ہوئی تھی۔ مگر کشتیاں کہیں نہیں تھیں؟ بھلا یونیورسٹی کی جھیل ہو اور کشتیوں کے بغیر۔ رومانس کہاں ہوتا ہوگا؟ چینی کیا اتنے روکھے پھیکے سے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کی نہر اور اس میں چلتی من چلوں کی کشتیاں بھلا کیوں نہ یاد آتیں۔ آئیں مگر دکھی بھی کر گئیں۔ کہیں مذہبی انتہا پسندی، کہیں دہشت گردی کے خوف، اس کے حُسن کا بیڑہ غرق ہوا پڑا تھا۔

اب تصویر کشی بھی شروع کردی۔

ساس اور داماد تصویر کشی میں مصروف تھے جب وہ تشریف لائے۔ درمیانی قامت پر قدرے فربہی مائل جسم۔ محبت سے ملے۔ ''روس کی ایک جھلک'' اپنا سفرنامہ پیش کیا۔ چند تصاویر اُن کے ساتھ بھی بنوائیں۔

اب آفس کی طرف بڑھے جو قریب ہی ایک مختصر سی دو منزلہ عمارت میں تھا۔ عمارت میں سناٹا تھا۔ نائب قاصد یا چپڑاسی نام کا کوئی بندہ نہ بندے کی ذات کا یہاں وجود نہ تھا۔ کمرہ اوپر کی منزل میں تھا مگر خدا کا شکر کہ سیڑھیاں انتہائی آرام دہ تھیں۔

حیرت ہوئی اتنی بڑی پوسٹ کے بندے کا کمرہ چھوٹا ہی نہ تھا بلکہ سادگی میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ میز کمپیوٹر، پرنٹر اور ریسرچ کے پیپروں سے بھری کچھ کہانیاں سناتی تھی۔

اب خود سے کہتی ہوں میرے حسابوں ان کی پوسٹ یا عہدہ اکیسویں گریڈ سے کیا کم ہوگا؟ پاکستان جیسے غریب ملک میں اِس عہدے کے بندے کی دفتری شان وشوکت اور کروفرّ کا دیکھنے سے تعلق ہوتا ہے۔

اور یہاں کمرے کے کسی کونے میں کسی چھوٹی موٹی میز پر کوئی الیکٹرک کیٹل،

چائے یا قہوے کے کپ، کوئی ٹی بیگز کا ڈبہ کچھ نہ تھا۔ کمرے کے جائزے سے فارغ نگاہیں اب ان پر جم گئی تھیں۔

''کچھ پاکستان بارے اپنے تاثرات بتائیے۔ اتنا آنا جانا لگا رہتا ہے آپ کا۔''

کچھ بتانے کچھ کہنے کی بجائے سب سے پہلے انہوں نے ایک پاکستانی ادیبہ بارے پوچھتے ہوئے کہا۔

''اب نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ پر بقیہ بہت سے حوالے یاد ہیں مجھے۔ بڑی غصیلی ہے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی ہے۔ بحث بہت کرتی ہے۔ کالم نگاری کمال کی ہے۔ شاعرہ بھی ہے۔ عورتوں کے حقوق بارے بھی بڑی متحرک ہے۔''

بڑی معصومیت سی تھی لہجے میں۔

''کشور ناہید کی بات کرتے ہیں یقیناً آپ۔''

''ہاں ہاں'' کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میری یادوں میں اپنا پہلی بار پاکستان جانا یاد ہے۔ اس وقت چینی لوگوں میں پاکستان جانے کا ایک کریز تھا۔ میرے جانے کی خبر جب میرے قریبی عزیزوں کو ملی تو اُن کی فرمائشیں شروع ہوگئیں۔ ہمارے لیے گھڑی لانی ہے۔ کوئی جوتوں کی بات کرتا تھا۔ 1980ء سے 1987ء تک کے دوران مجھے یاد ہے چینیوں کی پاکستان جانے والوں سے کچھ ایسی ہی فرمائشیں اور مطالبات ہوتے تھے۔

اس وقت 240 فی کس آمدنی ایک پاکستانی کی اور چینی کی 140 تھی۔ مگر اب معاملات کی صورت یکسر فرق ہوچکی ہے۔ آج پاکستانی فی کس 1600 اور چینی 4000 ہزار اور یہ بھی کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ یہی وہ پاکستان ہے جس کو ہم 1970ء میں اپنا استاد مانا کرتے تھے۔ 1960ء میں اس کے کراچی جیسے شہر کو دیکھ کر

حسرت سے کہتے تھے کہ کاش ایسا ایک شہر ہمارے پاس بھی ہو جہاں اتنی فلک بوس عمارتیں ہیں۔

ایک دو پل کی خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئے۔

چینی لیڈروں نے اپنے لوگوں کو ایک خواب دکھایا تھا۔ چین کی نشاۃ ثانیہ کے حصول کا خواب۔ چین کی پرانی اور نئی نسل کی امنگوں کا ترجمان جس میں اقتصادی، سیاسی، ثقافتی، سماجی اور ماحولیاتی ترقی جیسے اہم عناصر شامل تھے۔ ترقی کے اوائل 1987 کے دن جب دنیا سے کٹی ہوئی اس قوم کو صرف چھ انڈے اور آدھ کلو چینی پورے ماہ کے لیے ملتی تھی۔

اگر آج ہم دنیا کی دوسری اکنامک پاور ہیں تو تعاقب میں جدوجہد بھی بے مثال ہے۔ محض چالیس سال میں اس قوم اور ملک نے اپنے اہداف حاصل کیئے اور مزید کے لیئے سرگرم ہے۔ ایسے ہی خواب ہماری حکومتوں نے پاکستانیوں کو بھی دکھائے۔ ان کی طرف بڑھنے اور اُن کی تکمیل کرنے کو کہا اور دل سے چاہا کہ وہ کامیاب ہوں۔ مگر مجھے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ پاکستانی حکومتیں سنجیدہ نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان اقتصادی ترقی میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

اب میرے دل کی دنیا کا اُن کی ایسی محبت بھری دکھی باتیں سن کر اُتھل پتھل ہونا تو لازمی امر تھا۔ کیسی بدنصیب قوم ہیں ہم۔ اس تنزلی اور زوال کی وجوہات سے میں اپنے حسابوں آگاہ تو تھی مگر ڈاکٹر تھانگ کا نقطہ نظر کیا تھا؟ یہ جاننا بھی تو ضروری تھا۔ تو سوال ہوا اور جواب کچھ یوں تھا۔

میرے حسابوں آپ کی قوم میں چند چیزوں کا فقدان ہے۔ یہ ذہین ہیں۔ مگر پتہ مار کر کام کرنے کی عادت نہیں۔ شارٹ کٹ راستوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ راتوں رات امیر بننا چاہتے ہیں۔ ویسے اثاثوں اور پیسوں کی تقسیم تو 5 فی صد کے ہاتھوں میں ہے۔ امیر

غریب کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔سیاسی استحکام نہیں اور اِسے پیدا ہونے بھی نہیں دیا جاتا۔قابض لوگ نظام کی بہتری کو متاثر کرتے ہیں۔

وہ خاموش ہوگئے۔اُن کی چھوٹی چھوٹی ذہین آنکھیں جیسے کسی گہری سوچ میں غرق سی تھیں۔دیر بعد بولے تھے۔

دراصل اچھی مخلص،سمجھ دار اور ایماندار لیڈرشپ کا بھی بحران رہا۔کچھ مخلص اور کرشماتی شخصیت کے لیڈر ملے بھی۔وہ آئے بھی۔انہیں کام کرنے کا موقع دینے کی ضرورت تھی۔مگر سازشوں اور غیر جمہوری ہتھکنڈوں سے بساط سیاست ہی لپیٹ دی گئی۔بھئی ٹانگیں نہ کھینچو۔اس بات کو گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قومی نوعیت کے پروگرام کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتے۔ان پروگراموں کا تسلسل حکومتوں کے آنے جانے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

ہماری حکومتوں نے سختی سے اِس اصول پر عمل کیا۔ہر ایک نے اپنا سفر وہیں سے شروع کیا جہاں پچھلی حکومت نے اسے چھوڑا تھا۔اب اپنے کلیجے کی سڑانڈ کو باہر کیا نکالتی کہ اِس پیارے ملک کو تو ہر ایک نے اپنی جاگیر جانا۔اول تو جانے والے نے کوئی ڈھنگ کا کام ہی نہیں کیا اور اگر کہیں کچھ ہوگیا تو آنے والا اُسے مٹانے کے درپے ہوگئے۔

خیالوں سے نکلی۔

ڈاکٹر تھنگ بول رہے تھے۔آئیڈیل لوگ اور آئیڈیل نظام کہیں نہیں ملتا۔ہمارے ہاں ماؤ جیسے فکری لیڈر کے ہاں بھی غلطیوں کے ڈھیر ہیں۔مل کر چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔کہیں خود پیچھے ہٹیں۔کہیں انہیں ہٹائیں۔ایک دوسرے کو space دیں تاکہ انہیں بھی آسمان نظر آئے۔

میں پندرہ بیس سال سے پاکستان مسلسل آجارہا ہوں۔پاکستان کو ٹھوس اقدام

اٹھانے ہوں گے۔گذشتہ پانچ سالوں سے سی پیک پر جس رفتار سے ترقی ہونی چاہیے۔نہیں ہوئی۔

اگر میں صرف 2018 کی پاکستان جانے کی تفصیلات کا ذکر کروں تو یہی صرف دس کے قریب ہوتی ہیں۔کہیں مختلف سمیناروں میں اور کہیں انڈسٹریل زون کارپوریشنوں پر بات چیت کے لیے۔مگر مجھے بہت دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ پاکستان میں کوئی 110 کے قریب زون ہیں لیکن ان کی پالیسیاں ہی واضح نہیں۔سمیناروں کا رواج زیادہ بڑھ گیا ہے میری تمنا عملی طور پر سمیناروں کی ہے نہ کہ روٹین کی خانہ پریاں۔نشستند و برخاستند والی بات نہیں ہونی چاہیے۔

وہ خاموش ہو گئے تھے۔سامنے دیوار کو تکتے رہے پھر گویا ہوئے۔دراصل باشعور ہنر مند لوگوں کو اِن سمیناروں میں پورا لائحہ عمل دیں۔وقت کا تعین،ٹھوس اقدامات اور عمل ہو۔پاکستان میں ترقی کی رفتار بہت تیز ہونی چاہیے۔اب چین میں تین چھٹیاں بھی وارے میں ہیں، پہلے بہت کم تھیں۔

پاکستانیوں کی ایک عادت سے بھی مجھے بہت شکایت ہے کہ ابھی دفاتر میں کام پوری طرح شروع بھی نہیں ہوا کہ چائے کے لیے گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتی ہیں۔چائے اور وہ بھی ماشاءاللہ سے دودھ والی۔اکثر تو کڑک والی پیتے ہیں۔پھر یہ سلسلہ ہر میل ملاقاتی کی آمد پر جاری رہتا ہے۔

آپ کو اپنے اندر کی بات بتاؤں۔میرا دلی تعلق اس ملک سے ہے۔میں سمجھتا ہوں اگر آپ چائنا سے محبت کرتے ہیں تو پاکستان سے بھی محبت کریں۔

☆☆☆

باب نمبر:۷ تھین آن من سکوائر سے جڑی یادیں

- یادگار ستون پر کندہ نام جیالے شہدا کے تھے جنہوں نے انقلابی جدوجہد کو خون دیا۔
- نیشنل میوزیم دنیا میں تیسرے نمبر کی ممتاز حیثیت لیے کھڑا ہے۔
- نہ بچوں نے ہار مانی نہ بڑوں نے عقل کی۔سکوائر خون میں نہا گیا تھا۔

اس وقت میں کہاں کھڑی ہوں؟ تھین آن من سکوائر میں۔اس کی وسعتیں باپ رے باپ۔ایک سمت سے دیکھنا شروع کرو تو دوسری طرف جاتے جاتے شام پڑ جائے۔بیچاری آنکھیں کیا کریں۔آج کل تو ان غریبڑیوں کی شامت آئی پڑی ہے۔گھر سے نکلتے ہی ہر دوسرے قدم پر خوبصورتی ،انوکھی اور منفرد چیزوں کے نظاروں پر پھٹی پھٹی جاتی ہیں۔اب یہی کچھ یہاں ہو رہا ہے۔

تاہم ایک بات ضرور تھی۔مجھے اس سے کچھ کچھ شناسائی کا سا احساس ہوا تھا۔میرا اندر کمبخت مارا سوال پر سوال کیے جا رہا تھا۔کیا اس کے بارے کچھ پڑھا ہے، کچھ سنا ہے، کچھ دیکھا ہے؟

ان تابڑتوڑ حملوں پر میں نے پھٹکارتے ہوئے کہا۔

’’کمبخت ہڈحرام میری جان کھائے جا رہا ہے۔اس نانہجار بھیجے سے پوچھ کہ اُسے کیوں کچھ نہیں سوجھ رہا ہے۔بول بتا۔‘‘

لعن طعن پر خاموشی تو ہوگئی مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر اندر کھلبلی سی مچنے لگی۔آنکھیں

بھی بار بار گومگو والی جھپکیاں لے رہی تھیں جیسے شش و پنج میں ہوں۔ یادوں کی گٹھڑی میں مطالعہ کی صورت محفوظ کسی تحریر کا کوئی ٹوٹا یا تو تھا ہی نہیں یا پلّہ نہیں پکڑ رہا تھا۔ کسی دیکھے ہوئے منظر نے بھی شور شرابا نہ کیا۔ کسی سنی سُنائی بات نے بھی یاد آکر مُطمئن نہ کیا۔ زچ ہو کر سر جھٹکا اور گرد و پیش کو دیکھنے لگی۔

بیجنگ کے مٹیالے سے آسمان پر آج سورج کی چمک دمک آنکھوں کو چندھیانے جیسی ہی تھی۔ عمران بہترین گائیڈ تھا۔ اس کی کمنٹری شروع تھی۔

دنیا کا سب سے بڑا سکوائر جو شہر کے وسط اگر کل کے قدیم بادشاہوں کی شاہی سرگرمیوں کا مرکز تھا تو حالیہ حکومتوں کی ثقافتی، فوجی اور ملکی سرگرمیاں بھی اسی مقام کی مرہون منت ہیں۔

قومی ہیروز سے ملنے انہیں دیکھنے کا کام پہلا تھا۔ گردن جہاں تک اوپر اٹھتی تھی اٹھا دی اور اِس Obelisk کو دیکھا جس پر انیسویں اور بیسویں صدی کے وہ جیالے شہدا کندہ تھے جنہوں نے انقلابی جدوجہد کو اپنا خون دیا۔

دس منزلہ عمارت جتنی قامت رکھنے والی اِس یادگار پر جانبازوں کو کن الفاظ میں خراج پیش کیا گیا ہے اِسے عمران نے گذشتہ شب لیپ ٹاپ پر دکھایا اور بتایا تھا۔

زمانے گزر جانے کے بعد بھی یکم اکتوبر 1949 کے اِن منظروں کو بلیک اینڈ وائٹ صورت میں دیکھنا بڑا خوش کن تھا۔ جب ماؤ ایک عہد کے ختم ہونے اور نئے عہد کے شروع ہونے کا اعلان کرتا تھا۔ تب یہ میدان لوگوں سے اٹا پڑا تھا۔ فوجی دستوں کی پریڈ اور ماؤ کے ایک بٹن دبانے پر پنج ستارہ پرچم کا دھیرے دھیرے اوپر آنا رگ وپے میں سنسنی کی سی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ جوشیلی اور پرعزم خواتین کے بازوؤں کا ہواؤں میں لہراتے ہوئے دیکھنا، چواین لائی جیسی شخصیت کو سُننا سبھی دیکھے ہوئے منظروں سے وجود ہلکورے سے کھاتا

تھا۔

آنکھیں بھیگ سی گئیں۔شاید ہونٹ کہنے سے باز نہیں آئے تھے۔

''اے جیالو اگر تم کہیں اپنے چین کو اس وقت آکر دیکھو یقیناً تمہیں تو یقین ہی نہیں آئے گا۔''

دو آنسو ٹپ سے گالوں پر گرے تھے۔فوراً ہی انہیں صاف کرتے ہوئے خود سے کہا۔

''بخدا میں حاسدی نہیں۔مگر کم وبیش دو سال کے فرق سے ایک ساتھ آزاد ہونے والے موازنوں کی زد میں تو آجاتے ہیں۔فطری سی بات ہے۔اب کہاں ایک آسمان کی بلندیوں کو چھوتا اور دوسرا پاتال میں گرنے کو تیار۔''

نگاہیں یہاں سے اُٹھتی ہیں تو اس سے تھوڑا پرے عین مرکز میں ماؤ کے میموریل ہال سے جاٹکراتی ہیں۔یہ ماؤ کا مقبرہ ہے۔داخلی دروازے سے تھوڑے فاصلے پر ماؤ اور اس کے ساتھیوں کے مجسمے دیوار پر کندہ نظر آتے ہیں۔ماؤ کے بہت سارے ساتھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، کہیں یک جان و یک بدن کی سی صورت بنائے، کہیں کھڑے، کہیں بیٹھے، کہیں قریبی ساتھی پر گرے، کہیں مٹھّیاں کستے، کہیں بازوؤں کو لہراتے ماؤ کی چھتر چھاؤں میں اپنے چہروں پر گوناگوں تاثرات کی نمائندگی کرتے تھے۔اس کی خوبصورت عمارت اور سفید سیڑھیوں نے آنے کے لیے کہا۔

''ارے بھئی جلدی کا ہے کی ہے۔آرام سے دیکھنا ہے تمہیں۔ابھی تو بس ہیلو ہائے کرنے آئی ہوں۔''

عین سکوائر کے ماتھے پر چمکتے ٹیکے کی طرح گریٹ ہال آف دی پیپل کی عمارت چمکتی ہے۔بالمقابل نیشنل میوزیم آف چائنا بھی ہے۔شمالی سمت شہر ممنوعہ ہے۔تھین آن من

سکوائر کا گیٹ جسے Heavenly Peace گیٹ کہتے ہیں دونوں کو جدا کرتا ہے۔

سکوائر کی مشرقی سمت نیشنل میوزیم کی خوبصورت اور ایکڑوں پر محیط عمارت تھی۔ جسے دیکھنے کی میری بے پناہ خواہش تھی۔ عمران کے لیے میری اِس دلچسپی کو سمجھنا مشکل نہ تھا۔ وہ خود اِسے دوبار دیکھ چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ دنیا کے چند بہترین میوزیم میں سے ایک ہے۔ مزے کی بات ہے کہ اس کا ٹکٹ بھی نہیں تھا۔ دراصل عام لوگوں کو تاریخ خاص طور پر ماضی وہ بھی ماضی بعید سے دلچسپی ذرا کم کم ہی ہوتی ہے۔

کہیں چین کے سیاسی اور سماجی سطح پر رویوں کے اظہار سے کچھ یون جان پڑتا ہے کہ وہ ہر سطح پر کسی نہ کسی انداز میں بلند ترین مقام پر فائز ہونے کا خواہش مند ہے۔ یہاں دو تین میوزیم کی یکجائی سے اِس نے اتنی وسعت گھیر لی تھی کہ گو یہ فرانس کے لوور Louvre اور روس کے ہرمیٹیج کے اگرچہ برابر تو نہ آسکا۔ مگر ایک ممتاز حیثیت ضرور اختیار کر گیا ہے۔ اس وقت تیسرے نمبر پر کھڑا ہے۔

اپنی شاندار امپیریل تاریخ کو سلسلہ وار ایک جگہ اکٹھی کرنے، کیمونسٹ دور کی جدوجہد اور اس کی فتح اور موجودہ ماڈرن تاریخ پر محیط یہ میوزیم چین کی ساری کہانی حتیٰ کہ اس کے سپر پاور ہونے کے امکان کو بھی روشن کرتا ہے۔

سچ تو یہ تھا کہ میں بہت تھک گئی تھی۔ میوزیم کے بند ہونے کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ بستر پر تھوڑی دیر آرام کرنے کی خواہش ہر احساس پر غالب آ گئی تھی۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی تھی۔

سونے سے قبل جب میں ڈائری میں اس دن کے واقعات قلم بند کرنے بیٹھی۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا جیسے ایکا ایکی میرے دماغ کے نہاں خانوں میں آسمانی برق کی طرح چند یادوں کی جھلملاہٹ ہوئی ہے۔ تعاقب میں منظروں کی لام ڈور بھی بادلوں کی گڑگڑاہٹ کی

طرح بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔ میں نے دیکھا تھا۔ تھین آن من سکوائر اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ سامنے تھا۔ مگر خالی نہیں تھا۔ نوجوان بچوں بچیوں سے بھرا ہوا تصور کی آنکھوں کے سامنے متعدد منظروں کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔

یہ شناسائی کے خوفناک اور لرزہ خیز منظر کہیں یادوں میں ایک تلخ المیے کی دُھندلی سی صورت میں موجود تھے جو اس وقت اچھل کر سامنے آ گئے تھے۔

اور ستم یہ بھی ہوا کہ میں ایک طرح سوالات کی سان پر چڑھ گئی تھی۔

''یہ میرا بڑھاپا ہے کیا جس نے میری بہترین یادداشت کو اب متاثر کرنا شروع کر دیا ہے؟

یہ اتنا اہم واقعہ کیسے میری ذہنی سلیٹ سے غائب ہو گیا یوں کہ جیسے کسی نے اس پر گیلی ٹاکی پھیر دی ہو۔''

اور پھر وہ ہوا تھا جس کا ذکر آغاز میں کیا گیا ہے۔ اب قلم کاپی ایک طرف رکھتے ہوئے مضطربانہ انداز میں آنکھیں بند کرتے ہوئے میں نے خود سے پھر پوچھا تھا۔

''آخر ایسا کیوں ہوا؟'' یہ عام اور معمولی واقعہ نہ تھا۔ اِس حادثے کا دکھ اس کا کرب اس وقت براہ راست میری ممتا پر پڑا تھا۔ میں نے جانے کتنے آنسو بہائے تھے۔ دراصل ماؤں کو مذہب، رنگ، نسل، سرحدوں، سیاست، اقتدار، امن، فساد جیسے فکری نظریہ ہائے حیات اور ان کے پس منظر میں کام کرتے عوامل سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔ اُن کی ممتا ٹھنڈی رہے بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

1989 کا سال پوری توانائی سے یاد آ گیا تھا۔ سن میں کوئی ابہام نہیں محسوس ہوا۔ شاید اس سے ایک اہم ذاتی کام جڑا ہوا تھا کہ 1989 میں ہی ایک بڑا پروجیکٹ ایک ماڈل ادارے کی صورت قائم کرنے جا رہی تھی اور دن رات اس میں غرق تھی کہ جب یہ

حادثہ ہوا۔

میرے میاں کو ٹی وی کے ساتھ جڑے رہنے کا خبط ہے۔قومی ٹی وی کے ساتھ بی بی سی اور سی این این دونوں چینل گھر میں دیکھے جاتے تھے۔بندہ کتنا بھی مصروف کیوں نہ ہو آتے جاتے، چلتے پھرتے اہم خبریں بھاگتے دوڑتے قدموں کو روک ہی لیتی تھیں۔

سکرین پر یہی وسیع وعریض سکوائر تھا۔نام بھی کچھ ایسا ہی تھا۔بچوں کا ایک سیل رواں تھا جو سکوائر میں دکھتا تھا۔کبھی کبھی کلوزاپ سین چلتے تو بڑی بھولی بھالی صورتیں دکھائی دے جاتیں۔اس وقت میرے تینوں بچے بس احتجاجی بچوں کی عمروں جیسے ہی تھے۔معصوم سے چہرے والی میری بیٹی جیسی لڑکیاں ، بڑے بیٹے اور چھوٹے جیسی صورتوں والے لڑکے۔ادھر ادھر گھومتے پھرتے، باتیں کرتے، زندگی سے بھری توانائی والے بچے۔کبھی کبھی خود سے کہتی۔

''بھلا یہ بچوں کی بات کیوں نہیں سُنتے؟بچوں نے ماں سے ہی مانگنا ہوتا ہے۔ریاست بھی تو ماں ہی ہوتی ہے۔''

تب ہمارے گھر میں اخبارات کا مطالعہ بھی کھانے پینے کی طرح ہی اہم ہوتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ ادارتی صفحات کے دانشور لکھاریوں،خبروں سے مسلسل رابطوں، ہمہ وقت دنیا کے ٹی وی چینلوں سے چمٹے رہنے اور حالات حاضرہ پر دس لوگوں کی رائے اور تبصرے سن سن کر بندہ صورت حال کو اس کے صحیح تناظر میں کسی حد تک جان تو لیتا ہی ہے۔شاید اسی لیے ایک دن میرے میاں نرم سے لہجے میں بولے تھے۔

''دراصل نوجوان طبقہ ملک کی کیمونسٹ پارٹی کی کرپشن سے نالاں ہوا پڑا ہے۔ملک کی معیشت کا بیڑہ غرق ہے۔ملک میں حد درجہ غربت اور شہروں میں رہنے والوں کی زندگی اجیرن ہو چکی ہے۔

وہ رُکے۔ کچھ سوچتے رہے اور پھر بات کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے بولے۔

''نوجوان نسل آزادی اظہار اور جمہوریت کی متمنی ہے۔ مغربی دنیا سے متاثر ہے۔ دنیا جن تبدیلیوں سے دوچار ہو چکی تھی اور ہو رہی ہے وہ سوچوں کو ایک نئی فکر سے ہم آہنگ کر رہا ہے۔ دیوار برلن گرنے کی تیاریوں میں ہے۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک معاشی اور اقتصادی میدانوں میں سویت یونین کا گلا گھونٹنے اور اُسے پارہ پارہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ یوں بھی چینی طلبہ چین کی سیاسی زندگی میں ہمیشہ سے فعال رہے ہیں۔ چین مغربی سرمایہ کاروں پر اپنے بند دروازے کھول رہا ہے۔ اِس اوپن ڈور پالیسی کا وہی نتیجہ نکلنا تھا جو نکلا ہے کہ آنے والے اپنا کلچر، اپنی آزاد فکر، اپنے جمہوری انداز لے کر آئے۔ نئی نسل نے متاثر تو ہونا ہی تھا۔

حقیقتاً حکومت بھی بدنیت نہیں اور طلبہ بھی بہت پرامن ہیں۔ انہوں نے کسی بھی طرح کی کوئی توڑ پھوڑ اور غلط حرکت نہیں کی۔ مگر گورباچوف چین آرہا ہے۔ ایک طویل عرصے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری کی امید پیدا ہوئی ہے۔ کچھ استقبالیہ تقریبات نے سکوائر میں بھی ہونا ہے اور وہاں طلبہ کا قبضہ ہے۔''

اب ہوا یہ تھا کہ بچے تو پُرامن ہی تھے۔ مگر پورا ملک اس کی لپیٹ میں تھا کہ ہر روز سینکڑوں طلبہ ملک بھر سے آکر اس میں شامل ہو رہے تھے۔

چاؤزے یانگ Zhao-Ziyand کی دلی ہمدردیاں تو بچوں کے ساتھ تھیں۔ مگر ڈینگ پنگ Dang xia Ping ذرا سی بھی مزید رعایت دینے کے حق میں نہیں تھے۔

اور پھر دنیا نے دیکھا۔ نہ بچوں نے ہار مانی اور نہ بڑوں نے عقل کی کہ اُن معصوموں کو تو آنسو گیس اور واٹر کینن سے ہی بکھیرا جا سکتا تھا۔ بس ٹینک چڑھ دوڑے اور

اور زمین سُرخ ہوئی اور ہزاروں میل دور بیٹھی میرے جیسی ایک اجنبی عورت جو ماں تھی زار زار روئی۔

پر اِن جھوٹے اور مکّار انسانی حقوق کے علمبردار امریکہ اور اس کے حواری مغرب کو تو چین پر چڑھ دوڑنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ جو اسے مل گیا تھا۔اور ابھی تک وہ اسی غم میں مبتلا ہے۔کوئی پوچھے خود اپنا کردار کیا ہے؟ عراق،شام کے بچوں اور اپنے ملک کے کالوں اور مقامی لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تاریخ کی بدترین مثال ہے۔اس کا وہ بغل بچہ اسرائیل فلسطینی لوگوں پر ستم کے جو پہاڑ توڑ رہا ہے اس پر بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔اور اب افغانستان کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ قدرتی معدنیات سے مالا مال ملک جو جیوسٹریٹیجک Jeostrategic اور جیو پولیٹیکل اہمیت کا حامل ہے کا حشر نشر کردیا ہے۔طالبان،القاعدہ اور داعش جیسی دہشت گرد تنظیموں کا خالق ہے مگر کہیں افسوس اور معذرت کا لفظ نہیں۔

اور پھر یہ میرا فیصلہ تھا کہ مجھے تھین آن من سکوائر کے لئیے دوبارہ جانا ہے۔اور اکیلے جانا ہے۔کچھ وقت وہاں گزارنا ہے۔چینی بچوں کے لیے دعائے خیر کرنی ہے کہ اُن کی سرخی نے چین کو حیاتِ نو دی ہے۔

☆☆☆

باب نمبر:۸ چینی پاکستانی کلچر کی مشترکہ روایات ورسومات

- اردو کے چینی طالب علم اور اِس زبان سے جڑے دیگر چینی اپنے نام کے ساتھ اردو نام بھی لگاتے ہیں۔
- چین شادی کے حوالے سے مردوں کے لیے بہت مہنگا ہے۔
- عروسی لباس بالعموم سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔

اُس صبح فضا میں بہت خنکی تھی۔کبھی کبھی سردیوں کی صبحوں میں بھی ایک اداسی سی گھلی نظر آتی ہے۔وہ صبح بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ہواؤں میں سراٹے مارتے تیز بلّھوں کی آمیزش تھی۔میں عقبی جانب کے ٹیرس پر آئی۔دھوپ بے چاری تو بے حد گھبرائی اور سراسمیگی کی سی حالت میں دِکھتی تھی۔جیسے کہتی ہو۔

''بھلا میں کیا کروں۔یہ اتنے ظالم سرکش گھوڑوں کی طرح بھاگتے جھونکے بھلا میری کہیں سُنتے ہیں۔تھوڑا سا ہی کہیں ٹکنے دیں تو میں کچھ سکھ پہنچاؤں۔''

میں کچن میں آ گئی۔ہماری نسرین ہنڈیا پکانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ٹوکری میں بینگن پڑے تھے۔یا اللہ اتنے بڑے۔میری حیرت کو بیٹی نے دور کیا۔یہاں ہر چیز کا یہی حال ہے۔مسلسل تحقیق اور تجربات نے خوشبو اور ذائقوں کا کچومر تو ضرور نکال دیا ہے مگر داد دینی پڑتی ہے انہیں کہ اپنے لوگوں کی ضروریات احسن طریقے سے پوری کر رہے ہیں۔ہماری طرح نہیں کہ زرعی ملک ہونے کے باوجود کبھی چینی درآمد کر رہے ہیں اور کبھی گندم۔

نسرین نے چائے دم کرتے ہوئے ناشتے میں نٹز Nuts لینے کا پوچھا۔تبھی سعدیہ نے موبائل پر عمران کی کال ریسیو کرتے ہوئے مجھے کہا تھا۔

''آپ کا وقت دس بجے ہے۔جلدی تیار ہو جائیں۔''

''ارے ابھی تو ڈیڑھ گھنٹہ پڑا ہے۔ہاں سنو اب یہ مت کہنا کہ چینی وقت کی پابند قوم ہے۔ تمہارے باپ سے میں نے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو مگر پابندی وقت کی یہ عادت تو جی جان سے اپنائی ہے۔اِس ضمن میں لعن طعن سہی بھی ہے اور کی بھی ہے۔کسی بیاہ شادی کی تقریب میں تمہارے باپ کے غل غپاڑے پر جائے مقام پر پہنچنا اور وہاں بیروں کی آنیاں جانیاں دیکھنا اور پھر تمہارے باپ پر چلّا چلی کرنا لو ابھی جھاڑو لگانا باقی ہے وہ لگاؤ تم میں تو چلتی ہوں جیسی مکالماتی لڑائی بھی زندگی کا حصّہ رہی۔

محبت سے بھری پری بیٹی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔تب ہم نے بہت سے واقعات یاد کیئے جب ایسی صورت پیش آتی تھی۔ماضی کی یادوں میں فقط چند ہی لمحے رہنے کے فوراً بعد وہ باہر آ گئی اور بولی۔

''دراصل Foreign Languages University پرانے بیجنگ کی جنوبی سمت بہت دور ہے۔اور رش کا جو حال ہے وہ آپ دیکھ ہی چکی ہیں۔''

نسرین کو میرے پسندیدہ مگ میں قہوہ انڈیلتے دیکھ کر میں نے اپنی جیالی ہم سفر سے کہا۔''لو بھئی آج میں تمہاری ہم نام چینی پروفیسر سے ملنے جارہی ہوں۔'' نسرین اور شبانہ دونوں چینی خواتین سے ملاقات کا دلچسپ احوال بیٹی نے گذشتہ رات مزے لے کر سُنایا تھا۔چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ اس نے بھی ہنسی ہونٹوں پر بکھیر دی تھی۔

پاکستانی سفارت خانے میں کسی تقریب کا اہتمام تھا۔اردو ڈپارٹمنٹ کی یہ دونوں خواتین مدعو تھیں۔تقریب 23 مارچ کے حوالے سے غیر معمولی دلچسپی کی حامل تھی۔مختلف شہروں سے پاکستانی بھی شرکت کے لیئے آئے ہوئے تھے۔نسرین اس وقت دھان پان سی خوبصورت، دل کش سی لڑکی تھی۔نئی نئی شادی ہوئی تھی۔پاکستان کا چکر لگا چکی تھی۔پاکستانی

چمکتے دمکتے لباس میں ملبوس تتلی کی طرح نظر آتی تھی۔ پاکستانی خواتین فقرے بازی میں تو خیر سے بڑی تیز طرار ہوتی ہیں۔ ایسے میں کسی من چلی نے کہا۔ ''لو بھئی اِس سینک سلائی کو تو دیکھو۔''

اس کے تو کہیں گمان میں بھی نہ ہوگا کہ جسے نشانہ بنا رہی ہے وہ اردو جانتی ہے۔ اور جب اِس خوبصورت لڑکی نے اردو میں اظہارِ خیال کیا تو بس اندازہ لگالیں کہ خواتین کی شرمساری کس درجہ کی ہوگی۔ فاصلوں کا پھیلاؤ وہی اپنے شہر جیسا ہی تھا۔ بس فرق اگر تھا تو صرف نظم وضبط اور قاعدے کلیے کا۔ بیس میل اِدھر اُدھر معمولی بات تھی۔ اب گاڑی پارکنگ ہی مسئلہ بن گئی۔ اور نٹیل کالج لاہور کے گردونواح والے منظر کی یاد آئی۔ مگر دل نے فوراً کہا۔ ''نہیں بھئی یہاں صورت زیادہ مخدوش ہے۔'' پارکنگ کے لیے جو خجل خواری ہوئی اس نے کشور کے اس درد بھرے گیت کی یاد دلائی تھی۔

''میرے محبوب آج رسوا تیری گلیوں میں محبت ہوگی۔''

چلو خدا کا احسان عظیم کہ میری چینی محبت بہت زیادہ رسوا ہونے سے بچ گئی۔ ایک نفیس سے انسان نے بہت اندر جاتی ایک گلی میں رہنمائی کرتے ہوئے پارکنگ کروائی تو شکر کا کلمہ کوئی دس بار کہا ہوگا۔ ہر گلی تو دورویہ گاڑیوں سے چھلکی پڑی تھی۔ یونیورسٹی خوبصورت تھی۔ پرانے اور نئے، قدیم اور جدید رنگوں کے حسن سے سجی۔ ارغوانی رنگی چھوٹی اینٹوں والے مستطیل صورت دروازے سے بھلا بندہ یونیورسٹی میں داخل ہو۔ اور بے شک وقت نے پیری کی چادر بھی اوڑھا دی ہو۔ جوانی نے تو پھر بھی یاد آنا ہی آنا ہے۔ اب چاہے درسگاہ کوئی غیر ملکی ہو یا مدتوں بعد اپنی ہی کسی جامعے میں جانے کا اتفاق ہو۔ داخلے کے ساتھ والے منظر مانوس سے تھے۔

بہت بڑے بڑے کھیل کے میدان میرے سامنے نہیں تھے۔ صرف مناسب سی

کشادگی والا بس ایک ہی تھا جہاں طلبہ کھیل رہے تھے اور جس کے کونے پر ایک بڑھئی اپنا اڈہ لگائے لکڑی کا کچھ کام کر رہا تھا۔ دائیں بائیں مڑتے بل کھاتے برآمدے اور راہداریاں تھیں۔ عمران نے نسرین سے رابطہ کیا۔ اس نے کہا آگے آجائیں ہمارے طلبہ آپ کو لے جانے کے لیے کھڑے ہوں گے۔

بیگم اختر ریاض الدین یاد آئی تھیں۔ ہوائی یونیورسٹی میں آدھی رات کو ان کا نازل ہونا اور طلبہ کا ہاروں کے ساتھ استقبال کرنا۔ اب خواہ مخواہ ہی دل میں خیال آیا تھا کیا یہاں بھی کوئی ایسا ہی سین ہوگا۔ پھر دماغ نے پھٹکارہ ''یہ تم پٹڑی سے اتنی جلدی کا ہے کو اتر جاتی ہو۔ اوقات یاد رکھا کرو نا۔''

دائیں بائیں مڑتے جا رہے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور جیسے منظر تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کھل رہے تھے۔ ایک نوعمر لڑکے نے عمر کہہ کر اپنا تعارف کروایا۔ عمر اور چینی لڑکا۔ فوراً سنکیانگ کی طرف دماغ گیا۔ لڑکے نے خود کو بی اے پارٹ ون کا سٹوڈنٹ بتایا۔

اس عظیم الشان عمارت کے ایک چھوٹے سے ڈیپارٹمنٹ کی تنگ سی راہداریوں میں اسلامی ناموں والی چینی لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ چلتے ہوئے اپنایت والی خوشبو سی محسوس ہوئی تھی۔ شبنم، شبانہ، عمر، عثمان۔ اس معمّے کو سب سے پہلے حل کیا کہ یہ مضطرب کر رہا تھا۔ لیجیئے عقدہ کھل گیا کہ اردو پڑھنے والے چینی طلبہ اور اردو زبان سے جڑے دیگر لوگ ادب کے اِن ناموں سے جب بہت متاثر ہوتے ہیں تو اپنے نام کے ساتھ ایک اضافی نام کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ ڈیپارٹمنٹ میں اُس ماحول کو پیدا کرنے کی یہ ایک مخلصانہ سی کاوش ہے۔ سچی بات ہے اِس جذبے نے سرشار کر دیا تھا۔ اب نسرین کا چینی نام ZhouYuan، شبنم Yuan Yechang ہے۔ یہاں شمیم ہے۔ زاہدہ ہے۔ قاسم ہے۔

نسرین ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ تھی۔اس کا کمرہ بے حد چھوٹا سا تھا۔ مجھے اپنے پروفیسروں کے کمرے یاد آئے تھے۔ ہیڈ کی تو بات ہی چھوڑ یئے۔نسرین پاکستان کا دوبار چکر لگا چکی ہےاور یقیناًاس نے وہاں بہت کچھ دیکھا ہوگا۔

حمید شاہد،رشیدامجد،محبوب ظفر،نیلوفراقبال،کشور ناہید،افتخار عارف مسعودمفتی لوگوں سے مل چکی ہے۔نیلوفر کی بہت مدّاح تھی۔اس کی شاندار میزبانی سے محظوظ ہوچکی تھی۔قہوے کا دور چلا۔ڈپارٹمنٹ دیکھا۔ایم اے کے پہلے سال میں ابھی صرف بارہ طلبہ ہی تھے۔اِن کی گلابی اردو سے محظوظ ہوئے۔سبھوں کو پاکستان جانے،اردو پڑھنے اور بولنے سے خاصی دلچسپی تھی۔میرے اِس سوال پر کہ انہوں نے اردو کا انتخاب کیوں کیا؟ جواب مسرورکن تھا۔''ہمارے گہرے دوست ملک کی یہ زبان ہے۔ہمارا خیال ہے ہمارے لیےنوکریاں ملنے کے زیادہ چانس ہیں۔''

اب میں کیا کہتی؟خفیف سی ہنسی ہونٹوں پرضرور بکھری۔ میں بولوں کہ نہ بولوں جیسی کشمکش نے اُدھم مچادیا۔جل کراندر نے کہا۔''جاکمبخت تجھے اگر پردہ رکھنانہیں منظور۔تو کھول دے سارے پول۔پھوڑ دے اپنے سارے بھانڈے۔کھل کر بتا انہیں کہ ہم تو احساسِ کمتری کی ماری قوم ہیں۔''

چلونوکریوں کا مسئلہ تو رہا ایک طرف۔ ہمارے تو سماجی رویے بھی نرے غلامانہ ہیں۔رشتہ کرنا ہے۔لڑکی یالڑکا اردو میں ایم اے ہے۔گھر کا ان پڑھ سربراہ بھی ناک چڑھا کر کہے گا۔اے ہے نرے نالائق۔ان کا مستقبل کیا ہے؟ دفع دورکرو۔ہمیں نہیں کرنا یہ رشتہ۔مادری زبان یعنی پنجابی سندھی وغیرہ کا پتہ چل جائے تو جان جایئے نالائقی کا ٹھپہ سج گیا بچے بچی کے ماتھے پر۔ہاں انگریزی ذہانت اور قابلیت کی پکی پکی سند ہے۔

تو میرے بچوتمہاری محبت کی میں احسان مند۔تم چینی ہوتمہاری حکومت تمہارے

لیئے فکرمند۔ سمجھو تمہاری نوکری تو پکی۔ اردو لائبریری دکھانے کی خواہش میری تھی کہ چاہتی تھی دیکھوں تو سہی کون کون سے مصنف یہاں موجود ہیں۔ تین منزلہ لائبریری کی وسعتیں اور جدتیں دونوں نے حیران کر دیا تھا۔ تیسری منزل پر اردو کا ایک حصّہ تھا۔ اب ریکوں میں عجیب وغریب سے نام براجمان تھے۔ میری نالائقی کہہ لیں۔ میں تو ناواقف تھی سب سے۔ ہاں مرزا حامد بیگ کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مستنصر کیوں نہیں ہے یہاں؟ چلو شکر حمید شاہد اور ڈاکٹر رشید امجد سوغات کے طور پر نظر آئے۔

جب نیچے آئے ایک روکھے پھیکے قطعے سے آگے ایک بڑی انوکھی وضع کی عمارت نے متوجہ کیا۔ پتہ چلا یہ متحدہ عرب امارات کا تحفہ ہے۔ مشرقی زبانوں کی عظیم الشان لائبریری ہے یہاں۔ اِسے دیکھا۔ دکھ بھی ہوا کاش ایسا کوئی تحفہ ہمیں بھی عنایت ہوتا۔ دل نے کہا۔

''اری او احمق دینے والے بھی تو یہ دیکھتے ہیں کہ لینے والے قدر شناس بھی ہیں یا بس ایسے ہی دو نمبر یئے ہیں۔'' ہم تینوں اب اس ویران سے میدان میں آکر بیٹھ گئیں جہاں خشک اور بے ترتیب سی گھاس کے قطعوں میں بینچ دھرے تھے۔ دھوپ نے سوتیلی ماں جیسی سردمہری کا چولہ جسے میرے سر پر کے انگ انگ نے صبح محسوس کیا تھا اتار کر سگی اور چاہنے والی ماں کی ممتا جیسا نگھا دوشالہ اوڑھ لیا تھا۔

ایک اجنبی ماحول علم کی خوشبو میں بسا ہوا چہار سمت مہک رہا تھا۔ ایسے میں دونوں خواتین سے گفتگو کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں کچھ چینی کلچر و ثقافت سے شناسائی کا تھا کچھ ذہن میں چبھتے ہوئے سوالات بارے بھی تھا کہ ملک میں گذشتہ کچھ ماہ سے چینی لڑکوں کی پاکستانی لڑکیوں سے شادی اور پھر اِن لڑکیوں کو چین لے جا کر بیچنے والا شور شرابا تھا۔ اب پڑھی لکھی مقامی خواتین میسر آئیں تو پوچھ بیٹھی کہ بھئی یہ کیا سلسلہ ہے؟

شبنم ہنسی۔میرا تو اپنا ایک عزیز پاکستانی دلہن بیاہ کر لایا ہے۔بہت خوش ہے۔مزے میں ہیں دونوں۔

نسرین نے کھل کر پس منظر کی وضاحت کی۔دراصل چین شادی کے حوالے سے مردوں کے لیے بہت زیادہ مہنگا ہے۔ظاہر ہے جب عورتیں مردوں کی نسبت کم ہوں گی تو عورت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔2012-13 کے سروے کے مطابق 30 سے 39 برس کے کنوارے مرد 11959000 ہیں جبکہ 28 سے 32 سال کی غیر شادہ شدہ عورتیں صرف 5820000 ہیں۔گویا کم وبیش کوئی نصف سے بھی زیادہ کا فرق تو ہے۔

عمر اور عثمان کینٹین سے ڈسپوزیبل گلاسوں میں کافی لے آئے تھے۔انتہائی رغبت اور مسرت سے میں نے گلاسوں کو دیکھا اور سوچا۔’’خدا کیسا پیارا ہے۔دل میں جھانک کر جان لیتا ہے کہ اس کا بندہ اس وقت کِس چیز کا طلب گار ہے؟‘‘نسرین نے چھوٹا ساسپ لیا اور میرے اوپر چینی ثقافت وتہذیب کے دلکش پہلو کھولے۔

چینی قوم کی صدیوں پرانی تاریخ،اس کے شادی کے مکتب سے جڑنے کی گواہ ہے۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ وقت کے چلتے ہوئے پہیوں میں روایات کی تغیر پذیری کا عمل بھی ساتھ ساتھ جاری وساری رہا۔تاہم کچھ خاص قسم کی روایات کل بھی اس سماج کا حصّہ تھیں اور آج بھی ہیں۔پرانے وقتوں میں پہلی دلچسپ رسم تو چولے کے گرد گھومتی ہے۔گو شہروں میں اب صورت حال خاصی مختلف ہے۔انٹرنیٹ،میرج بیورٹائپ کے لوگ اِس میدان میں کودے ہوئے ہیں۔لومیرج کا بھی خاصا رجحان ہے۔تاہم دورافتادہ جگہوں پر پرانے طورطریقے تھوڑے سے جدّت کے تڑکوں سے ابھی بھی رائج ہیں۔

واہ نسرین یہ تو میں پاکستانی شادی نامہ سُن رہی ہوں۔بھئی اتنے گوڑے اور پیار کرنے والے ہمسائے ہیں۔کلچر میں بہت سی چیزیں مشترکہ تو ہوں گی۔

دونوں لڑکیاں خوبصورت ہی نہیں ذہین بھی تھیں۔دل میں اُتر جانے والی بات کرنا جانتی تھیں۔ہاں اور سُنیے ۔نسرین مسکرائی ہندوستانی شادی کی طرح جنم پتری کے ساتھ ستارے کیا کہتے ہیں؟ فریقین کے لیئے جاننا بے حد ضروری ہے۔دونوں کے ستارے ٹکرا تو نہیں رہے۔ہم آہنگی کا اشارہ مل رہا ہے یا نہیں۔یہ سب اہم ہیں۔اگلا مرحلہ اس کے بعد کا ہی ہے۔حتمی فیصلہ تو لڑکی والے ہی کرتے ہیں۔منگنی کی رسم پر لڑکی کی قیمت اور لڑکی والوں کے لیے تحائف اہم ہیں۔دلہن کی قیمت کی ادائیگی تو اسی وقت ہو جاتی ہے۔ تحائف کِس نوعیت کے ہوں؟اکثر و بیشتر تو اپنی حیثیت کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔مثلاً پھل، چائے، ناریل، مٹھائی،نفیس قسم کے کھانے اور اب اِن میں پرفیوم اور ڈیکوریشن کی چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔

''اُف نسرین اضطراری سی کیفیت میں گفتگو کاٹتے ہوئے میں بے اختیار ہی بول پڑی تھی۔شکر کرو یہ تحائف پھلوں اور بسکٹ کیکوں تک ہی محدود ہیں۔ہمارے ہاں تو صورت خاصی گھمبیر ہے۔''زوردار قہقہ گونجا تھا۔''فکر نہ کریں تبدیلی کی ہواؤں میں اب یہاں بھی بڑی تیزی آ رہی ہے۔منگنی کی رسم دھوم دھڑ کے سے منائی جانے لگی ہے۔''

پر اب دھوم دھڑ کے پر جو خرچ ہوتا ہے اور فضولیات کا جو طوفان ہماری زندگیوں میں داخل ہو رہا ہے۔اُن کا بوجھ بھی لڑکے والوں پر ہی پڑتا ہے اور ہاں اب شہری علاقوں میں تو ماشاءاللہ سے اپارٹمنٹ بھی مطالبات میں شامل ہو گیا ہے۔کار بھی ضروری ہے۔سچی بات ہے بسا اوقات تو لڑکے کے خاندان والے ایسے مقروض ہوتے ہیں کہ مدتوں بیچاروں کو استواری نہیں آتی۔

ماشاءاللہ سے یوں بھی اب چین میں لوگوں کے پاس بڑا پیسہ آ گیا ہے۔اُن میں اِس کے اظہار کی خواہش بھی زوروں پر رہتی ہے۔وہ اپنی دولت کا شواف کر کے سوسائٹی میں

اپنی واہ واہ بھی طمطراق سے کرواتے ہیں۔

سچی بات ہے لطف آ رہا تھا یونہی جیسے اپنے ہی ماحول اور اپنی ہی سوسائٹی لعن طعن کی نوک پر ہو۔ اور یقیناً یہ تصویر تو اپنی ہی تھی۔ بس کچھ حصّوں میں کردار ایک جیسے تھے اور کچھ میں اُلٹ۔ سارا پنجاب بیٹی بھی دو اور گھر بھی خالی کرو جیسے کردار کا عکاس ہی تو ہے۔ جب کہ خیبر پختونخوا میں معاملہ چین جیسا ہے۔

شبنم نے ان میں کچھ مزید اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔

اب برائیڈ پرائسس میں گھر کار اور پیسے سب شامل ہوگئے ہیں۔ سچی بات ہے 52% فی صد چینی عورتیں گھر کو شادی کا اہم عنصر خیال کرتی ہیں۔ بیجنگ میں گھر کی اوسط قیمت آپ شاید جانتی نہ ہوں۔ تقریباً کوئی 37 اور چالیس ہزار RMB فی مربع میٹر کے درمیان ہوتی ہے۔ اب ایک مرد اور خاندان کی مشکلات کا اندازہ لگالیں اگر وہ نچلے، متوسط اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

خالی گلاس دور ڈسٹ بن میں پھینکنے کے لیے اٹھتے ہوئے شبنم نے کہا۔

ہاں اس کا ایک اچھا پہلو یہ ضرور ہے کہ نئے جوڑے کو نئی زندگی کی شروعات میں مدد مل جاتی ہے مگر انسانی فطرت کی کمینگیاں اور گھٹیا پن بھی ظاہر ہوجاتے ہیں۔ چین کے بعض ترقی پذیر علاقوں میں لڑکی کے خاندان والے اِس رقم کو اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور اس سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ارے بھئی نسرین و شبنم یہ تو سارے گھر سے گھر تک کے منظر میں نے دیکھے ہیں۔ اب ذرا بیاہ کا احوال بھی سُنا دو۔

چین میں سول آفئیر بیورو سے شادی کا قانونی نکاح نامہ حاصل کرنا بہت اہم ہے۔ یہ سرخ رنگ کے بروشر ٹائپ کاغذات ہوتے ہیں۔ رجسٹریشن کے بعد ہی شادی کی

اگلی تقاریب کا انعقاد ہوتا ہے۔

شادی کا جوڑا بالعموم سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ ویسے آج کل مغرب کی نقالی میں سفید کا رواج ہو گیا ہے۔ تاہم روایتی پسندیدگی سُرخ رنگ کے حق میں جاتی ہے کہ چینی اِسے خیر و برکت کا رنگ سمجھتے ہیں۔ یہ منظر بھی ہو بہو اپنا ہی ہے۔ ہاں بس نقطہ نظر میں ضرور فرق ہے۔ ہمارے ہاں تو اس رنگ کو سیکس کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ وحشت اور درندگی کی صف میں بھی کھڑا کر دیتے ہیں۔ ویسے آپس کی بات ہے پاکستان میں اکثر سرخ جوڑے پہننے والیوں کے ساتھ بہت سے درندگی والا کھیل ہی کھیلتے ہیں۔ شادی کارڈوں، دلہن کے تحائف ،عروسی کمرے کی زیبائشی چیزوں مثلاً کشن، دیواروں پر سجی تصاویر، ڈریگن Dragon اور فینکس Phoenix کینڈل سجانا بھی ضروری ہے۔

شادی ہال میں پہلے زمین اور جنت کو خراج تحسین پیش کرنا ضروری۔ پھر دولہا کے والدین کو تعظیم دینا کہ انہوں نے بیٹا جنا اور اس کی پرورش کی۔ تیسرا دولہا دلہن کا ایک دوسرے کو کہ وہ ہمیشہ کے لیے ایک محبت بھرا رشتہ قائم کرنے جا رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ کامیاب ہوں گے۔

تقریباً ڈھائی گھنٹے کی اِس نشست سے اگرچہ لطف اندوزی تو تھی ہی مگر اس پائے کی ہرگز نہ تھی کہ جہاں حیرتوں کا جہاں وا ہوتا ہے۔ تھوڑی بہت ماڑی موٹی جمع تفریق کے علاوہ سب کچھ تو اپنا اپنا تھا۔ اتنا فرق تو اپنے شہروں کے سو دو سو میل کے فاصلوں پر بھی ہوتا ہے۔

چینی بارات کا کرّوفر اور آج کل چینی برینڈڈ گاڑیوں کے سڑکوں پر تیرتے فلیوٹ کے ساتھ جانا پسند کرتے ہیں۔ یہ نمائش دونوں کا شملہ اُونچا کرتی ہے۔ ہاں البتہ باراتیوں اور مہمانوں کو تحفوں سے نوازنا بہت اچھا لگا۔ اِس رسم کو اگر پاکستانی اپنائیں تو سچی

بات ہے نیوتا ڈالنے والوں کے دلوں سے دعائیں نکلیں گی۔دوسرے چینیوں کی اِس اچھی عادت کوبھی اپنانے کی ضرورت ہے کہ سرخ کاپی پر نیوتے کی جو رقم تحفے کی تفصیل کی صورت نوٹ کی جاتی ہے۔پاکستانی اتنی بھلکڑ قوم ہے کہ اپنے ساتھ ہر سیاسی ستم کو بھول جاتی ہے۔نیوتے کے معاملے میں بھی ڈنڈی مارنے کی عادی ہے۔دینے والے کوتو یاد ہوتا ہے۔لینے والا بھول جاتا ہے۔سند ہونی چاہیے۔بسا آوقات جب تو تکار کی نوبت آ جائے اور فریقین الزام تراشی پر اتر آئیں تو کاپی کھول کر انہیں آئینہ دکھا دیا جائے۔اس سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔باقی حجلہ عروسی کی سجاوٹ بھی بس ایک جیسی ہی ہے۔ماں کے گھر دوسرے تیسرے دن واپسی یا ہنی مون والا معاملہ بھی ٹھیک ہے۔

اور باقی سب خیر خیریت۔کچھ عرصہ بعد لڑائی جھگڑے یا طلاق وغیرہ بھی کومن چیزیں۔

پاک چین دوستی زندہ باد کہ شادی جیسے اہم معاملات میں نا قابلِ یقین ہم آہنگی بھی موجود ہے۔

☆☆☆

باب نمبر:۹ مادام عمران خان کیا پیسے مانگنے آیا ہے؟

- میرے ڈرائیور کا یہ سوال کیا مجھے میری اوقات یاددلانے کی معصومانہ یا عیارانہ کوشش تھی۔
- بیجنگ کے پاکستانی سفارت خانہ جس کے رقبے کی وسعت اوراہمیت پرلالچی حکمرانوں کی رالیں ٹپکیں۔
- اس جیالی قوم کا موسم بہارقمری کیلنڈرسے جڑا ہوا ہے۔

میری اور بہار کی آمد چین میں کم وبیش بس ساتھ ساتھ ہی ہوئی تھی۔اِس جیالی قوم کی بہاراوراس سے جڑا جشن بہار ہم پاکستانیوں کی عیدالفطر کی طرح قمری شمسی کیلنڈر سے جڑا ہوتا ہے۔اپریل کا آغاز جب ابھی گھاس نے ہرا کچور چولا اورٹنڈ منڈ درختوں نے سفید اور گلابی پھولوں کا پیرھن پہنا ہی تھا۔تاہم ابھی سرخ اور نیلے پیلے پھولوں کی چادریں نہیں بچھی تھیں۔

سچی بات ہے میری تو یادوں میں ماسکو میں ملنے والی اُس ہندوستانی خاتون کے لفظوں کی گونج ابھی بھی باقی ہے کہ جس نے آنکھوں اور ہاتھوں کی تمثیلی حرکات سے کہا تھا۔ ''باپ رے باپ چین میں تو ہرسو پھولوں کی چادریں ہی چادریں تاحدنظر دکھائی دیتی ہیں۔اس میں یقیناً سوفی صد سچائی ہوگی۔بس میں نے ذرا آنے میں ست ماہے بچے کی طرح پھرتی دکھا دی تھی۔لیکن عظیم چینی شاعر وانگ انشی Wang Anshi بہار سے متعلق اپنے جن جذبات کا اظہار کرتا ہے اس کا بھی ایک اپنا رنگ ہے۔

بادبہار میں جتنا حسن ہے

اتنا ہی کوجہ پن بھی ہے
یہ پھولوں کو کھلاتی ضرور ہے
مگر انہیں اڑا کر بھی لے جاتی ہے

روایتی چینی لونی سولر کیلنڈر کا سائیکل بارہ سال پر محیط ہوتا ہے۔اہم چینی تہوار جیسے چینی نیا سال، لالٹین تہوار وغیرہ اسی قمری حساب کتاب سے ہی جڑے ہیں۔ان کے نام بھی جانوروں کے ناموں پر ہی ہوتے ہیں۔

ہفتے کی صبح جب گھر ابھی سوتا تھا۔میں چپکے سے باہر آگئی تھی۔ایک فرلانگ کے فاصلے پر بڑا خوبصورت ایک پارک تھا۔ نام جس کا ریتان Ritan تھا۔شام کی دلکش مگر قدرے بے نام سی اداسی گھلی گھڑیوں میں اُسے دیکھا تھا۔مگر صبح کی پرنور ساعتوں میں دیکھنے کی متمنی تھی۔

فضا میں آوائل فروری جیسی خنکی تھی مگر پارک میں چھل پہل تھی۔آج کے ٹیڈی لڑکوں کی قامت جیسے بوٹوں پر سفید، گلابی، سرخ اور سفید پھول کھلے ہوئے کتنے دلکش لگ رہے تھے۔میرے سامنے جھیل تھی۔سبزی مائل پانی بے شک شفاف نہیں تھا مگر اُسے ہر رنگ اور ہر انداز میں حسین بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔خودساختہ پہاڑی سلسلوں کو بھی میں چلتے چلتے دیکھتی تھی۔

میرا جی بینچ پر بیٹھ جانے کو چاہا تھا۔یقیناً میرے اندر ان خوبصورت منظروں کو آنکھوں کی راہ سے پی جانے کی ہڑک اٹھی تھی۔ابھی رات میں نے قدیم چینی شاعری کی مختلف ادوار کو کنگالا تھا۔تھانگ Tang خاندان نے شاعری کی جس طرح سرپرستی کی اس نے ایسے قابل فخر شاعر پیدا کیے۔منگ خورن Ming Haoran، ڈوفو Du Fu، لی بائی Li Bai، وانگ وی Wang Wei سب ایک سے ایک بڑھ کر تھے۔بے مثال

شاعر جنہوں نے چینی شاعری کو امیر ترین کیا اور ادب کے حوالے سے تانگ خاندان تاریخ میں سنہری دور کہلایا۔

منگ خورن کی دو نظمیں دیکھیے ۔

آڑو کا درخت کتنا سرخ ہو گیا ہے
اس کے پھول بے مثال ہیں
چلو کنواری دوشیزہ کی شادی ہونے جا رہی ہے
یہ وقت اور سایہ دار جگہ
شادی کے لیے بہت موزوں ہیں
بہار کی اِس صبح میں ابھی بستر میں ہوں
جاگنا نہیں چاہتا جب تک کہ
پرندوں کی چہچاہٹ نہ سنائی دے
رات بھر تیز ہواؤں اور بارش کی یلغار رہی
سوچتا ہوں کتنے خوبصورت پھول گرے ہوں گے

زمانہ گو صدیوں پرانا تھا۔مگر انسانی جذبات و احساسات تو آج جیسے ہی ہیں۔میں بھی اِن پھولوں کو دیکھتے ہوئے شاعری کو موبائل پر پڑھتے ہوئے مسرور سی تھی۔

اب ذرا ڈوفو کو پڑھیئے ۔

اچھی بارشوں کو موزوں وقت پر اپنی آمد کا پتہ ہوتا ہے
یہ برسیں گی تب جب بہار آتی ہے
ہوا کے ساتھ کبھی یہ دبے پاؤں آ کر
ہر شے کو خاموشی سے نمی سے بھر دیتی ہے

ملک ٹوٹا ہے، لیکن پہاڑ اور ندیاں باقی ہیں

شہر بہار میں داخل ہوتا ہے

گھاس اور درخت گھنے ہو چکے ہیں

خرابئ وقت کو محسوس کرتے ہوئے پھولوں نے آنسو بہائے

علیحدگی سے نفرت کرتے ہوئے ایک پرندہ کا دل پھڑ پھڑایا

روشن مینار میں تین مہینوں کے دوران آگ بھڑک اٹھی

ایک خاندانی خط دس ہزار سونے کی اشرفیوں کے برابر ہے

یہاں ڈوفو (Du Fu)(712-770)، لی بائی (Li Bai)(701-762) اور وانگ وی (Wang Wei)(701-761) کی نظمیں یہ بتاتی ہیں کہ ان تینوں عظیم ترین تھانگ شعراء نے کس طرح شاعری کو نئے رنگ اور حسن دیئے۔ وانگ وی Wang Wei کی نظمیں کائنات کے دلکش رنگوں زندگی کی رعنائیوں، کنفیوشس اور بدھ مت کے فکری اور روحانی تجربات میں گندھی نظر آتی ہیں۔ اس دور کو شاعری کے اعتبار سے ایسے ہی تو سنہری دور نہیں کہا گیا۔

پگوڈا اسٹائل کافی ریسٹورنٹ اس وقت بند تھا۔ شام کو جب آئے تھے تو کافی کی خوشبو نے مضطرب کر دیا تھا۔ یہیں بینچوں پر بیٹھ کر کافی سے لطف اندوز ہوئے تھے۔

میری شلوار میری شناخت تھی۔ کوٹ تو سبھی پہنتے ہیں۔ سو وہ اگر پہنا ہوا تھا تو کچھ انوکھی بات نہ تھی۔ ہاں ڈوپٹہ بھی اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ برصغیر کے مخصوص خدوخال۔

وہ مجھے دیکھتی تھی اور میں نے بھی اُسے گھورا تھا۔ بہت دلکش اور حسین عورت۔ اس

کے ساتھ دس سال کا لڑکا بھی تھا۔ چہرے مہرے سے مشرقی یورپ کے کسی ملک کی دکھتی تھی۔لباس تو خیر مکمل مغربی تھا۔دفعتاً واک کرتے ہوئے جب وہ میرے قریب سے گزری اُس نے رک کر مجھ سے ادھورا سا سوال کیا۔

''آپ؟''

جملہ مجھے مکمل کرنا تھا۔وہ میں نے کیا۔''پاکستانی ہوں۔''

مسکراہٹ جس انداز میں اس کے چہرے پر پھیلی تھی اس نے پل جھپکتے میں مجھے سمجھا دیا تھا کہ وہ میری ہم وطن ہے۔

یہ ہم وطنی اور ہم زبانی بھی کیا چیز ہے؟ سارے فاصلے آنا فاناً مٹا ڈالتی ہے۔ لیجیے تعارف ہوا۔ یہ ثمینہ محی الدین تھی۔ پاکستانی بزنس مین کی بیوی۔ جنگو امن وائے Jianguomenway کے اِس پوش ایریا میں رہتی تھی۔ بچے کے سکول بارے پتہ چلا کہ پاکستان ایمبیسی اسکول میں پانچویں درجے میں پڑھ رہا ہے۔

سچی بات ہے میرے ہاتھ گویا بٹیرا لگنے والی بات ہوگئی تھی۔معیار بارے سوال پر طنزیہ انداز میں بولی۔ جیسے ملک زوال پذیر اور ملکی لوگ احساس سودوزیاں سے عاری ہیں تو بس ایسے ہی سکول،سفارت خانہ اور سفارت کار ہیں۔ چند لمحوں کی ہیلو ہائے میں ہی درد دل کا یوں پھٹ کر باہر آ جانا گویا خاتون کا حساس اور وطن پرست ہونے کی دلیل تھی۔

میں تو خود بھی ایک طرح بے حد پیاری بیٹی کے ڈپلومیٹک رویے سے قدرے دل برداشتہ سی تھی کہ 23 مارچ کے پاکستانی سفارت خانے کے پروگرام میں وہ مجھے یہ کہتے ہوئے کہ آپ لمبے سفر سے تھکی ہوئی ہیں قصداً ساتھ لے کر نہیں گئی۔ جانتی تھی ماں نے وہاں پُوچھ گچھ کے اپنے لُچ تلنے لگ جانے ہیں۔سفارتی ایٹی کیٹس کو گولی مارنی ہے۔ایسا کیوں ہے؟ اور ویسا کیوں نہیں ہے؟ جیسے سوال اٹھانے ہیں۔اور یہ میاں بیوی کے لیے شرمندگی

والی بات ہونی تھی۔

باتیں کرتے ہوئے دفعتاً میری آنکھیں اٹھیں۔ ذرا دور خود ساختہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے عقب میں کھڑے درختوں کی پھنگیوں پر بڑی مسکین سی دھوپ مسکرائی تھی۔ ایکا ایکی جیسے فضا کا حسن بڑھ گیا تھا۔

ثروت کی نظریں بھی میرے تعاقب میں اٹھی تھیں۔ ''دیکھو نا اک ذرا سی پیلاہٹ نے منظر کی رعنائی کتنی بڑھا دی ہے۔''

چند لمحے وہ بھی اِس سے محظوظ ہوتی رہی۔ پھر ہنسی اور بولی۔

''ایک بہت دلچسپ اور مزے کا واقعہ سناتی ہوں۔ سنیئے اور یہ بھی دیکھیے کہ اس جفاکش اور محنتی قوم کے لوگ ہمیں اور ہمارے حکمرانوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟''

''ارے'' میں ہمہ تن گوش ہوگئی تھی۔

یہ کوئی 2 یا 3 نومبر 2018 کی بات ہے جب عمران خان نے وزیر اعظم کی حیثیت سے پہلی بار چین کا دورہ کیا۔

میں کچھ گروسری کی خریداری کے لیے مارکیٹ جانے کے لیے نکلی تھی۔ میرے چینی ڈرائیور نے اپنے پتلے ہونٹوں اور تکونی آنکھوں میں شرارت نما چھلیے طنز سے مجھے دیکھتے ہوئے یہ جملہ بولا۔

''مادام عمران خان کیا پیسے مانگنے آیا ہے۔''

گاڑی کے ادھ کھلے دروازے پر دھرا میرا ہاتھ اُس وقت اک ذرا لرزا تھا۔ میرا دل سچی بات ہے اُسے ایک زوردار اور کرارا سا جھانپڑ لگانے کو چاہا تھا۔ مگر مجھے رُکنا پڑا تھا۔ چہرے پر فی الفور پیدا ہونے والے غصّے کے اثرات کو زائل کرنا پڑا تھا۔ میں نے خود سے سوال کیا تھا۔

اگر سچائی سے جملے میں چھلکتی حقیقت نما تلخی کا تجزیہ کروں تو کیا یہ مجھ پاکستانی کو میری اوقات یاد دلانے کی ایک معصومانہ یا عیارانہ کوشش تھی جس کے پس منظر میں ایک ارب تیس لاکھ قوم میں سے ایک کروڑ کی سوچ کی جھلک تو ضرور ہی ہے۔صورت یقیناً قہر درویش بر جانِ درویش والی تھی۔تاہم دھیمی سی مسکراہٹ جس میں شرمندگی ،خجالت اور کچھ دکھ بھرے جذبات کے رنگ تھے ہونٹوں پر سجائی۔گاڑی میں بیٹھی اور دھیرے سے بولی۔

''ارے نہیں وہ تو تمہارے صدر شی چن پنگ اور وزیر اعظم لی کھ چیانگ Keqiang سے باہمی دلچسپی ،سٹریٹیجک تعاون اور کچھ اقتصادی مسائل کے حل،مشورے اور مدد کے لیے آیا ہے۔

باہر نومبر 2018 کے ابتدائی دنوں کی دھوپ اور تیز ہواؤں کا بیجنگ کی فضاؤں میں زور تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ اس وقت میرا اپنا دل جیسے منوں وزنی پتھروں تلے آ گیا لگتا تھا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔آنسو تو جیسے پلکوں پر دھرے رہتے ہیں۔ذرا سی ٹیس لگنے کی دیر کہ بس بہہ نکلتے ہیں۔

چین کی پاکستانی ایمبیسی دنیا کے ہر ملک میں قائم پاکستانی ایمبیسی سے بڑی ہے۔ Zong Zhimenwai Da Lie کا علاقہ جس میں ایمبسی کی جگہ اور عمارت ہے۔ بیجنگ کا مہنگا ترین کمرشل ایریا ہے۔پہلے تو اس کے رقبے کی وسعت لالچی حکمرانوں کو کھلی۔ کوئی آٹھ دس کنال کا ٹکڑا ہمارے ملک کے عالمی شہرت یافتہ مسٹر ٹین پرسنٹ نے ایک اسلامی ملک کو بخش دیا۔اندر خانے کیا طے ہوا؟ ڈیل کتنے میں ہوئی؟ کچھ علم نہیں۔

ثروت کو بھی بس جیسے اپنے پھپھولے پھوڑنے کا موقعہ ملا تھا۔بولے جا رہی تھی۔

انیسویں (19)،بیسویں (20) اور اکیسویں (21) گریڈ کے ڈپلومیٹ ارد گرد کے قریبی پوش علاقوں میں رہتے ہیں جس کے ایک لگژری فلیٹ کا کرایہ کوئی پانچ چھ لاکھ

پاکستانی روپے بنتا ہے۔چین میں ورٹیکل ڈیزائن پر عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔صرف دو کنال کے رقبے پر تیس منزلہ عمارت پوری ایمبسی کے عملے کو سمیٹ سکتی تھی۔کروڑوں روپے کا کرایے کی مد میں یہ خرچہ بچایا جاسکتا تھا۔مگر بات تو یہ ہے کہ ایسا دماغ و دل کہاں سے لایا جائے جو اِن پہلوؤں پر سوچے۔یہاں تو جو آتا ہے ڈنگ ٹپاؤ پالیسی پر عمل کرتا ہے۔

اب نزلہ اِن ہائی پروفائل افسران کی نخریلی اور کاہل بیویوں پر گرنے لگا۔یقین کیجیئے۔بڑا دل سوز سا لہجہ تھا۔انہیں تو شاپنگ کرنے ،گھروں کو سجانے ،ڈنر پارٹیاں کرنے اور شو بازیوں کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ایسا ہابڑہ ہے ہماری اِن عورتوں کو کہ ابھی بچیاں بالشت بھر کی ہیں اور اُن کے داجوں کے لیے شنگھائی کی رضائیاں بھی بنوالو،ڈنر سیٹ خرید لو۔واپسی پر کنٹینر تو پھر بک ہوتے ہیں۔بلا سے سامان قیمت خرید سے بڑھ جائے۔

اِن کی پارٹیوں میں میرا بہت آنا جانا ہے۔جی بہت چاہتا ہے کہوں کہ آخر آپ لوگ کیوں نہیں سمجھتے ہیں کہ ہمیں ان کے ساتھ دوستی اور افہام و تفہیم کو مظبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ہماری ڈپلومیٹ ز کی ڈنر پارٹیوں میں متعلقہ شعبوں کے چینی لوگوں کی موجودگی اہم ہے۔یہ ملنا جلنا، یہ تعلقات، یہ رابطے سفارت کاری کے اہم گُر ہیں۔جس میں پڑ کر ہم دوہرے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ان کی فنی مہارت اور کاروباری گُروں سے اپنی بزنس کلاس کی تربیت اور ان کے لیے مراعات حاصل کرنے کے ساتھ اُن کے کلچر و تہذیب سے واقفیت اور اپنی ثقافت و کلچر سے انہیں روشناس کروانے کا سنہری موقع حاصل کر سکتے ہیں۔ہمارے اکثر ڈپلومیٹ ز اول تو چینی ڈھنگ سے بول ہی نہیں سکتے۔جو بولتے ہیں وہ بھی دال دلیے کی حد تک۔

ان میں سے اکثر خواتین تعلیم یافتہ ہیں۔سبجیکٹ سپیشلسٹ ہیں۔اعزازی طور پر سکول میں پڑھا سکتی ہیں۔پانچویں درجے میں پڑھنے والے بچے کی انگریزی اور سوشل سٹڈیز کی ٹیچر کا تلفظ درست نہیں۔اولیول میں پڑھنے والے بچوں کے آئے دن استاد بدلتے

رہتے ہیں۔کبھی اس سکول کا بین الاقوامی معیار تھا۔اس میں یورپی مما لک کے بچے بھی پڑھتے تھے۔1960 میں اس کا افتتاح چواین لائی نے پاک چائنافرینڈ شپ کےتحت کیا تھا۔نالائقی دیکھیے کہ اسے چینی حکومت سے منظور کروانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

میں سانس روکے بیٹھی سُنتی تھی۔میرا تو اپنا پھانڈہ (برتن) بھی ایسا ہی نکلا تھا۔

☆☆☆

باب نمبر:۱۰ جانا میرا شاہراہ ریشم کی جانب۔

- o شہر تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے سیاحوں کے لیے بہت اہم ہے۔
- o فرانسیسی صدر نے ٹیرا کوٹا کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہا۔
- o فطرت کا حسن دو فی صد سے ہر گز زیادہ نہیں تھا۔

سفر ناموں کی دنیا کے شہنشاہ مستنصر کے لہجے میں کچھ تھا۔ جب انہوں نے شی آن xian کا ذکر کیا۔ دراصل قصہ کچھ یوں تھا۔فخر زمان کے بیٹے کی دعوت ولیمہ تھی۔ مستنصر وہاں مدعو تھے اور ہم بھی تھے۔ جہاں مستنصر ہوں وہاں اُن کے گرد جمگھٹا نہ ہو کہیں ممکن ہے۔

تب میں نے دھیرے سے کہا۔

''مارچ کے آخری ہفتے میں چین جانے کا پروگرام ہے کچھ راہنمائی کر دیجیئے۔''

مسکرائے اور بولے۔''شی آن ضرور جائیں۔''

عادت کے مطابق تھوڑی سی ادھر ادھر کچھ جاننے کے لیئے ٹکریں مارنا بھی فطرت کا حصّہ ہے۔ پہلے کتابیں ہوتی تھیں جو کہتی تھیں آؤ اور ہمیں ڈھونڈو۔

اب خیر سے کافروں نے گھر میں ہی علم کے دریا بہا دیئے ہیں۔ جب جی چاہے غوطے مارو۔ چھینٹیں اڑاؤ۔ سوئمنگ کرو۔ جتنی دیر چاہو لُطف اٹھاؤ۔ سچی کافروں کا کتنا بڑا احسان ہے ہم جیسے نکھٹو مسلمانوں پر۔

عمران نے شی آن کا پروگرام جب ہاتھوں میں پکڑایا۔ میری تنقیدی نظروں نے رشتے کے لیے لڑکی کے گھر جانے والی ساس کی طرح اس کا مشاہدہ کیا۔ ٹیرا کوٹا Terracotta اس میں درج تھا۔ بیٹی اور داماد شی آن کی اہمیت سے آگاہ

تھے۔ مرکزی چین کا یہ شہر شاہراہ ریشم کے کنارے پر واقع صدیوں سے قائم اپنے بہت سے تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے سیاحوں کے لیے ناگزیر بن چکا تھا۔

ٹیرا کوٹا اسی شہر کا ایک عجوبہ تھا۔ صدیوں پُرانی ایک نو دریافت شدہ جگہ کا عظیم تحفہ جس سے میں ابھی چند دن پہلے متعارف ہوئی تھی۔

طلحہ، فاطمہ اور مجتبیٰ جب سکول سے آئے۔ مجتبیٰ نے اسی کا ذکر کرتے ہوئے اُسے دیکھنے پر زور دیا۔

''ارے میاں جی تو چاہتا ہے پر گٹے گوڈے تو ادھار کے نہیں۔''

''نانو اسے تو ضرور دیکھنا ہے۔شی آن جانا اور اس میوزیم کو نہ دیکھنا بہت زیادتی والی بات ہوگی۔''

فاطمہ نے آنکھیں گھمائیں۔

''یہ تو وہی بات ہوگی کہ آپ مصر جائیں اور اہرام مصر دیکھے بغیر واپس آجائیں۔نہیں نانو ایسا مت کرنا۔''

اب لیپ ٹاپ کھل گیا اور دھڑا دھڑ تصویریں سامنے آنے لگیں۔ آنکھیں تو پھٹ پھٹ پڑ رہی تھیں۔

نواسوں نے میرا تصویری تعارف ضرور کروایا تھا۔ چھوٹے والے نے تو آٹھواں عجوبہ بھی کہہ دیا تھا۔ سوچا دنیا کے بہت سے عجائبات کو اِن آنکھوں سے گزارے ہوئے ہوں۔ کتابی کیڑا بھی ہوں۔ یہ ہیرا کہاں چھپا بیٹھا تھا؟ شاید اسی لیئے حیرت زدہ ضرور ہوئی تھی۔

مجتبیٰ اِس بارے کچھ زیادہ ہی جوشیلا تھا۔ پیارے سے نواسے کو یہ کیسے سمجھاتی کہ اب یہ میرے اختیار میں تو ہرگز نہیں کہ میں اِسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دوں۔

’’سُنو مُجی میرے خیال میں ابھی تک تو یہ دنیا سات عجوبوں پر ہی باہمی اتفاق و اتحاد سے متفق تھی۔اب اس میں یہ آٹھواں بھی شامل ہوگیا ہے۔سوال اٹھتا ہے کہ یہ محض چینیوں کا خودستائشی پہلو ہے کہ اپنی چیزوں کے گڈے باندھنے میں بڑے ہوشیار ہیں یا واقعتاً ایسا ہی ہے میں نہیں جانتی۔

تاہم بعد میں پتہ چلا کہ ایسی بھی بات نہیں ۔بیچارے حق بجانب ہیں کہ ستمبر 1987 میں فرانسیسی صدر Jacques Chirac نے اِسے آٹھواں عجوبہ قرار دیا تھا۔اب اگر ہم ہی بے خبرے ہیں تو قصوروار کون؟ بھئی سو فیصد ہم۔‘‘

چلیئے اب ذرا جانے کی روئیداد سن لیں۔

عمران نے دونوں جگہوں کے درمیان فاصلے کی طوالت اور ذرائع سفر سامنے رکھتے ہوئے میری پسند اور ناپسند کو مقدم جانا اور فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔1089 میل کی دوری گویا کہ کم وبیش لاہور اور کراچی جتنا فاصلہ۔بلٹ ٹرین کا سفر پانچ گھنٹے کا اور ہوائی جہاز سے سوا گھنٹہ۔چین میں ہوائی جہاز سستے ہیں۔

’’پڑے سستے ہوں میں کیا کروں؟ دل نے کہا۔ٹرین کے سفر کی فینٹسی ۔ ہائے ہَے اس کا کوئی مُول ۔ہرگز نہیں۔ زمین اور اس کا رنگا رنگ اور بے رنگا ماحول، لوگ باگ،ان کے درمیان رشتوں کی قیاس آرائیاں، مضحکہ خیز حرکات، سنجیدہ اور کھلکھلاتے چہرے ان کا مطالعہ، کتنا دلچسپ شغل ۔ پانچ گھنٹے کیا دس بھی ہوں تو ٹک اسی پر ہی لگاؤں گی۔اور ٹرین پر ٹک لگا دیا۔

ٹکٹ لینے کے لیئے ساس، داماد اور بیٹی کی تکون گئی۔وہیں تھین آن من سکوائر کے قریب ہی ریلوے اسٹیشن تھا۔

ریلوے اسٹیشن اُف خدایا اتنا بڑا کہ آنکھیں جیسے کانوں تک پھٹیں۔کیبنوں میں

بیٹھی ٹکٹ کاٹتی لڑکیاں گو ڈھیلی ڈھالی ہرگز نہ تھیں مگر کچھ اتنی چُست بھی نہ تھیں۔انگریزی سے تو ذرا سا بھی یارانہ نہ تھا۔

''اے ہے نری بونگیاں۔غلطیوں پر غلطیاں کیے چلے جا رہی تھیں۔کیو(قطار) میں چند پاکستانی بھی تھے۔دو جاپانی اور ایک انڈونیشی۔سب کے ٹکٹ غلط کٹے بمعہ ہمارے۔شکر مولا کا کہ عمران کو خیال آیا۔اُس نے چینی میں تکرار کی اور ٹکٹ بدلوائے۔میں اکیلی ہوتی تو نقشے ہاتھ میں پکڑ کر ماسکو والے حربے استعمال کرتی۔مگر ذلیل کتنا ہونا پڑتا؟

پھر جھرجھری سی لی تھی کہ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔

رات سونے سے قبل نیٹ پر اِس شہر کے ماضی بارے تھوڑا سا جانا۔یہ شان شی Shaanixi صوبے کا ایک بڑا شہر ہی نہیں اپنے اندر بڑی بھاری بھرکم تاریخ بھی سنبھالے ہوئے ہے۔پہلے پہل کی بادشاہتوں کا مرکز یہی تو تھا۔شاہراہ ریشم کی وجہ سے تجارتی سرگرمیاں عین اپنے عروج پر تھیں۔پیسے دھیلے کی فروانی نے خوشحالی بھی بہت پیدا کر رکھی تھی۔۔چین تو تب ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔

شہروں اور صوبوں کے ناموں کے ساتھ حکمرانوں کی من مانیاں اور کھلواڑ بھی تاریخ کا اہم حصّہ رہے ہیں۔شی آن نام اسے منگ سلطنت نے دیا تھا۔تیرھویں صدی میں جب مارکو پولو یہاں آیا تھا۔اپنے شہر وینس سے چلا تو اسی سلک روٹ پر ہی چلتا چلتا یہاں آن پہنچا۔یہ یوآن Yuan بادشاہت کا زمانہ تھا اور خیر سے عظیم طاقتور حکمران قبلائی خان تخت پر بیٹھا تھا۔پورے سترہ سال اس نے یہاں گزارے۔بڑی اہم اور ذمہ دار عہدوں پر فائز رہا۔The Travels of Marco Polo جیسی شہرہ آفاق کتاب کا خالق بنا جو آج بھی چین کی مستند تاریخ کا اہم حوالہ ہے۔

کوئی سترھویں صدی کے وسط میں نام کی تبدیلی کا پھر دورہ پڑا۔یہ شی پنگ

xiJing بن گیا۔ 1913 میں خیر سے پرانے نام کی جون میں آ گیا۔

اکتیس مارچ کی یہ صُبح ہمارے ہاں کی جنوری کی یخ بستہ صبح جیسی ہی تھی۔ کوٹ اور مفلر پہنے ہاتھوں کو جیبوں میں ٹھونسے سوں سوں کرتے نکلے۔ ہمارے ''اوبراورکریم'' کی طرح وہاں ''دیدی'' بڑی پردان تھی۔ ایک جہاں اُمنڈ پڑا تھا۔ بڑوں کا خصوصی پر کہیں اِس بھرے میلے میں چھوٹے بچے بھی پراموں میں سوتے جاگتے منظروں کا حصّہ تھے۔ ریلوے اسٹیشن بیجنگ کے جنوب میں تھا اور کیا شاندار تھا۔ اتنی وسعت والا، اتنی جدّت والا کہ بے اختیار ہی آنکھیں گیلی ہوگئیں۔

''پروردگار میں کیا کروں۔ میرا تو حسد ہی ختم نہیں ہوتا ہر وقت مقابلوں اور موازنوں پر اُتری رہتی ہوں۔ لوگوں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جلتی بھنتی ہوں۔ اپنی تفریح کا بھی بیڑہ غرق کرلیتی ہوں۔''

پلیٹ فارم شاندار، گاڑیاں شاندار۔ گاڑی میں بیٹھی تو مزہ آ گیا۔ ایک منٹ آگے نہ ایک منٹ پیچھے۔

تو قومیں ایسے ہی آگے نہیں بڑھتی ہیں۔ حرکت میں سبک پن کا سلیقہ نمایاں تھا۔

نظروں نے شیشوں سے پار کیا دیکھا کہ سوچوں کے پروں کو ہوائیں لے اڑیں۔ ہائے شاہراہِ ریشم پر سفر کر رہی ہوں۔

''مولا وہ بھی کیا زمانہ ہوگا۔ قافلوں کی لمبی قطاریں، اونٹوں کی گردنوں میں بندھی گھنٹیوں کی مسحور کن آوازیں، کجاوں میں بیٹھے مرد و زن، سرائیں، آگ کے آلاؤ میں رقص کرتی حسینائیں۔ سالوں کے لیئے گھر سے دوری، نہ خط نہ پتر، نہ کوئی سندیسہ سب کچھ اللہ حوالے۔

تو اسلام ان علاقوں میں کب آیا؟ تاجروں کے ذریعے۔ تو

حضرت سعد بن ابی وقاص بھی تو اولین دور میں ہی کہیں آئے تھے۔

شفاف شیشوں سے باہر کی دنیا دیکھنے میں گم تھی ۔قدیم رومان بھری دُنیا کی فضاؤں میں گم تھی ۔ جب بیٹی نے ٹرے کھول کراس پر چائے کا مگ،سموسہ نما پیٹی کیچپ میں لتھڑی پلیٹ میں دھری اورٹرے پر سجادی۔کھولتا گرم پانی گاڑی میں مہیا تھا۔

بیٹی ماں کے چسکوں اور چٹور پن سے اچھی طرح آشنا تھی۔اس نے سب اخنے مکھنوں کا بندوبست اہتمام سے کیا تھا۔ دل سے دُعا نکلی۔اوپر والے کے لیئے شکر گزار ہوئی۔چائے،حسین موسم اورمن موہنے سے ساتھی۔

''مالک میرے شکریے کے الفاظ جذبات کی ادائیگی سے قاصر ہیں۔اورتم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔میرا لُوں لُوں یہ پکارر ہاہے۔کہہ رہاہے۔یہ بندی کہاں اس قابل؟بس نذرکرم ہے تیری۔''

گاڑی صرف مرکزی شہروں میں ہی رکتی تھی۔شہر کیا تھے؟بیس پچیس منزلہ عمارتوں کے بار سے لدے پھندے مکمل اور کہیں کہیں تکمیل کے مرحلوں سے گزرتے، جھلکیاں مارتے اوردہائیاں دیتے کہ دیکھ لوہمارا ماضی تو سارا ملیامیٹ ہوگیاہے۔کیسے ہماری کایا کلپ ہوگئی ہے؟

سرنگیں آتیں جن کے اندھیروں سے گزرکر روشنیوں میں آتے ہی انسانی عزم کی کاری گری کے ستونوں پراٹھی فلک بوس لمبی لمبی عمارتیں اورایک دوسرے کو کاٹتی سڑکوں والے شہرنمودارہوتے۔(Shijia Zhuang)ایساہی شہر جس کا سارااسٹیشن راڈوں پر کھڑاتھا۔

ہاں درختوں کی خوبصورتی کہیں نہیں تھی۔چھوٹے چھوٹے ٹنڈ منڈ سے درخت، سرو جیسے بوٹے اور بالشت بھراُونچے پیلی سرسوں جیسے پودے،سبزیوں کے کھیت سفید

پلاسٹک کی شیٹوں سے ڈھنپے۔

فطرت کا حسن صفر نہیں تو دو% سے زیادہ بھی نہ تھا۔ اگر کچھ آنکھوں کو بھلا لگتا تو وہ چھوٹا سا ٹوٹا جو کہیں کہیں بس تحفے کے طور پر ہی نمودار ہوتا۔ ہاں کہیں کہیں ماڈرن پسِ منظر میں قدامتوں کے رنگ بھی دکھائی دے جاتے۔ پرانی عمارتوں کے ڈھانچوں کے ٹوٹے پھوٹے سلسلے بتاتے تھے کہ بس اُن کے تیا پانچہ ہونے میں کچھ زیادہ وقت نہیں ہے۔

چین سے واپس آنے کے فوراً بعد مجھے اپنے بھتیجے کی شادی میں ملتان جانا پڑا۔ اپریل کے درمیانی دن وسطی پنجاب کا لینڈ سکیپ۔ میرے اللہ موہ لینے اور آنکھوں کو جکڑنے والے منظر تھے۔ یوں جان پڑتا تھا کہ تا حدِ نظر پھیلے سبزے اور سنہرے رنگوں کے جیسے قالین بچھے ہوں۔ میری آنکھیں گیلی ہوگئی تھیں۔

''میرے خدا اِس ملک کو تو نے کیا کچھ نہیں دیا۔ بس اگر ڈنڈی ماری ہے تو اچھے لیڈر دینے میں۔

ہائی سپیڈ ٹرین 350 میل فی گھنٹہ۔ پانچ گھنٹے تو پھر بھی لگے۔ شیان کا اسٹیشن خوبصورت۔ باہر جانے کے دو رویہ کشادہ راستے جن کے آخری سرے پر دھرے جہازی سائز سرخ گلدان میں مسکراتے پھولوں نے مجھے شی آن آنے پر خوش آمدید کہا۔

''ہائے اس پرتپاک سے خیر مقدم پر جی خوشی سے کپا ہوگیا۔ واہ کیا ہی بات میری بھی خود ستائیوں کی۔ دا ہنی طرف دیوار کے ساتھ باتھ روم ہی باتھ روم والا منظر تھا۔ سب میں جھانکا۔ ایک بھی کموڈ والا نہ تھا۔

''آفرین ہے بھئی تم چینیوں پر۔ تمھارے بڈھوں کے گٹے گوڈوں پر تو سدا عالم شباب ہی رہتا ہے۔''

☆☆☆

باب نمبر:۱۱ عظیم شہر سپاہ

- صرف پچیس سال میں اس جنّتی قوم نے دفن شدہ اثاثہ اور شاندار میوزیم دنیا کو پیش کر دیا۔
- اوزاروں پر کرومیئیم Choromium کی موجودگی بتاتی تھی کہ وہ اس کے خواص سے آگاہ تھے۔

اس وقت اس اجنبی سرزمین پر چمکتا سورج تیز ہواؤں سے جس جس انداز میں دھینگا مشتی میں جتا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ہوا اور سورج کی لڑائی والی کہانی یاد دلائی تھی کہ میں بار بار اپنے کوٹ کے دونوں پلوؤں سے سینے کو ڈھانپنے میں لگی ہوئی تھی۔ بٹن بند کرنے مشکل تھے کہ کوٹ سینے سے تنگ تھا۔ عمران کی چینی زبان کی سوجھ بوجھ یہاں سب ناکارہ ہوگئی۔ ماشاء اللہ سے ہیرا پھیریوں میں ان چینیوں کا بھی جواب نہیں۔ میوزیم کے لیے اسٹیشن کے ساتھ ہی بسوں کا اڈہ ہے۔

تاہم اجنبیوں کو دیکھ کر پہلے تو چار چھ کا گروپ اکٹھا ہوگیا۔ ایک نے کہا۔ ”بس تھوڑا سا چلیئے East Sq پہنچ کر پانچ نمبر لین میں جانا ہے۔“

اب اِس مفت کی نیکی میں ذرا فاصلے پر کھڑے تین اور آدمی اپنی خدمات کے ساتھ میدان میں کود پڑے۔ اُن کی بانہوں کے اشارے، تکونی آنکھوں کی دائیں بائیں گردشیں اور ایک دوسرے سے اونچی آواز میں تکراریں اس زور وشور سے تھیں کہ لگتا تھا جیسے وہ لڑ رہے ہوں۔ پتہ چلا تھا کہ دیگر دو بندوں نے پہلے والے کو لتاڑتے ہوئے کہا تھا۔

”ارے اونا معقول اتنا بھی نہیں پتہ وہ بند کر دیا ہے۔ نیا فان چی چھنگ

Fangzhicheng میں ہے۔ یہاں سے ٹیکسی یا میٹرو میں وہاں جا سکتے ہیں۔''

''گولی مارو۔ عمران نے جھلّا کر کہا۔ ٹیکسی میں چلتے ہیں۔''

زیادہ فاصلہ نہیں تھا بس یہی کوئی ہمارے پرانے پچیس چھبیس میل۔

راستے میں میری زبان سے یونہی نکل گیا۔

''اف خدایا عمر کے کس حصّے میں تو نے یہ عنایتیں میرے اوپر نازل کیں۔''

عمران نے فوراً دلجوئی کی۔ ''گھبرایئے نہیں اندر ویل چیئر کا انتظام ہوگا۔ دیکھ لیں گے۔'' اب سوچتی اور دل ہی دل میں کہتی ہوں۔ یہاں دیکھنے وکھانے والی چیزوں کا تو انبار لگا پڑا ہے۔ داماد جی کو تو ٹرپ بڑا مہنگا پڑے گا۔ عمر کی اِس دراز موری کے کس کس سوراخ کو بیچارہ کِس کِس موڈ سے بند کرے گا۔

ٹیکسی نے جب پارکنگ ایریا میں اتارا تو پتہ چلا کہ لوبھئی اب منیر نیازی کو تو یاد کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ ابھی تو کوئی میل بھر اور چلنا ہے تب منزل آئے گی۔ شکر خدا کا کہ گولف کارٹ Golf Cart نے مشکل آسان کر دی۔ کارٹ میں کھلے ڈلے پانچ لوگ بیٹھے۔ تین ہم اور ایک ہندوستانی جوڑا۔ اوشا اور پران۔ فی الفور باتیں بھی شروع ہوگئیں۔ کاروباری لوگ تھے۔ گو ابھی سیاحتی موسم نہیں تھا۔ مگر لوگوں کے پُرے کِس جوش و جذبے سے بیگ مونڈھوں پر ڈالے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔

کیا نظارہ تھا۔ سرسبز لانوں کا وسیع و عریض سلسلہ، اُن میں کہیں کہیں مسکراتے پھول۔ ابھی شاید اُن پر جوانی کا جوبن نہیں آیا تھا۔ آپ کے دائیں بائیں شاندار عمارتوں کے سلسلے، بڑی بڑی بسیں اور لوگوں کے پُرے گویا جنگل میں منگل کا سا سماں تھا۔ عین داخلی گیٹ کے سامنے اُترے۔ گائیڈوں کے ٹولے شہد کی مکھیوں کی طرح چمٹنے کے لیے بے تاب لگتے تھے۔ اوشا لوگوں نے ٹکٹ لینے تھے۔ ہمارے بک تھے۔ زبان کی ہم نوائی بھی کِسی

نعمت سے کم نہیں۔ پل جھپکتے میں اجنبیت سے پر ماحول میں مانوسیت اور اپنائیت کی خوشبو بکھیر دیتی ہے۔ ہنستے مسکراتے خدا حافظ کہا۔عمران نے اندر داخل ہونے سے قبل وہیل چیئر لینے کے لیے میری رائے مانگی۔

اس وقت میں نیلے چمکتے طلائی کرنوں کی بارش کرتے آکاش تلے کھڑی گرد و پیش کو دیکھتی تھی۔میرے اردگرد مزے مزے سے چلتی موٹی تازی بڑی بوڑھیاں باتیں کرتی، ہنستی مسکراتی گزر رہی تھیں۔''یا اللہ میں کیا اتنی گئی گذری ہوں۔ پہلے تو خود پر لعنت بھیجی یہ کہتے ہوئے۔ ڈوب مر کسی کھوکھاتے میں۔ان کو دیکھ عمر میں یقیناً تجھ سے زیادہ ہی ہوں گی۔مگر ہمت اور توانائی کیسی جوانوں جیسی ۔تیری صحت اچھی ،کاٹھی مظبوط تجھے کیوں دورے پڑ رہے ہیں؟''

عمران کو دیکھتے ہوئے ہنسی۔''بھئی ابھی تو چاہت کا آغاز ہی ہوا ہے۔دیکھیں تو سہی اس دل کے ولولے کتنا ساتھ نبھاتے ہیں؟ سچی بات ہے میں نواسوں کے توسط سے میوزیم سے کچھ کچھ آشنا ضرور ہوئی تھی۔مگر یہ تو گمان کے کسی حصّے میں بھی نہیں تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی حیرتوں کے جیسے برقی جھٹکوں سے منہ کے بل گروں گی۔

اگر بیٹی اور داماد ساتھ نہ ہوتے تو منہ کے بل گرنا تھا اور کوئی ہڈی پسلی ٹوٹنی ہی ٹوٹنی تھی۔وسیع و عریض ہال کی وسعتوں کی کیا بات کروں کہ نظریں شرمندہ ہو ہو جاتی تھیں۔

داخلہ Pit نمبر ایک سے ہوا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ متاثرکُن ہے۔حیرت زدہ کہوں یا سحر زدہ کہوں۔بس اتنا یاد ہے کہ ایک پُرفسوں سا ماحول جس میں بندہ سانس لیتے ہوئے ڈرتا ہے۔حالانکہ یہ یقین بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ منظر نامہ حقیقی تو ہے مگر محفوظ ہے۔مگر اب بوڑھے دل کو کون سمجھائے؟ لوگ جیسے دھیرے دھیرے چلتے تھے۔اطراف میں بنے اُن کشادہ راستوں پر جن پر پلوں کی صورت کا گمان پڑتا

تھا۔ جہاں اگر چینیوں کی کثرت تھی تو غیر ملکی بھی بہتیرے تھے۔

تعمیری ڈھانچے کی بلندیوں سے اطراف کی جانب پھوٹتی روشنیوں میں زمینی گڑھوں میں ایستادہ فوجی جیسے لام پر جانے کے لیے صف بستہ ہوں۔ کہیں تین، کہیں چار کی قطاروں میں چاق و چوبند، جنگی لباس پہنے کہیں اُن پر سجے نشان جو یقیناً تمغوں کے ہی ہوں گے۔ برونز ہتھیاروں کو تھامے، اپنے آگے کھڑے چھ فٹ سے کہیں زیادہ نکلتی قامت کے جرنیل کے بس جیسے حکم کے منتظر ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ دیکھنے سے قبل احساسات کچھ عجیب سے تھے مگر جب دیکھا تو فرط حسن سے نہیں فرط حیرت سے انگلیاں کاٹنے والی بات تھی۔ دنیا کا بے حد چونکانے والا حد درجہ متاثر کن، حیرت انگیز عجوبہ۔

مٹی گارے کے تراشیدہ مجسموں کا تو اُن پر گمان نہیں ہوتا تھا۔ بھول جائیں چند لمحوں کے لیے کہ جو کچھ آپ کے دماغ میں ہے۔ صرف انہیں دیکھیں جو زندگی اور اپنے چہروں پر پر مختلف تاثرات کے ساتھ آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔ بس اُس اذن کے منتظر کہ جیسے ابھی لام پر جانے کے لیے طبل جنگ بجے گا اور وہ کوئیک مارچ، کوئیک مارچ کرتے نکل کھڑے ہوں گے۔ چلتے چلتے کِسی کِسی لمحے آپ کو کچھ یوں بھی محسوس ہوتا جیسے ابھی ان کا جرنیل اشارہ کرے گا اور وہ بس دشمن پر ٹوٹ پڑیں گے۔ گو اس وقت دشمن تو ہم سیاح لوگ ہی تھے۔

آنکھوں کے ساتھ ساتھ ذہن بھی مصروف کار تھا۔ سوال کرتا تھا آخر اِن بادشاہوں کو کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ یہ اتنے ویلے (فارغ) ہوتے تھے۔ فرعونوں کے ہاں بھی یہی ذہنیت کارفرما تھی کہ بس وقت مرگ آ گیا ہے۔ مُردے کے ساتھ سب خزانے مال دولت کو دفن کر دو۔

سچی بات ہے قبلِ مسیح کے بادشاہوں کے کتابچے کھول لو یا بعد مسیح کی تاریخیں پڑھ لو۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ مگر گزرتے وقت، تعلیم اور تہذیب نے کیا انسانی سوچ کو بدل دیا۔ اُن کی فکر پر کوئی مثبت اثر ڈالا۔ ہرگز نہیں۔ یہی سوچ یہی فکر مختلف رنگوں اور مختلف شکلوں میں آج بھی انسان کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔

اور ہاں ایک اور ستم ظریفی بھی ذرا ملاحظہ کریں۔ شہنشاہ چھن شی چنگ Qin Shi Huang نے ہر اس بندے کو مار دیا جس نے اسے بنایا یا کسی نہ کسی انداز میں اس کام میں مدد کی۔ اور ستم بالائے ستم کچھ کو زندہ بھی دفن کیا۔ کوئی آدمی زندہ نہیں رہنے دیا گیا کہ جو یہ بتا سکے کہ 8 لاکھ لوگوں کی فوج اور کانسی کی رتھیں کہاں دفن ہیں؟ تاریخ کو تو یونہی مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ مثالیں دینے کی بھی بھلا کوئی ضرورت ہے۔ ایسا تو ہر عہد کے کم و بیش ہر طاقت ور نے کیا کہ وہ تو ذات میں خدا تھا۔

چلیئے دوسو دس قبل مسیح چین کا پہلا بادشاہ تو بھئی پہلے بادشاہ کا بہت بڑا کارنامہ سامنے آ گیا۔ چلو جو کچھ بھی کیا دولت کا بے دریغ استعمال کیا۔ لوگوں کو مروایا۔ مخلوق خدا کو فضول کاموں پر لگایا۔ پر صدیوں بعد کی نسلوں کو تحفہ مل گیا نا آٹھویں عجوبے کا۔ اور ہاں اپنی نسلوں کے لیئے کمائی کا راستہ بھی ہموار کر دیا۔ عثمانی سلطنت اور مغل سلطنت کے عہد ساز مسلمان حکمرانوں کو دیکھ لیں۔ زاروں کو یاد کر لیں، یورپ کے تاجداروں کے قصّے پڑھ لیں۔ چوڑ چانن سب روشن ہو جائے گا۔

اب دو باتوں نے جکڑ لیا تھا کیونکہ معاملہ دو انتہاوں کے درمیان کا تھا۔ ہزاروں سال پہلے مسیح موعود سے بھی سینکڑوں سال کوئی 246-210 کے ہیر پھیر میں سلطنت کے پہلے بادشاہ چھن شی Qin shi Huang کے دور میں یہ شاہکار تخلیق ہوا اور بیسویں صدی کے آٹھویں عشرے میں دریافت ہوا۔ اور ہوا کیسے؟

یہ بھی بڑی دلچسپ کہانی ہے۔شی آن کے لن ٹونگ کاؤنٹی Lintong county شہر کے نزدیک ایک جگہ دو بھائیوں نے ایک کنواں کھودنے کا ارادہ کیا۔اُن کی فصلوں کو پانی کی شدید ضرورت تھی۔اِس بارے بھی اختلاف ہے۔ایک حوالہ تو دیہی کسانوں کا ہے۔اُن کے مشکل مشکل نام بھی درج ہیں۔بہرحال دو ہوں یا نو یا دس بیس۔سلسلہ تو یہ جڑتا ہے کہ جب انہوں نے منتخب کردہ زمین پر ہتھوڑے چلانے شروع کیئے تو اُن میں سے کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ جگہ جو صدیاں سے بدلتی رُتوں کے قہر، جبر اور مہربانیوں کا بار اُٹھائے ہوئے ہے اپنی تہہ میں ایک خزانہ چھپائے بیٹھی ہے۔

یہ 1974 کا موسمِ بہار تھا۔تباہ کن سردی اور برچھی کی کاٹ جیسی ہوائیں اپنے سینوں پر جھیلنے کے بعد رُت بدلی تھی۔درختوں پر پتوں نے پھوٹ کر نئے موسم کی خوشخبری دی تھی۔پھاوڑے چلاتے چلاتے ایک نے رُک کر دوسرے کو دیکھا۔فضا کو مسرور سی نگاہوں سے گھورا اور آخر میں کہا۔

''کاش زیادہ گہرا نہ کھودنا پڑے۔پانی میٹھا بھی ہو اور چاندی جیسا اُجلا بھی۔''

دفعتاً ایک دیہاتی کو کچھ برتنوں کے ٹکڑے نظر پڑے۔حیرت سے وہ اُن کی طرف لپکا۔ان میں سے کچھ انسانی صورتیں اور کچھ جانور دِکھتے تھے۔بات پھیلی تو گاؤں اکٹھا ہوگیا۔پھر اردگرد گاؤں کے لوگ آنے لگے۔شدہ شدہ بات آثارِ قدیمہ کے ماہرین تک جا پہنچی۔اور پھر نیچے سے Terracota Army کا ایک جہان اُبل پڑا۔

اب بھلا اس سوال نے سرنہیں اُٹھانا تھا؟ اُٹھایا کہ دریافت 1974ء سے 78 کے لگ بھگ تک ہوتی رہی تھی۔کیا قوم ہے یہ۔صد ہزار بار آفرین ہے چینی حکومت پر ایک دُنیا آباد کر دی تھی انہوں نے۔تاریخ کا روشن باب کھل گیا تھا۔جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیا تھا۔

اورصرف پچیس سالوں میں چینی قوم نے اِس درجہ شاندار میوزیم اور اِردگرد ہنگاموں سے پُر ماحول پیدا کر کے دنیا کو اپنا قابلِ فخر ورثہ دکھا کر مجبور کر دیا کہ وہ مانیں کہ یہ دُنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔اب ہرگز اپنے ملک اورقوم کی کرتوتیں اوراُن کی نالائقیوں کے رنڈی رونے نہیں رونے۔تاریخ وثقافت سے لبالب بھرے شہر ملے تھے ہمیں جن کے ہم نے تخم مار دیئے۔

یہ بھی کیسی تعجب کی بات تھی کہ صدیوں پرانے لوگوں کو سائنس سے آشنائی تھی۔ ایسے وقتوں میں جب سائنس اوراس کی تعلیمات کا سراغ نہیں ملتا۔قبل مسیح سے بھی سینکڑوں سال پہلے کے لوگ جانتے تھے کہ انہیں انسانوں اور چیزوں کو محفوظ کیسے کرنا ہے؟ برونز کے ہتھیاروں کی چمک دمک قائم ، اُن کے بلیڈوں کی دھار تیز دیکھنے میں آئی تھی۔چند اوزاروں پر کرومیئیم Choromium کی موجودگی نے بتایا تھا کہ وہ اس کے خواص سے آگاہ تھے۔فطرت آج فیاض ہے تو صدیوں پہلے بھی ایسی ہی تھی۔

دوسوالوں کو تو چلو مطمین کر دیا مگر اب کیا کروں کہ نئے نئے سوال اُٹھ رہے تھے۔ کتابچے میں تحریر تھا کہ تینوں Pits کا اگر تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ایک جیسی صورتوں کا نظر آنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔والٹ نمبر 1 میں عام سپاہ تھی۔ڈھیروں ڈھیر جس کا ہر فوجی اپنے خدوخال،اپنے بالوں،اُن کے رنگ، ہیراسٹائل،اپنے جبثے اپنی قد وقامت سبھوں میں مختلف تھے۔اب بھئی اِن کے دعووں کی تردید تو مجھے کرنی نہیں کیونکہ میرا ذاتی مشاہدہ تو گڈمڈ ہوا پڑا تھا۔کہیں ایک کی صورت پر دوسرے کا گمان گزرتا تھا۔شاذ ونادر ہی کوئی صورت قطعی طور پر دوسرے کے برعکس نظر آئی تھی۔گو میں نے سارے Pits ضرور دیکھے مگر مجھے اعتراف ہے کہ اس اتنے مختصر سے وقت میں باریکی اور گہری تنقیدی آنکھ سے انہیں دیکھنا کہیں ممکن تھا۔

ہاں مگر سب سے بڑے پٹ میں اگر ہزاروں کو سرسری سی نظر سے دیکھا تو بھئی کچھ ایک ہی جیسے لگے تھے۔ سچی بات ہے اولین تاثر میں تو اندر باہر حیرت اور تعجب ہی غالب رہا۔مگر یادداشتوں کو آواز دوں۔دماغ پر زور ڈالوں تو کہیں فرق کی جھلکیوں کے لشکارے بھی ملتے ہیں۔

چلو میری رائے اور نظر کو تو مارو گولی! جو تحریر ہے اُسے ہی جانا جائے تو پھر یہ سوال بھی اُٹھتا ہے کہ انفرادیت خالق کائنات کی صفت ہے۔کیا شہنشاہ کے دل میں کہیں خدا بننے کی خواہش تھی۔ویسے تو یہ بات مسلم ہے کہ ایسی خواہش تو ہمیشہ سے کیا ماضی اور کیا حال کے حکمرانوں کے دلوں میں رہتی تھیں اور رہتی ہیں۔اس کا اظہار بھی اُن کے قول وفعل سے ہوتا رہا ہے۔

پٹ نمبر دو اور تین علی الرتیب چھوٹے تھے۔سچ تو یہ ہے کہ پٹ نمبر 2 نے بہت متاثر کیا۔یہاں ایسی خوبصورت رتھیں کہ ہر ایک کے تعاقب میں تین تین بے حد خوبصورت رتھیں اور گھوڑے تھے کہ بے اختیار چھلانگ مار کر ان میں بیٹھنے کو جی چاہتا تھا۔تین قطاروں میں منقسم ہر گھوڑے کے سامنے کھڑے سپاہی جس کے ایک ہاتھ میں لگام اور دوسرے میں کمان۔اتنی خوبصورت مجسمہ سازی کی تفصیل کیا سناؤں۔بس یہی کہ بندہ عش عش کر اُٹھے اور یہ محسوس کرے کہ بس تیر تو اب آپ کے سینے میں ہی اُتر جائے گا۔

پیدل چلتے سپاہی کہیں بیٹھے، کہیں کھڑے، کہیں گھٹنوں کے بل جھکے، کہیں سر کو خم کیئے، یوں بھی سب ملے جلے جیسے پوزوں کے ساتھ حیرتوں کا ایک جہاں وا کرتے تھے۔ آپ کو اپنی آنکھیں پھاڑنے پر مجبور بھی کرتے تھے۔

اولین مجسموں پر سورج کی کرنوں اور ہوا نے منفی اثرات چھوڑے۔ان کے رنگ و روغن بہت متاثر ہوئے۔اصلی شکلیں تو سب رنگین تھیں۔اب صدیوں کے بعد کچھ تو

نقصان ہونا تھا۔ بہرحال انہیں وہی پینٹ کیا گیا۔ٹوٹے پھوٹے چہروں اوراجسام کی مرمت کی گئی۔مرمت کا کام تو ابھی بھی جاری ہے۔

پٹ نمبر 3 پٹ نمبر 1 کے پیچھے تھا جبکہ نمبر 2 ذرا ہٹ کر تھا۔نمبر 3 کو ایک طرح ہیڈکوارٹر کی سی حیثیت حاصل تھی۔اس کا شمالی ونگ روم فتح کیلئے دعا مانگنے کے لیے مخصوص تھا۔جنوبی ونگ روم فوجی مشاورت کے لئے۔

سچی بات ہے اس فوج کے اتنے بڑے کھلار اور پسار کو سمیٹنا نہ تو میری ٹانگوں کے بس کی بات تھی اور نہ ہی آنکھوں کی۔ ہلکان ہوگئی تھی۔پٹ نمبر 2 اور تین کے لیئے تو میں ہرگز ہرگز تیار نہ تھی۔اللہ دونوں میاں بیوی کو زندگی اور سلامتی دے۔معلوم نہیں انہوں نے کب وہیل چیئر کا بندوبست کرلیا تھا۔ سچی بات ہے اِسے نہ دیکھنا زیادتی کی بات ہوتی ۔ہاں البتہ کافی بار سے دوبار کافی بھی پلادی تھی۔دونوں کا کہنا تھا ساری تھکن بلاٹنگ پیپر کی طرح اس میں جذب ہوجائے گی۔ پر مجھے بلڈ پریشر بڑھنے کا خوف پریشان کررہا تھا۔

جب صدیوں پہلے کے مردہ انسانوں کی دُنیا سے نکلے اور زندہ انسانوں کو دیکھا تو چہل پہل اور رنگا رنگ میلے کا جہاں بھرپور انداز میں متوجہ کرتا تھا۔ بازار سجے تھے۔ خریداریوں کے سلسلے۔آوازیں لگاتے لونڈے مردآپ کو پکارتے نظرآتے تھے۔کونسی چیز یہاں نہیں تھی؟ مگر قیمتیں باوا کے مول تھیں۔عمران نے شی آن کے ڈاؤن ٹاؤن سے خریدنے کا مشورہ دیا۔اس لیئے سب کو دور دفعان کیا۔ ہاں البتہ کتابیں میری کمزوری تھیں۔مگروہ بھی بہت مہنگی۔سوچا بوجھ اُٹھانے سے ابھی پرہیز کیا جائے۔

پس تو خدا حافظ کہا اس عظیم شہرِ سپاہ کو۔

☆☆☆

باب نمبر:۱۲ شی آن، شاہراہ ریشم اور مسلم کواٹر

- o شی آن پرشیا، عرب اور وسط ایشیا کے طلبہ کا مرکز علم تھا۔
- o بیل ٹاور اور ڈرم ٹاور بڑی دلچسپ تاریخ رکھتے ہیں۔
- o شی آن مسلم تہذیب کا نمائندہ شہر ہے۔

تو اب شی آن کی طرف رواں دواں تھے۔ جی ہاں۔ چینی قوم اور اس کی تہذیب کی جنم بھومی کی جانب۔ مگر میرے لیئے کشش کا سبب نہ تو اس کی چھ ہزار سال پُرانی تاریخ تھی۔ اور نہ ہی اس کا سینکڑوں سال کم وبیش تیرہ سلطنتوں کا پایۂ تخت رہنا۔ ٹیرا کوٹا میوزیم Terracotta شی آن چھوڑ چین کا لینڈ مارک ہو۔ گریٹ سٹی وال، وائلڈ گوز پگوڈا، بیل ٹاور اور معلق گرم چشمے جیسی خوب صورت قابلِ دید جگہیں پڑی ہوں۔ مجھے کیا؟

مجھے تو جانا تھا، اپنے پیا دیس، اپنے مسلم کواٹر میں۔ سجدہ دینا تھا اس کی مسجد میں، ملنا تھا وہاں کی مسلم خواتین سے، کچھ دل کی باتیں کرنی تھیں اُن سے۔ زبان کا مسئلہ آڑے آنا تھا مگر جب نیتوں میں خلوص ہو تو راستے نکل ہی آتے ہیں۔ سنکیا نگ جانا تو شاید نصیب میں نہ ہو۔ ٹیکسی فراٹے بھر رہی ہے۔ میں باہر دیکھتے ہوئے صفائی ستھرائی کے معیار دیکھتی ہوں۔ حسرت سے فٹ پاتھوں کے پہلوؤں میں کھڑے درختوں کو دیکھتی ہوں کہ کہیں زمین پر بکھرا کوئی پتہ نظر آ جائے۔ وائے ناکامی۔ اللہ جانے درختوں کو اتنا شعور دے دیا گیا ہے کہ انہیں خود کو شوریدہ سر ہواؤں سے سنبھال کر رکھنا ہے یا پھر صفائی کرنے والے اتنے مستعد ہیں کہ وہ بس گھات لگائے بیٹھے ہیں کہ کہیں کوئی پتہ گرا اور انہوں نے دبوچا۔

ایک وسیع و عریض میدان کے وسط میں مستطیل نما عمارت کے گلیارے سے اس

قلعہ شہر کے اندر داخل ہونا جس کے اُوپر سہ منزلہ رنگیلا سجیلا جھلکیاں مارتا پکوڑا دیکھنا اور اُسے یہ کہتے ہوئے سننا۔''ارے شاہراہ ریشم یہیں سے تو شروع ہوتی تھی۔پُرانے وقتوں کے لوگ بھی تجارت،تعلیم اور میل ملاپ کی ضرورت اور اہمیت سے آگاہ تھے۔کچھ لوگ سارا کریڈٹ آج کے لوگوں کو ہی دیتے ہیں۔ارے بھئی اپنے حسابوں وہ بھی بڑے باشعور تھے۔''پرانے پرشیا (آج کا ایران)،عرب دنیا اور وسط ایشیا کے لوگ اپنے بچوں کو علم کے حصول کے لیے بھی اس قدیم شہر میں بھیجتے تھے۔جیسے تم لوگوں کے بچے آج کل یورپ جاتے ہیں۔

''تم مجھے یہ سب کیوں سُنا رہے ہو؟ تمہارا خیال ہے میں شاہراہ ریشم کی اہمیت سے آگاہ نہیں۔ارے مجھ سے زیادہ کون اس کے عشق میں مبتلا ہوگا۔اور ہاں تمہاری تالیف قلب کے لیئے اب ہمارے بچوں نے بھی تمہاری جنم بھومی میں علم حاصل کرنے آنا شروع کر دیا ہے۔اور دیکھو میرے تو نبیؐ کا فرمان ہے کہ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے۔''

''غصّہ کیوں کرتی ہو۔آج کے لوگ اس عظیم شاہراہ بارے کچھ نہیں جانتے کہ صدیوں پہلے اس نے کیسے مشرقِ وسطیٰ اور وسط ایشیا کے ذریعے مشرق اور مغرب کو ملایا ہوا تھا۔اور ہاں کیا نہیں چاہو گی کہ کچھ تھوڑا اس کے بارے بھی جانو جس کا یہ خیال تھی،جس نے اِسے بنایا۔چند لمحوں کے لیے انہیں بھی یاد کر لو۔خراج تحسین پیش کر دو۔یہ بھی عظمت ہے کہ انہیں محبت سے یاد کیا جائے جنہوں نے انسانی فلاح کے لیے کچھ کیا ہو۔

''ضرور ضرور۔منتظر ہوں۔''

دو سہرے باندھنے ہیں۔پہلا ہان خاندان کے سر پر جس نے صدیوں پہلے یعنی کوئی اکیس سو سال قبل مسیح اپنا ایک ایلچی وسط ایشیا میں دوبارا امن دوستی اور تجارت کے مشن پر بھیجا۔دوسرا سہرا اس عظیم بادشاہ کے سر بندھتا ہے جو کہیں 138 قبل مسیح کا حکمران تھا اور

جس کا نام ژانگ چھیان Zhang Qian تھا۔ بڑا دلیر، جی دار اور کچھ کر گزرنے والا بادشاہ۔ وسط ایشیا کے لوگوں سے میل جول اور تجارتی تعلقات بڑھانے کا شدید خواہش مند تھا۔ ایسا جیالا تھا کہ کسی وزیر، مشیر یا سفیر یا ایلچی کو بھیجنے کی بجائے خود ہی کوسوں میل کا سفر طے کر کے ایک بڑے قبیلے کے پاس جا پہنچا۔ انہوں نے دشمن جان کر قید میں ڈال دیا۔ کئی سال قید میں رکھا۔ بیگار لی۔ پھر آزاد کر دیا۔

اپنی بادشاہت میں واپس آنے کے بعد اُس نے اپنے درباریوں کو اُس دُنیا کے عجیب وغریب قصے سُنائے۔ اُن خوبصورت گھوڑوں کا ذکر کیا۔ جن کو وہ رشک سے دیکھتا تھا۔ عرب شہہ سواروں اور اُن کی دلیری و وجاہت کی کہانیوں نے درباریوں کو بھی اُکسایا کہ وہ اُن سے میل جول شروع کریں۔ گھوڑے خریدیں۔ بعد میں تو پھر لام ڈور شروع ہوگئی۔ سکندر اعظم کو بھی قرار نہ تھا۔ رومنوں کو بھی دنیا پر چھا جانے کی بڑی تمنا تھی۔ علاقے فتح کرنے، ان پر قبضہ گری، لوٹ مار کے بازار گرم کرنے اور قتل و غارت کے سلسلے بھی اسی کے ذریعے ہوئے۔ یہ بھی ایک منفی اثر ہوا۔ مگر اِس منفی اثر کے تعاقب میں مثبت پہلو کتنے زیادہ تھے۔ ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔

قازقستان کا تو بہت نمایاں کردار ہے اِس شاہراہ کے لیے۔ الماتے تو عین شاہراہ پر ہی واقع ہے۔ اور جانتی ہو۔ الماتے کا چین کی جنگ آزادی کے لیے کتنا بڑا کردار ہے۔ 1941 میں چین حب الوطنی کی عظیم جنگ لڑ رہا تھا۔ ایک مشہور چینی موسیقار شیان شینگ حائی الماتے پہنچ گیا۔ غربت، بے کاری اور جنگ کا ستایا ہوا۔ وہ قازق موسیقار بخت شان بے کراحوف سے کہیں ملا۔ جو اُسے اپنے گھر لے گیا۔ اس کی ہر طرح دیکھ بھال کی۔ یہاں الماتے میں اُس نے مشہور شہ پارے قوم کی آزادی، مقدس جنگ، اور پورا دریا سرخ ہو جیسے نغموں کی دھنیں بنائیں۔ اِن نغمات نے لوگوں کو فاشزم کے خلاف مل کر

جدوجہد کرنے پر اکسایا۔ ایک امنگ اور حوصلہ دیا اور انہوں نے جنگ جیتی۔ آج چین جہاں کھڑا ہے اس میں شینگ حائی کے ساتھ قازقستان کا بھی حصّہ ہے۔

سیاہی میں لت پت شفاف سڑکیں، ان پر چلتی سرخ بیر بہوٹی کے رنگ کی ڈبل ڈیکر بسیں، نئی گاڑیاں، کاریں، ٹیکسیاں پشت پر غرور وتکبر سے کھڑی بلند وبالا خوبصورت عمارتیں جو چیخ چیخ کر چین کے دُنیا پہ چھا جانے کی خبر دیتی تھیں۔ نکھرے ستھرے تکونی آنکھوں والے مرد وعورتیں، نوجوان لڑکیاں لڑکے سب گویا ایک سیلِ رواں میں بہتے چلے جا رہے تھے۔ ایک بج رہا تھا۔ دھوپ کے بانکپن پر ابھی بھی وہی شوخی اور تیزی تھی۔ دلکشی اور خوبصورتی عین اپنے عروج پر تھی۔ سارا ماحول میٹھے سے سرور میں ڈوبا لگتا تھا۔

وسیع وعریض پختہ، خوبصورت اور جا بجا سنگی بینچوں سے سجے میدان کے سامنے اُترے۔ مسلم کواٹر کا علاقہ۔ چندلمحوں کے لیئے ایک بینچ پر بیٹھ کر ہواؤں کی خنکی وتیزی سے لطف اٹھایا۔ اردگرد بکھرے سبزے کی دلکشی اور حسن سے آنکھوں کو سیراب کیا۔ گردوپیش کے انتہائی پُرکشش سجے سنورے چہرے کو لُطف وانبساط سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اُوپر والے سے بھی نگاہیں چار کیں۔

''اف میں یہاں ہوں۔ احسان ہے نا تیرا۔''

بیل ٹاور بھی سامنے نظر آتا تھا۔ اس کی شان بھی نرالی سی تھی۔ رنگوں میں سرتاپا لتھڑا ہوا۔ شی آن کی مرکزی جگہ کا لینڈ مارک جیسے فیصل آباد کا گھنٹہ گھر ہو۔ اس کے پاس ہی بس ایک چھلانگ پرے ڈرم ٹاور بھی ہے۔ دونوں کی تاریخ بھی کس مزے کی ہے۔ بنے تو دونوں وہی منگ سلطنت کے زمانوں میں ہی ہیں۔ پر دونوں کا کام کاج بڑا مزے کا تھا۔ صبح سویرے لوگوں کو جگانے کا کام ہمارے ہاں کے مرغوں کی طرح بیل ٹاور سے لیا جاتا اور رات ہونے پر ڈرم پیٹا جاتا کہ اچھے چینی بچو چلو اب جاؤ اور سو جاؤ کہ سویرے تڑکے اُٹھنا

ہے۔

یہ شی آن کی مرکزی جگہ تھی اور ہوٹل قریب ہی تھا۔ بھوک کچھ اتنی زیادہ نہ تھی۔ بہتیری منہ ماری ہوتی رہی تھی۔ مگر نیت میں فتور تھا۔ پیٹ میں جب تک نان ٹائپ اناج نہ جائے ہم گنواروں کو صدق ہی نہیں آتا۔ مگر اس سے بھی پہلے مسجد جا کر سجدہ دینا تھا۔ جو روٹی سے بھی زیادہ اہم تھا۔ ہم بنجاروں کے پاس سامان کہاں تھا؟ سوچا ظہر کو کھونا حماقت ہے۔ پس مسلم کواٹر میں دوڑتے بھاگتے داخل ہوئے۔ دورویہ سجا بازار بڑا رنگیلا سا تھا۔ بازار خواہ بڑے ملکوں کے ہوں۔ بڑے یا چھوٹے شہروں کے ہوں۔ چھوٹے ملکوں کے بڑے اور چھوٹے شہروں کے ہوں ہمیشہ رنگین ہی ہوتے ہیں۔ بس کہیں ماڈرن ازم اور کہیں جٹکے پن کے تڑکوں کی رنگینیوں سے اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں۔ سچی بات ہے یہ ایسی رنگ رنگیلی دُنیا تھی کہ جہاں کان پڑی آواز سُنائی نہ دے۔ ہاکروں کی زوردار آوازیں اور کھینچا تانی کی سرگرم کوششیں اپنے عروج پر تھیں۔

دو چینی لڑکیوں نے روکا کہ اُن کی دکان میں آکر خریداری کریں تو انہیں ہاتھ کانوں تک لے جا کر نماز کا تمثیلی اشارہ دیا کہ فارغ ہو کر آتے ہیں۔ ہونٹوں کی براچھیں گالوں تک پھاڑ کر تکونی آنکھوں میں ہنسی بکھیر کر انہوں نے فوراً فوراً ہاتھوں سے گلی کے موڑ کی طرف اشارے دیئے۔

''یہی غالباً بنیامن سٹریٹ ہے۔'' خود سے کہتی ہوں۔ اب رک کر پوچھنے کا وقت نہیں چلو چھوڑو یہ نہ ہوگی تو کوئی اگلی پچھلی ہوگی۔ کتابچے میں جب یہ نام پڑھا تھا تو بڑی پرانی شناسائی نے آواز دی تھی۔ حضرت یوسف کا دلارا پیارا بھائی بنیامین۔ معصوم سا جس پر چوری کا الزام لگا کر شاہ مصر نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ مولوی غلام رسول کی یوسف زلیخا کے طویل پنجابی کلام کا یہ حصّہ جسے ہماری اماں بڑے ترنم سے پڑھا کرتی تھیں۔ اسرائیل کے وزیر

اعظم نیتین یا ہو کا نام بھی جب اِس بنیا مین کے ساتھ جڑا ہوا سُنا تو یاد آیا۔

''ارے بھئی ان کی تو بڑی گوڑھی رشتے داری ہے اُن سے۔''

چلتے ہوئے پڑھی ہوئی چیزیں یاد آنے لگی تھیں۔شہر بھر میں کوئی دس مسجدیں ہیں۔ ماشاءاللہ جان کر دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ہائے کیسی روح افزا سی بات ہے۔اب شام تک یہیں رہنا ہے۔چلو پھر عصر اور مغرب دونوں ایک وضو سے بھی ادا ہو جائیں کوشش کرنی ہے۔اتنی ٹھنڈ میں وضو کرنا کون سا آسان کام ہے؟ یہ علاقہ مختلف بیرکوں پر مشتمل ہے اور جہاں کوئی 2000 کے قریب لوگ آباد ہیں۔سب سے بڑی اور اہم بات کہ ریاست کی چھتر چھاؤں میں سانس لیتی ہے۔اور اپنی پور پور میں اس کے روایتی، اپنی مذہبی نشانیوں اور علامتوں کے ساتھ جیتی ہے۔

بلند و بالا محرابی دروازے سے مسجد کے احاطے میں داخلہ ہوا۔دائیں ہاتھ پھیلے دکانوں کے سلسلے اور بائیں طرف سبز ڈھائی تین فٹ اونچی باڑوں میں گھری جگہ چھوٹے چھوٹے لانوں میں اور راہداریوں میں بٹی ہوئی تھی۔کسی دوسرے ملک کی مسجد میں سجدہ دینے میں ہمیشہ میری جذباتیت تو جیسے عروج پر ہوتی ہے۔اسوقت بھی یہی حال تھا۔ہونٹوں پر اس کی واحدانیت کا ورد تھا۔شکر یہ تھا اور آنکھیں آوارہ گرد چھوکروں کی طرح گھومتی پھرتی تھیں۔دوسرے کورٹ یارڈ کی داخلی عمارت کی پیشانی کلمہ طیبہ سے چمک رہی تھی۔رُک گئی تھی۔میرا اللہ تو واحد ہے اور لاشریک ہے۔کافروں کے دیس میں یہ بات کہنی تو بنتی تھی نا۔سو کہی اور آگے بڑھی۔

تیسرے کورٹ یارڈ کی گزرگاہ شاہکار تعمیر کے زمرے میں آتی ہے۔چینی فنِ تعمیر کا حُسن اس کے پگوڈا اسٹائل شیڈ، دائیں بائیں جھانکتا سبزہ اور چھدرے درخت۔یہیں ایک جانب تین منزلہ پگوڈا بھی کھڑا تھا۔اپنے نوکیلے پر پھیلائے قدامت اور پُر اسراریت کا

حسن لیئے۔اس نے مجھے اندر جانے پر مجبور کردیا تھا۔سو گئی اُسے دیکھا، سراہا اور باہر نکلے۔ چوتھے صحن میں وسیع وعریض مسجد تھی۔جس میں مینار نہیں تھا۔

تو اب ایک ایسی قدیم ترین عبادت گاہ میں داخل ہونے جارہی تھی جو اپنے وجود کے ساتھ بڑی ہونے کی بھی دعوے دار ہے۔جس کی تعمیر میں عرب اور چینی ثقافتوں کا آمیزہ گندھا ہوا ہے۔ جو باہر سے ایک چینی ٹیمپل کا منظر پیش کرتی ہے مگر اندر سے اسلامی خدخال کی عکاس ہے۔ 6000 مربع میٹر پر پھیلی یہ چار صحنوں پر مشتمل جس کا ہر صحن، اس کی مختصر عمارت اپنے اندر ایک انفرادیت اور حُسن کی حامل تھی۔جسمیں تاریخی ٹچ کی خصوصیت بھی تھی۔جنہیں دیکھتے اور جنہیں سراہتے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔

باہر کرسی پر بیٹھے سر پر سفید ٹوپی اُوڑھے ایک مولانا ٹائپ بندے نے تعظیم دی اور اپنی خدمات پیش کیں۔مگر مجھے کسی کی ضرورت نہیں تھی۔ جائے وضو تلاش کرنے سے پہلے نماز ہال کو دیکھنا اور اس کے اندر بسی زمانوں کی خوشبو کو سونگھنا ضروری تھا۔اس کی چوبی دیواروں پر قرآنی آیات کی خطاطی سے بھرے من موہنے سے منظر، چوبی خانوں میں بٹی ہوئی چھت، سبز چوبی ستون جن پر عمودی صورت میں اللہ کے نام لکھے ہوئے تھے۔

اس کے سُرخ ستون، فرش کی نیلی میٹنگ جن پر بچھے سبز مخمل کے جائے نماز۔محراب کے سامنے پڑے خوبصورت مدھم رنگوں کے قالین۔اس کا سارا ماحول بڑا مسحور کُن تھا اور لُطف کی بات کہ مجھے اُن میں بلتستان کی مسجد چقچن اور شگر کی مسجد والی جھلک محسوس ہوئی تھی۔اس وقت میری آنکھیں چند لمحوں کے لیئے بند ہوئی تھیں۔موموں میں شکر گزاری کی برقی لہریں دوڑنے لگی تھی۔ اِسے دیکھنا مجھے نصیب کیا تو نے۔ سچی بات ہے میں اس وقت جیسے ٹرانس میں تھی۔

مولانا کی انگریزی اچھی تھی۔اُن کا کہنا تھا مسجد بنانے کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ

ہے۔تاجروں کا ایک گروہ ظہر کی نماز کسی شاہراہ کنارے پڑھ رہا تھا۔ بادشاہ کی سواری کہیں ادھر سے گزری۔ حیرت سے اس منظر کو دیکھا اور پُوچھا؟ یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ جاننے پر مسجد بنانے کا حکم دیا۔

شی آن میں اسلامی تاریخ کے ڈانڈے تھانگ Tang سلطنت کے زمانے سے ہی جڑتے ہیں۔پہلی تعمیر تھانگ Tang دور میں ہوئی۔تھوڑے بہت اضافے آنے والے دور میں بھی ہوئے۔ہاں البتہ منگ سلطنت کے زمانے میں اس کی وسعت اور حسن و خوبصورتی کو بہت بڑھاوا ملا۔اور یہ مسلمان تاجر ہی تھے اِن علاقوں میں اسلام پھیلانے والے، سچے، کھرے، ناپ تول اور قول و فعل میں سونے جیسے خالص۔

اسی شاہراہ ریشم پر چل کر آتے جاتے تھے۔اور یہی دور تھا جب مسلمانوں نے یہاں پکے پیر بسنا شروع کیا۔ان کا ایک قبیلہ ہئی Hui بہت مشہور ہوا۔مقامی عورتوں کے ساتھ بیاہ رچانے اور اپنے دین کے ساتھ مسلسل جڑے رہنے کے ساتھ مقامی آبادی کا حصّہ بنتے گئے۔سونگ اور یوآن Yuan حکمران بھی ظرف والے تھے۔انہوں نے تعمیر میں بھی حصّہ ڈالا اور اسے نکھار بھی دیا۔

اور جب وضو کے لیئے جگہ ڈھونڈی جارہی تھی۔میں نے ایک پریشان حال خاتون کو دیکھا جو جائے وضو کی تلاش میں سرگرداں تھی۔آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور پوچھا؟ شکر ہے اُسے انگریزی آتی تھی۔تنزانیہ سے تھی۔ابھی گومگو میں ہی تھی کہ ایک اور معمر خاتون حجاب میں لپٹی قریب آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگی۔

ہکا بکا سی میں اُسے دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ جیسے خود کو گھسیٹنے لگی کہ وہ تو جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔تیسرے صحن سے دوسرے پہلے اور پھر وہ ہم ماں بیٹی کو داخلی دروازے سے گزار کر باہر گلی میں لے آئی۔حیران پریشان سی میں رک گئی۔

اس نے میرے چہرے پر پھیلے تشویش بھرے اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو کانوں کے پاس لے جا کر نماز کی تمثیلی صورت کا اشارہ دیا۔ یہ مناسب سی کشادگی والی گلی تھی جو مسلم علاقے کی نمائندگی کرتی تھی کہ صفائی ستھرائی کا حال خاصا پتلا تھا۔ دستی ریڑھیاں، ایک دو چنگ چی اور رکشے جیسی سواری بھی نظر آئی۔ مکان سہ اور چہار منزلہ ضرور تھے مگر تناسب اور حسن کی کمی کا شکار تھے۔ سڑک پر چلتے پھرتے لوگ بھی بس ماٹھے سے ہی نظر آئے تھے۔

میرا ہاتھ ابھی بھی اُس مہربان سی دکھنے والی خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ وہ گلی مڑی۔ بمشکل پانچ مرلہ کے ایک دومنزلہ گھر میں داخل ہوئی۔ اندر روح کی گہرائیوں میں اُتر جانے والا ایک مسحور کن منظر تھا۔ یہ خواتین کی مسجد تھی۔ نیچے کا حصّہ وضو کے لیئے تھا جہاں کتنے ہی اجنبی چہرے ماربل کی سلیب پر بیٹھے وضو کرتے تھے۔ من موہنی سی لڑکیاں پاؤں میں موزے پہن رہی تھیں۔ ایک ہاتھوں میں کولڈ کریم لگا رہی تھی۔

برآمدے میں جتنی عورتیں تھیں انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی پیار بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر ہم انجان سرزمین کے ہم ملت باسیوں کو خوش آمدید کہا۔ ہم نے کوٹ اُتارے۔ وضو کیا۔ ایک پیاری سی لڑکی نے تولیہ پیش کیا۔ دوسری نے کریم دی۔ اوپر سیڑھیاں چڑھے۔ سامنے مُو مُو کو بھگوتا ایک اور ایمان آفروز منظر تھا۔

کمرے میں کوئی پچیس تیس کے لگ بھگ عورتیں ہوں گی۔ ہر عمر اور سائز کی۔ چند نماز کی اقامت وسجدہ کی حالتوں میں۔ کچھ ذکر میں مشغول تھیں۔ انہوں نے میٹھی سی مسکان آنکھوں اور چہروں پر بکھیر کر پذیرائی کی۔ پیٹرز برگ کی نیلی مسجد یاد آئی تھی۔ ملتا جلتا ہی منظر تھا۔ ''اللہ اکبر'' کہہ کر ہم وحدانیت کے اُس دھارے میں شامل ہو گئے جو وہاں بہہ رہا تھا۔ سپردگی اور کیف کی مستی تھی جو انگ انگ میں دوڑ رہی تھی۔ آنسوؤں کی یلغار تھی جو

گالوں پر بہہ رہی تھی۔ ممتا اگر بچوں کی سلامتی کے لیے دعا گو تھی تو حب الوطنی وطن کی زبوں حالی پر شکوہ وگریاں کناں تھی۔

بات چیت کا کوئی ماحول نہیں تھا کہ زبان یار من تر کی و من تر کی نمی دانم والی بات تھی۔ انہیں غیروں کی زبان سے رتی برابر آشنائی نہ تھی۔ بس مسکراہٹیں تھیں یا آنکھوں سے پھوٹتے کچھ پیار بھرے پیغام۔ درود کی محفل سجی تو شامل ہوئے۔

عمران کا فون تھا پُو چھ رہا تھا۔ ہم کہاں ہیں؟ مسجد کے مرکزی دروازے پر آنے کا کہا۔ جب رخصت ہو کر سڑک پر آئے۔ تو دھوپ بس ''خدا حافظ کل ملیں گے یہیں''، کہہ رہی تھی۔ ''ارے کہاں میری جان کل تو جانے تم کن کن کو اپنی طلائی کرنوں میں نہلا رہی ہو گی اور ہم جانے کہاں ہوں گے۔'' سوچا ہائے مغرب بھی پڑھ لیتے۔ وہاں کھڑکیوں پر اتنے دبیز پردے تھے اور موبائل پر وقت دیکھنے کا مجھ اوندھی کو خیال ہی نہیں آیا۔

بہر حال چلو خیر اِس اجنبی سرزمین پر اُسے سجدہ تو کیا نا۔ مگر کیسی ناشکری عورت ہوں۔ پل نہ لگا اندر سے میری الٹی پلٹی منطقی دلیلوں والی فطرت نے تردید بھی کر دی۔

''بھئی مسجد ضرور تھی مگر چوبارہ تھا۔ ماتھا زمین پر تو ٹکا نہیں۔''

اِس سے پہلے کہ میرا شکی ذہن اِس بحث مباحثے کی لڑائی میں کودتا۔ میں نے فوراً کہا۔ ''لعنت ہے تم پر۔ دل کو دیکھو اس نے سجدہ دیا۔ آنکھوں سے پوچھو اس نے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا۔ اگر دونوں کام خوش اسلوبی سے ہوئے تو بس پھر سیتئے خیراں اور اگر یہ سب نہیں ہوا تو پھر فائدہ۔ ماتھا لاکھ زمیں پر ٹکریں مارتا پھرتا۔''

چلو اب مسلم کوارٹر کی رنگینیوں سے قلب و نظر کی تسکین اور دہن کی تواضع کرتے ہیں۔ خدایا رات کی روشنیوں میں اِس کے منظروں کی دلربا ئی بڑی جداگانہ رنگوں کی حامل تھی۔ لگتا تھا جیسے کائنات بُقعہ نور بنی ہوئی ہے۔ کہیں اُمنڈتے، کہیں سیدھے کھڑے

درختوں کی ٹنڈ منڈ شاخیں جو بہار کے نئے پتوں اور شگوفوں کو خوش آمدید کہتی سچ مچ ایک ہوش رُبا منظر کی گواہ تھیں۔چہل پہل والی آوازوں، رنگا رنگ پکوانوں کی خوشبوؤں، چینی چہروں کی مسکراہٹوں اور زور وشور سے بلاوے حلال حلال، مسلمان، الحمد اللہ جیسی آوازیں بڑی رومانیت لیے ہوئے تھیں۔بڑی بڑی بانس سے بنی ٹوکریوں میں خشک میوے سجے تھے۔شیشے کے مرتبانوں اور جاروں میں نہ جانے کیا کیا کچھ نظر آتا تھا۔گرما گرم تلوں بھرے نان۔شعلے اگلتے چولہوں پر چڑھی کڑاھیوں میں جانے کیا کچھ تلا جارہا تھا۔سارے میں شاں شاں شوں شوں کی آوازیں سماعتوں سے ٹکراتی تھیں۔

فاطمہ، خدیجہ مریم نامی بھرے بھرے چہروں والی نوجوان لڑکیاں سروں پر شیف ٹوپیاں اوڑھے چیزیں بیچتی تھیں۔کہیں حجاب سے سر ڈھانپے چولہوں پر جھکی پتیلیوں میں چمچ ڈویاں چلاتی تھیں۔بڑے بڑے پتھروں والی گلیوں میں چلنا مزہ دے رہا تھا۔موسم بہت ٹھنڈا تھا۔مگر لوگوں کے ہجوم چکا چوند روشنیوں اور لذیذ پکوانوں کی خوشبوئیں پاگل کیئے دے رہی تھیں۔دفعتاً مجھے اسی مسلم کواٹر پر لکھا ہوا ایک مضمون یاد آیا تھا جو آنے سے کچھ ہی دنوں قبل پڑھا تھا۔ایک ہزار سال پرانے Hui قبیلے کے لوگ جو یہاں آئے اور پھر یہیں بس گئے۔اُن کی آل اولاد ابھی بھی اسی مارکیٹ میں سوئنیرز کے کام سے جڑی ہوئی ہے۔دوسرا بنیا من سٹریٹ تھی۔اب Hui لوگوں کی دکان ملی نہیں۔ہاں البتہ جب ہم گلیوں میں گھومتے پھرتے تھے تو دفعتاً انگریزی میں بڑا سا لکھا ہوا نظر آیا۔ Welcome to B Islamic Street اور جب یہ مجھے نظر آئی تو میری کیفیت کچھ ایسی ہی تھی جیسے اِس فوڈ سٹریٹ میں اپنا انار کلی والا بانو بازار نظر آجائے۔

بھوک نے کچھ غل غپاڑہ مچانا شروع کردیا تھا۔کیا کھانا ہے؟ چلتے جاتے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھتے جاتے ہیں۔بھئی کباب تو ضرور کھانے ہیں۔عمران قیمہ بھرا

Roujiamo بند کھانا اور کھلانے کا خواہش مند تھا۔

سعدیہ نے کہا۔ ''نسرین نے تاکید کی تھی فوٹ پائی شی آن کا تحفہ ہے۔اس سے لُطف اندوز ہونا نہیں بھولنا۔'' بالآخر ہم نے ایک میز پر فی الفور قبضہ کرنے کی کوشش کی جو ہمارے دیکھتے دیکھتے خالی ہوئی تھی۔کباب بس ٹھیک تھے۔ہاں نان مزے کے تھے۔ذائقے میں بھی اور صورت میں بھی۔ڈرنک سبھوں نے اپنی اپنی مرضی کے لیئے۔دفعتاً کہیں میرے اندر ایک خیال نے انگڑائی لی تھی۔جی چاہا تھا کہوں کل ہفتہ ہے عمران کی چھٹی ہے۔رات یہاں کسی ہوٹل میں گزار لیں۔ایک تو تھکن بہت زیادہ ہوگئی ہے۔نیند آنکھوں میں بھرنے لگی ہے۔اناج نے پیٹ میں جاتے ہی خمار چڑھا دیا ہے۔جی چاہتا ہے یہیں کہیں لم لیٹ ہوجائیں۔صبح وہاں جائیں اور اس جگہ کو دیکھیں جہاں سے اِس شاہراہ ریشم کا آغاز ہوا تھا۔وہ صحرا جن کی تصویریں ہی دیکھی ہیں۔

مگر سب کچھ دل میں ہی رہا۔کہہ نہیں پائی۔بہت خرچ ہو رہا تھا میرے اوپر۔

اٹھے تو سچی بات ہے اب چلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔تاہم ہمارے پاس ابھی تین گھنٹے تھے۔دل کہیں اُس پرانے وقتوں کی سلک مل جانے کا بھی متمنی تھا۔سکارف،سٹول کوئی سونیئر۔ذہن میں پیاروں کے بھی کئی نام تھے۔کچھ سستی چیزیں جو سوغات کے طور پر انہیں دے سکوں۔سچی بات ہے شاپنگ کبھی میرا کریز نہیں رہا۔مگر یہ چین تھا سستا ترین اور مہنگا ترین۔بازار میں جب خریداری کی نظر سے پھرے تو احساس ہوا کہ یہ شی آن بہت سستا ہے۔دیوارِ چین کا جو سونیئر پچاس یوآن کا بیجنگ سے خریدا تھا وہ یہاں 35 کا ملا۔دو خرید لیئے۔کچھ چھوٹی موٹی چیزیں اور لیں۔

دس بجے ہم اسٹیشن پر تھے۔رش کا وہی عالم تھا۔سیٹ پر سر رکھتے ہی میں تو نیند کی وادی میں اُتر گئی۔وادیاں جہاں کہیں دن بھر کے دیکھے گئے منظر تھے۔جہاں تصوراتی اور

خیالی دنیا کے وہ پیکر تھے جنہیں پچھلے چند دنوں سے دیکھتی تھی۔قدیم تاریخ سے لبالب بھرا ماحول جس نے جٹ جچھی ڈالی ہوئی تھی۔دھان کے کھیتوں کے سلسلے سورج کی کرنوں میں چمکتے ،نگاہوں کو لبھاتے، چمکتے سبزے سے ڈھنپی پہاڑیوں پر اُگے بانسوں کے جھنڈوں بھرے جنگل،سورج کی سنہری رنگت سے مشابہ گاوں کہ مٹی اور تنکوں کی آمیزش سے ایک اپنایت بھرے تاثر کا حامل ماحول بڑا مانوس سا منظر جو اکثر و بیشتر یادوں اور خیالوں میں ابھرتا تھا۔کہیں صحراؤں میں بھٹکتی پھرتی،کہیں حیرت زدہ سی قافلوں کے اونٹوں کی گھنٹیوں کی مترنم آوازیں سُنتی ۔اور جب سعدیہ نے جنجھوڑ کر اٹھایا کہ ہم بیجنگ پہنچ گئے ہیں۔

اف میرے خدایا۔میں نے حیرت سے اپنے اردگرد بکھری دنیا کو دیکھا۔رات کے تین بج رہے تھے۔اسٹیشن کی رونقوں اوراس کی جولانیوں میں مجال ہے ذرا سی بھی کمی و بیشی ہوئی ہو۔دن اور رات کے تصور کی یہاں نفی ہورہی تھی۔باہر وسیع وعریض صحنوں کی دُھلائی زوروشور سے جاری تھیں۔موٹی تازی ایک خاتون اونچے اونچے بولتی جارہی تھی۔کیا بول رہی تھی۔پوچھنے پر عمران نے بتایا تھا۔شوہر کی گالیوں سے تواضع کررہی ہے۔اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔بجائے مدد کرنے کے وہ سو گیا اور اب اُسے دہری فٹیک پڑی ہوئی ہے۔چار بجے چیکروں کی ٹیم نے آجانا ہے۔تین خوبصورت نوجوان لڑکیاں سڑک پر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ہم بھی دیدی کے انتظار میں تھے۔میں سوچتی تھی۔ترقی کے لیے پہلی ناگریز ضرورت امن کی ہے۔کوئی خوف وخطرہ ہے اِن لڑکیوں کو۔میرے دیس میں کسی سر پھری نے ایسی کوئی ایکٹویٹی کرلی تو بس پھر درندوں کے ہتھے ہی چڑھی۔اور خیر سے لوگوں کا شوروغوغا مجرموں کی گرفتاری پرنہیں اس پر بحث کرے گا کہ وہ رات کے وقت نکلی کیوں؟

☆☆☆

باب نمبر:۱۳ پرانے بیجنگ کے کھانے، فوڈ سٹریٹ کی رونقیں، وانگ فوجنگ سٹریٹ

- وانگ فوجنگ سٹریٹ بیجنگ کی شانزے لیزا ہے۔
- نامور مصنف زاؤ کیان کو بیجنگ سے دوری پر ہمیشہ ڈونکی رولز یاد آتے تھے۔
- بہائی Beihai پارک کے ساتھ ایک سو ایک سلسلے جڑے ہوئے ہیں۔

سچی بات ہے اگر پرانے شہر کے کسی باسی سے یہ پوچھا جائے کہ قدیم بیجنگ کی سب سے زیادہ ناقابلِ فراموش بات کونسی ہے؟ تو پتہ ہے وہ کیا کہے گا اور کیا کرے گا؟

پہلے تو وہ ہنسے گا اور پھر منہ اور ہاتھ سے ایکشن کر کے بولے گا۔

''ہمارے کھانے''

چند لمحوں بعد وہ مخاطب کی آنکھوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی ساری چمک انڈیلتے ہوئے بولے گا۔

''واہ واہ جواب نہیں چینی کھانوں کا۔ ہمارے کھانے جن میں زمانوں کی تہذیب اور کلچر رچا ہوا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن میں ہونے والی تبدیلیوں نے کیسے کیسے اُن کی ہیت اور ذائقوں کے سواد میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔''

آج میرے ساتھ سعدیہ تھی۔ ہمیں سویرے ہی عمران یہاں وانگ فوجنگ Wangfujing ایریا میں ڈراپ کر گیا تھا۔ مجھے کچھ کتابیں دیکھنا تھی۔ اِس مرکزی حصے

میں کتابوں کی بہت بڑی دُکان تھی۔ یہ فارن لینگوا یج تھی۔ چار پانچ فلور پر مشتمل۔''اف اتنی جدید کہ بندے کی آنکھیں پھٹ پھٹ جائیں۔''

یا تو میں اناڑی تھی۔مگر سعدیہ نے بھی بہت ٹکریں ماریں۔مگر سارے میں چائنا ہی بھرا ہوا تھا۔انگریزی کے سیکشن کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔جب پتہ چلا اور چھان پھٹک کی تو احساس ہوا بڑا نامانوس سا لٹریچر ہے۔ سچی بات ہے میرے تو خاک پلے نہ پڑا۔کچھ ایسا ہی حال سعدیہ کا بھی تھا۔حالانکہ وہ انگریزادب میں ماسٹرز ہےاورادب شناس بھی ہے۔

فوڈ مارکیٹ جو قریب ہی تھی وہاں آ گئے۔

اب دو ڈھائی گھنٹے کی ذہنی وجسمانی مشقت کا نتیجہ صفر بٹہ صفر ہو تو پھر ڈپریشن کا ہونا تو لازمی ہے۔اسے دور کرنے کے لیے منہ ماری کو جی تو چاہتا ہے۔اور مزے کی بات کافی بار بھی دو چھلانگ کے فاصلے پر ہو۔بیجنگ آ کر میں نے بلڈ پریشر کے خوف کو دل سے نکال دیا تھا۔بار کے اندر کا ماحول بڑا نگھا اور رونق سے بھراپُرا تھا۔اونچی سی کرسی پر بیٹھ کر چند گھونٹ تو بھر لیے پھر جی باہر نکلنے کو مچلنے لگا۔دس بج رہے تھے اور بازار کی رونقیں جوان ہونے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

ہمارے سامنے وانگ فو جنگ کی فوڈ سٹریٹ تھی۔ سچی بات ہے دل نے کہا تھا۔

''واہ کیا بات ہے اس فوڈ سٹریٹ کی۔'' محرابی دروازوں کی کوئی آرائش وزیبائش تھی۔ ہمارے ہاں ٹرکوں کو سجانے سنوارنے میں جو رنگ ریزی کا کام ہوتا ہے کچھ اسی نوع کی آرائشی پٹیاں ان کے منہ ماتھوں اور اجسام کے بقیہ حصّوں پر لشکارے مارتی تھیں۔اتنا تام جھام کہ بندہ تو منہ کھولے حیرت سے دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔بازار اندر ہی اندر اسی طرح کے محرابی دروازوں کے عقب میں پھیلتے چلے گئے تھے۔دروازوں میں فیروزی اور زہرمہرہ رنگ زیادہ نمایاں تھا۔جبکہ کھانے پینے کی دکانوں میں سرخ رنگ چمک رہا تھا۔

چونکہ صبح تھی اس لیے دھلائی صفائی کا کام زوروں پر تھا۔ میزوں کی صفائی ، کرسیوں کی جھاڑ پونچھ، فرش اور گلی کی دھلائی۔ہم بھی آگے بڑھتے گئے۔ سوونیئرز کی دکانوں میں رش تھا۔ایک میں گئے پھر دوسری میں جھانکا۔سامان ابل رہا تھا۔اتنی ورائٹی کہ مت ہی ماری جائے۔پانچ پانچ یوآن کی چینی آرٹ کی شاہکار ہلکی پھلکی جیولری رکھنے کی دلکش ڈبیاں خریدیں۔جس گلی میں ہم کھڑے تھے ان میں مسلم ریسٹورنٹ دو تین تھے۔Donglaishan مسلم ریسٹورنٹ اپنے ہاٹ پاٹ مٹن کی ڈش کی وجہ سے دور نزدیک خصوصی شہرت کا حامل ہے۔سعدیہ یہاں کھانا کھا چکی تھی اور چاہتی تھی کہ ہم ابھی سیر سپاٹا کریں اور دوپہر کا کھانا یہاں کھائیں۔

آپ بھول جائیں گی لاہور کی مٹن کڑاھی کو۔ایک تو مٹن کا انتخاب بہت احتیاط سے کیا جاتا ہے۔کٹائی میں بھی بڑا سلیقہ طریقہ نظر آتا ہے۔ایسی نفیس ہڈی والی بوٹیاں کہ بس بندے کی پلیٹ سج جاتی ہے۔گھلاوٹ کا وہ عالم کہ بوٹی کی شکل بھی قائم اور توڑنے میں بس ذرا سا چھونے کی بات۔بوٹی منہ میں رسیلی خوبانی کی طرح گھلتی جائے۔مصالحوں کا ذائقہ آئے مگر نہ جلن اور نہ تیزابیت کی کوئی شکایت۔

''چلو تو پھر آج ہاتھ کنگن کو آرسی کرتے ہیں۔رکنا ہے اس وقت تک کہ جب تک کہ اِس ذائقے سے قلب کو گرمانہ لیں۔

''چلیئے طے ہوگیا۔''اب آگے بڑھے۔بہت دور تک آہنی نقاشی سے لتھڑی پتھڑی محرابوں کا سلسلہ چلتا گیا تھا۔ایک خوبصورت ریستوان کی سرخ کارپٹڈ سیڑھیاں چڑھ کر ہم نے تصویر کشی کی۔اور مڑے۔وانگ فوجنگ سٹریٹ بڑی شہرت کی حامل ہے۔کہہ لیجیے یہ پیرس کی شانزے لیزا ہے۔کہہ لیجیے کہ بیجنگ کی گوالمنڈی ہے۔ڈاؤن ٹاؤن ہے اس کا۔یہاں بہترین ڈیپارٹمنٹل سٹورز ہیں جن کے اندر ایک پوری دنیا آباد

ہے۔تاریخ بھی پرانی ہے۔منگ اور Qing سلطنتوں کے زمانوں کی۔بس سرگرمیاں تھوڑی فرق تھیں۔تب شہزادیوں کی رہائش گاہیں اوراشرافیہ کی کاروباری سرگرمیوں کا مرکز تھیں۔کہیں میٹھے پانی کا ایک کنواں بھی دریافت ہوا جس نے علاقے کی اہمیت بڑھا دی ۔ہم نے دھیرے دھیرے چلتے چلتے دل کش عمارتوں اور گھومتے پھرتے خریداری کرتے لوگوں کو دیکھا۔

سعدیہ سینٹ جوزف چرچ بھی دکھانا چاہتی تھی جو کہیں آگے جا کر تھا۔

''نہیں بھئی بس اب چلو جہاں کھانا کھلانا ہے۔بہتیرا گھوم لیا۔''

اب Dong Loishun کے شاندار ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔مسلم ریسٹورنٹ جسے حئی Hui لوگ چلاتے تھے۔میں نے پاؤں جوتوں میں سے نکال کرانہیں ذرا آرام دینے کے لیے موزوں جگہ پر ٹکاتے ہوئے سعدیہ کو سنا جو کہتی تھی۔یہاں چند اور ڈشز بھی کلاس کی تیار ہوتی ہیں۔مٹن کے قیمے سے پیسٹریز بھی کمال کی بنتی ہیں۔تازہ لے کر جائیں گے۔فروٹ سے بننے والی میٹھی پیسٹریاں بھی بہت مشہور ہیں۔جو منہ سے نہ اُتریں۔ کسی اور دن آپ کو ایک اور ریسٹورنٹ دکھاؤں گی جہاں باربی کیو بنایا جاتا ہے۔مزے کی بات جس آگ پر یہ باربی کیو بنتا ہے۔اس کی لکڑی بھی کوئی عام نہیں۔بڑی خاص الخاص ہوتی ہے۔کھجور،صنوبر اور سرو کے پیڑوں کی جو ایندھن کے طور پر جلائی جاتی ہے۔

''تم نے چوب اسٹکس سے کھانا کھانا سیکھا ہے۔''

''کہاں سعدیہ ہنسی۔ہمارے بس کی بات نہیں۔اُن کی تو مہارت اور سٹائل دیکھ کر یہی جی چاہتا ہے کہ کھانے پینے پر تو لعنت بھیجو۔بس انہیں ہی دیکھتے رہو۔

پھراس نے حال ہی میں ہونے والا ایک قصہ سنانا شروع کردیا۔

یہیں کہیں ایک اور ریسٹورنٹ ہے نام شاید فینگ شان Fanshan ہے۔کوئی دو ہفتے پہلے ایمبسی کے ایک فنکشن میں مسٹر و مسز احمد سے ملاقات ہوئی تھی۔متمول پاکستانی بزنس کلاس جوڑا ہے اور نت نئے تجربات کرنے کا بڑا شوقین ہے۔جھینگے پینگھے ،کیکڑے میکڑے،گھونگے مونگھے،سمندری ککڑی مکڑی سب پر دانت تیز کرنے کا بہت شوق ہے۔اولڈ بیجنگ کا بھلا کون سا ریسٹورنٹ ہے جس کے بارے انہیں علم نہ ہو اور جہاں جا کر انہوں نے اِن کھانوں پر طبع آزمائی نہ کی ہو۔تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں کہ بس ایک دفعہ جا کر تو دیکھو قسم سے۔اس کا مالک شاہی گھرانے کا باورچی تھا۔کھانوں کے رنگ ،خوشبو اور ذائقے پر اس نے اتنی توجہ دی ہے کہ یقین کرو ایک ایک ڈش ڈونگا بولتا ہے کہ اصلاً نسلاً شاہی ہوں۔ریسٹورنٹ کی سجاوٹ دیکھ کر بھی مزہ آجاتا ہے۔

سبھی خواتین ہنس رہی تھیں۔درمیان میں کسی نے لتاڑ بازی بھی کی۔

''بھئی خدا کا کچھ خوف کرو۔کیوں زمین آسمان کے قلابے ملا رہی ہو؟ ہمیں بھی یہاں رہتے ہوئے تین چار سال تو ہونے کو ہیں۔ہمیں تو ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔''

''دراصل تم لوگوں نے بس ایک رائے قائم کر لی ہے۔مائنڈ سیٹ بس اسی پر سوچنے لگا ہے۔یقین کرو اِس ریسٹورنٹ میں کوئی لگ بھگ سو کے قریب کھانے کی اقسام ہیں۔خیر میں نے تو چند ایک ہی چکھی ہیں۔باقی کا تو سنا ہی ہے کہ کس اہتمام سے پکتی ہیں۔''حقیقت یہ ہے کہ قدیم شہر میں شاہی خاندان کے رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے بھی کھانوں کی تہذیب نے ایک مسلسل ارتقائی عمل کو تخلیق کرنے میں مدد دی ہے۔''یہ سب باتیں دلچسپ بھی تھیں اور مزے کی بھی۔ایسا ہی ہوتا ہے کچھ لوگ اجنبی جگہوں اور اجنبی کھانوں سے بڑی جلدی مانوس ہو جاتے ہیں۔جیسا کہ ہم اکثر سنتے ہیں کہ گورے ہمارے تیز مرچوں والی کڑاہی کو چسکے لے لے کر کھاتے ہیں۔اِدھر سے ناک بہہ رہی ہے اُدھر سے

سے آنکھوں سے پانی۔ پر مجال ہے جو کھانا چھوڑ دیں۔سوں سوں کرتے جاتے اور لقمے پر لقمہ لیے جاتے ہیں۔

کچھ ہی دنوں بعد جب میں پرانے بیجنگ پر ایک تحریر پڑھ رہی تھی۔چین کے ایک مشہور مصنف زاؤ کیان Xiao Qian کی تحریر نے بہت متاثر کیا۔جس نے کم وبیش دس سال کا عرصہ بیجنگ سے دور چین کے مختلف شہروں میں گزارا تھا۔

اکثر تنہائی میں جب اُسے بیجنگ کی یاد ستاتی وہ خود سے سوال کرتا۔

بیجنگ کی کیا کیا چیزیں یاد آتی ہیں؟ ارے سب سے زیادہ تو یہ اسنیکس ہی تڑپاتے ہیں۔سیاہ گندم سے بنا ہوا کیک بھی تو میری کمزوری ہے۔اس کا تصور ہی منہ میں پانی لے آتا ہے۔خمیر شدسویا بین دودھ یہ یقیناً دہی ہوگا۔میں نے پڑھتے ہوئے سوچا تھا۔ڈونکی رولز کی بھی یاد اُسے ستاتی تھی اپنی محبوبہ کی طرح۔ہاں مگر ''باجرے کے آٹے سے تیار شدہ مادہ جو گرم پانی اور وہ بھی تانبے کی کیتلی میں اُبلا ہوا سے تیار کیا جاتا ہے۔''

اس کی ترکیب میں نے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ملی نہیں۔باجرے کا آٹا بہت طاقتور ہوتا ہے۔یقیناً یہ کوئی اچھی ڈش ہی ہوگی۔ہاں تیل میں تلی ہوئی قیمہ بھری آنتوں پر میں اپنی ناک سکیڑنے سے باز نہیں رہ سکی تھی۔آگے چند مزید دل کو چھونے والے جذبوں سے بھری تحریریں تھیں۔بہت سے دانشوروں کی،لکھاریوں کی،آرٹسٹوں کی جو وطن سے دور گئے اور جنہیں وطن کی ہڑک اٹھتی تھی اور جنہیں ان کے پسندیدہ کھانے نہیں ملتے تھے اور وہ اسنیکس کو یاد کرتے تھے۔انہیں روسٹ ڈک کی یاد آتی تھی۔مٹن ہاٹ پاٹ کھانے کو جی مانگتا تھا۔مٹر کے آٹے سے تیار کیک کی یاد تڑپاتی تھی۔موسم سرما میں پھیری والے کی صدائیں سننے کو کان چاہتے تھے مگر سن نہ پاتے تھے۔

اِن تحریروں کو پڑھتے ہوئے میں خود بھی بڑی جذباتی سی ہو رہی تھی۔مجھے ایک

دلچسپ سی ہنسانے والی یاد آئی تھی۔

ہم لوگ انڈیا کسی کانفرنس کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔چار پانچ دن یہی سبزیوں کی بھاجی اور پنیر پر ہی چلتے رہے۔چھٹے دن ہماری ایک خوبصورت شاعرہ، بہت خوبصورت نثر نگار، کالم نگار عمرانہ مشتاق کو گوشت کی ایک پلیٹ نظر آئی۔اس نے دھڑ کی لگائی اور چلائی۔

''ہائے میں مرجاواں بوٹی۔''

میٹھی سی یاد نے کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔سعدیہ کے پوچھنے پر اُسے بھی سُنایا۔ایک بجے فارغ ہوئے تو گھر واپسی کا تو موڈ ہی نہیں تھا۔دفعتاً مجھے یاد آیا کہ سعدیہ کو بہائی Beihai پارک دوبارہ دیکھنے اور مجھے دکھانے کا بہت اشتیاق تھا۔کشتی کی سیر کا بھی اُس نے بڑے رومانوی انداز میں ذکر کیا تھا۔جب وہ کہتی تھی اس میں بیٹھ کر بس یوں لگتا ہے جیسے آپ سری نگر کی ڈل جھیل کے شکارے میں ہوں۔میں نے دیکھا تھا اس کی آنکھیں جیسے چمک رہی تھیں۔جائے وقوعہ کا پوچھنے پر جانا کہ یہ وہیں فاربڈن سٹی کے نزدیک ہی تو ہے۔''ارے تو پھر ہم اس کی سیر سے فارغ ہو کر قریبی کسی ہوٹانگز کا بھی چکر لگا سکتے ہیں۔''میں نے مسرت بھرا چٹخارہ بھرا تھا۔

''کہاں پھر رہی ہیں آپ؟ یہ آپ کا شالامار باغ ہے کیا کہ جس کے تیسرے تختے تک بندہ بیس منٹ میں پہنچ جاتا ہے۔ارے میری پیاری اماں نہ تو اس کی جھیل کی وسعتوں کی کوئی انتہا ہے اور نہ محل باڑیوں کی۔یہ Qing سلطنت کے شاہی محلات کا حصّہ تھا اور شاہی باغ کہلاتا تھا۔بیجنگ کے قدیم ترین اور خوبصورت ترین اس باغ کا آج بھی جواب نہیں۔اب جب ساری باتیں یاد آ رہی تھیں تو پھر وہاں جانے میں کیا ہرج تھا۔وقت بھی تھا۔ہاں قریبی کسی ہوٹانگز جانے کے ارادے کو موخر کرتی ہوں فی الحال۔دراصل ہوٹانگز

کی دنیا کی دل کشی نے مجھے بُری طرح جکڑ لیا تھا۔ یہ ایک منفرد اور دل کش دنیا تھی جو بندے پر انسانی تمدّن کے جانے کتنے راز فاش کرتی تھی۔

تو پھر چلنا شروع کر دیا تھا کہ صرف پیدل چلنے کا راستہ تھا۔قدموں کے ساتھ ساتھ سعدیہ کی باتیں بھی چلتی جا رہی تھیں۔کبھی بادشاہوں کا باغ تھا یہ ۔آج عوام کا ہے، سیاحوں کا ہے، رشتے کروانے والیوں کا ہے۔محبت کرنے والے جوڑوں کا ہے۔شوہر اور بیوی کی متلاشی لڑکی لڑکے کا ہے۔اِس پارک کے ساتھ کیسی کیسی دلچسپ کہانیاں جڑی ہوئی ہیں۔کچھ ماضی کی، کچھ حال کی۔

چلو پہلے ماضی کیا کہتی ہے وہ سن لیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جادو کے تین پہاڑ تھے جن کے نام پنگالی Pangali، Yingzhou اور Fang Zhang تھے۔یہ تینوں بہائی Beihai جھیل کے مشرق میں تھے۔کِسی جگہ کے بھی پہاڑوں بارے پڑھ لیں وہ ہمیشہ دیوتاؤں اور پریوں کے مسکن ہوتے ہیں۔یہاں کے پہاڑ بھی ان کے ہی قبضے میں تھے۔بادشاہ وقت کو اِن پہاڑیوں پر ایک ایسی ہربل بوٹی کا پتہ چلا تھا جو انسان کی ابدی زندگی کا باعث بن سکتی تھی۔ایسی باتیں بادشاہوں کو تو پھر ہمیشہ ہی جنون میں مبتلا کر دیتی ہیں۔خیر سے یہاں بھی کہانی میں بڑی اپنایت اور مانوسیت تھی۔

اب فیوڈل ادوار کے بہت سے بادشاہوں کی طرح Qing سلطنت کے شہنشاہ کن Shihuang جو ابدی زندگی کے لیے مرا جاتا تھا نے بھی اسی ریت کو نبھایا اور ان پہاڑوں کا چپہ چپہ چھان مارا۔اس نے لوگوں کو اِن پہاڑوں پر بھیج بھیج کر پاگل کر دیا۔جب کچھ نہ بنا تب اس نے یہاں تین بڑے بڑے تالاب بنائے اور ان میں تین پہاڑیاں نصب کروائیں۔بس اسی نوع کے کچھ ایسے ہی کام بعد کے بادشاہوں نے بھی کیے۔ ہربل بوٹی تو

کیا ملنی تھی، اور حیات جاوداں کا شربت انہوں نے کیا پینا تھا۔ نتیجتاً دو باتیں ہوئیں۔

پہلی کہ ایسا کرنے کے پیچھے ایک عقیدے نے جنم لیا تھا کہ مختلف پہاڑیوں کے پانی اور قدیم چینی طرز تعمیر کے امتزاج سے بڑے مختلف تاثرات جنم لیں گے۔ ویسے سچی بات ہے انہوں نے جس مرضی عقیدے کے تحت جو مرضی کیا اس نے ایک حیرت انگیز اور شاندار اور منفرد قسم کا پارک بمعہ مختلف محلوں اور ٹمپلوں کے جہاں پگوڈا ٹائپ بلند و بالا سٹوپا جو اس پارک کے ہر حصّے سے کسی قطبی تارے کی مانند دکھتا ہے تخلیق ہو گیا تھا۔ یہاں پانیوں کے دہانوں پر بنے اِن پگوڈا نما عمارتوں میں لوگوں کا کچھ دیر کے لیے اترنا، سیر سپاٹا کرنا اور پھر کشتی سے کسی اور پر جا اترنا جیسا بہت پر لطف کام تھے۔

171 ایکٹر پر پھیلا یہ پارک جس کا آدھا تو پانی سے بھرا ہوا ہے۔ درمیان میں جزیرہ سا بن گیا ہے۔ وائٹ پگوڈا اس کا ایک امتیازی نشان ہے۔ اس کا سب سے خوبصورت حصہ سرکلر سٹی والا تھا۔ بیجنگ کی مرکزی جگہ میں یہ پارک اور پھر پارک کا یہ مرکزی حصّہ۔ اس کا حد سے زیادہ شاندار ہال جس میں کبھی بادشاہ بیٹھتا تھا اور فطرت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ آج عام اور ماٹھے لوگ بیٹھتے ہیں۔ مجھ جیسی عورت بیٹھی تھی۔ اس کے قیمتی پتھروں کو دیکھتی تھی۔ اس پر بکھرے پیلے اور سبز رنگوں کے امتزاج کی دلکشی کو جانچتی تھی۔ کبھی فطرت کے حسن سے آنکھ مچولی کھیلتی اور کبھی انسانی ہاتھوں کی کاریگری پر رشک کرتی تھی۔

پارک سچی بات ہے بنایا تو Liao بادشاہوں نے کوئی گیارہویں صدی میں تھا۔ خراج عقیدت پیش خدمت ہے ان کے حضور۔ تاہم بعد میں آنے والوں نے بھی اسے خوب سجایا سنوارا۔ سو ان کے لیے بھی دعائیں۔

بھلا ہو تم سب کا۔ اتنی خوبصورت یادگار چھوڑی ہے۔

مگر پارک تو میلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ چھوٹی موٹی جھیلوں میں نہیں عظیم قسم کی

بے حد وحساب فراخ دل وصورت والی میں گھرا ہوا تھا۔ جس میں چلتی کشتیوں نے اکسا اکسا کر مار دیا تھا کہ بس اب پہلا کام ہمارے اندر بیٹھنے کا کرو۔ بیٹھ تو گئے تھے۔ مگر اُس چسکے کہ چائے کا سپ بھرنا، چیز بھرے سلائس کی بائٹ لینا اور گردوپیش کے ساتھ ساتھ ذرا نیلے آسمان کے ساتھ آنکھ مٹّکا کرنا کسقدر دلچسپ شغل ہوگا جیسے احساس کی رنگینی اور فینسٹی سے محروم رہے کہ نہ کچھ کھانے کی طلب تھی اور نہ پینے کی۔

اس تک جانے کا راستہ خوبصورت تھا۔ سنگ مرمر کے نصف قوسی کنگورے دار پل پر خوبصورت ترین تاحد نظر بکھرے ٹھنڈی ہواؤں سے ہلکورے کھاتے پانیوں پر رقصاں سورج کی کرنوں کو مسرت بھری آنکھوں سے دیکھنا اور کچھ دیر کے لیے سنگی دیوار کی قربت سے جڑ کر اِس کائناتی اور زمینی حُسن کو دیکھنا سچی بات ہے بہت مسرور کن تھا۔ کشتی میں بیٹھ کر میں نے دونوں کام کیے۔ کشتیاں بھی کچھ کچھ شکارے ٹائپ تھیں۔

مجھے استنبول کے شہزادوں کے جزیرے یاد آئے تھے جہاں میں نے اور سیما نے پورا دن گزارا تھا۔ مگر یہاں طے تھا کہ ہم نے صرف چار گھنٹے گزارنے ہیں۔

اس کی نائن ڈریگون وال بھی ایک شاہکار تھی۔ مگر مجھے اِس پویلین میں جا کر ذرا مزہ نہیں آیا۔ سانپوں، بچھوؤں اور خوفناک حشرات کو جس طرح دھنک رنگوں میں پینٹ کیا گیا ہے وہ رنگوں کے حسن کی میرے خیال میں سراسر توہین ہے۔ اُن کی خوبصورتی، ان کی دل آویزی کا تعلق صرف اور صرف لطافت سے ہے جن کی دید اندر کے جذبات کو سرشاری سے نہال کرتی ہے۔ اب کریہہ، دہشت وخوف کی عکاس اِس مخلوق کو اِن میں لپیٹنے کو مجھ جیسی کیا کم وبیش بیشتر کے لیے تو ہمیشہ دہشت کا سبب ہی بنتی ہے۔ تاہم کچھ حصّے آرٹ اور تعمیر کے شاہکار تھے۔

☆☆☆

باب نمبر:۱۴ شہرِ ممنوعہ کے عشق کی پہلی کہانی

o شہرِ ممنوعہ چینیوں کے لیے ان کی عظیم، قدیم اور شاندار تاریخ کا نمائندہ ہے۔

o ماؤ کے ارشادات، تحفظات، فرمودات آج کے کاروباری چینیوں نے ایک طرف سنبھال دیئے ہیں۔

فاربڈن سٹی Forbidden city تو پروگرام میں کہیں آگے جا کر شامل تھا۔ مگر سچی بات تو یہی تھی کہ یہ سویلین گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی عورت اب اپنی خودمختاری کے راستے ڈھنڈونا شروع ہوگئی تھی۔فوجی کے سارے کاغذی منصوبوں اور پروگراموں کا تیاپانچہ کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔

یہ شہرِ ممنوعہ بھی کیا ہوگا؟ پہلی بار جب اِسے سُنا تو محسوس ہوا کہ نام میں بڑی سنسنی سی ہے۔جب پڑھا تو محسوس ہوا جیسے کوئی انگلی اُٹھا کر تنبیہ کر رہا ہو۔''خبردار ذرا بچنا۔'' کاغذ پر جب جب نظریں دوڑتیں ترکی کا شہرہ آفاق ڈرامہ عشق ممنوعہ یادوں میں آدوڑتا۔یاد ہے سارا پاکستان اس کے پیچھے پاگل ہوگیا تھا۔

یہ شہرِ ممنوعہ بھی مجھے کچھ ایسی ہی شے نظر آتی تھی۔جسے چپکے سے دیکھنے کی تمنا بار بار میرے دل میں اُبھرتی تھی۔بیٹی داماد کے بغیر۔کیسے؟ اکیلے بسوں میں نئے رنگ رنگیلے تجربات کے ساتھ رُلتے کُھلتے ہوئے۔

مگر ہائے مجبوری، وائے مجبوری۔سدا کی آپ پھدری جدھر جی چاہا منہ اُٹھا کر چل دی۔یہاں بھی رہ رہ کر ہڑک سی اُٹھتی تھی۔پر بیٹی تھی کہ سونے کے نوالے کھلا رہی تھی

اور شیر جیسی آ کھیاں گاڑے ہوئے تھی۔ پھر بھی چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ جائے والی بات تو خون میں شکر کی طرح گھلی پڑی تھی۔

بیٹی جب سودا سلف لینے کے لیے نکلی تو پیچھے خود بھی چل پڑی۔ سوچا یوں جی ہی جی میں کڑھنے سے فائدہ؟ ہمتِ مرداں مددِ خدا پر تکیہ تو کروں۔ آٹھ دس فرلانگ مشرق، مغرب، شمال، جنوب سے آنکھوں ہی آنکھوں میں آتے جاتے دوستی یاری گانٹھ چکی تھی۔

اف سارا جوش وخروش موت کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ایک کمبخت سفارتی حساس علاقہ، اوپر سے آسمان کو ہاتھ لگاتی عمارتوں کا جنگل، اسپر ستم ویرانی اور سناٹا۔ ہاں ایک ستم اور بھی بڑھاپے کا جہاں دل کچھ کچھ نہیں خاصا کمزور ہو گیا تھا۔ جوانی ہوتی تو میں نے اِن سب کو کیا خاطر میں لانا تھا۔ دھوپ بہت میٹھی سی حدت والی تھی۔ آسمان بھی بڑا نکھرا نکھرا سا تھا۔ درختوں پر بھی چھدری چھدری سی ہریالی اور شگوفوں کی ماڑی موٹی بہار رقصاں تھی۔

چلتے ہوئے میں نے عراق کا سفارت خانہ دیکھا۔ ہائے افسوس سا ہوا۔ عراق پہ لکھی ہوئی کتاب ''عراق اشک بار ہیں ہم'' ہی لے آتی۔ وہ تو ایک طرح داخلہ ٹکٹ تھا میرے پاس۔ مصری سفیر عامر مگدی کی طرح کہ ''مصر میرا خواب'' کیا اُسے بھیجی کہ اپنے قومی دن پر مصری سفارت خانے اسلام آباد میں اُس کی تقریب رونمائی پر ہی تل گیا۔ بہت سے غیر ملکی سفراء کی موجودگی میں اِس عاجز نمانی کو عزت دے کر ہی ٹلا۔ یہاں بھی شاید اندر ہی بلا لیتے۔ تھوڑی سی گپ شپ ہی ہو جاتی۔

سامنے سڑک تھی اور دھواں دھار ٹریفک جاری شاں شاں کرتی خوف زدہ کرتی تھی۔ کان سائیں سائیں کرنے اور آنکھیں پتھرانے لگی تھیں۔ کتنی دیر کھڑی سوچتی رہی۔ پھر خود سے کہا۔ یہ پنگے بازی قطعی کوئی نتیجہ خیز نہ ہوگی سوائے لا حاصل قسم کی دردسری کے۔ اوپر سے بیٹی کی پریشانی کہ ماں کہاں دفع ہو گئی ہے؟ محبت سے بھری اکلوتی بیٹی اور اگر

یہ بھی کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ گوڑی سہیلی۔اس کے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔اپنے میاں سے ایک دن چونچیں لڑانے کے بعد دل شکستہ سی چھت پر نم آنکھوں اور دل گرفتہ سی صورت لیے بیٹھی تھی۔جب سامنے والی چھت پر مہربان سی ہمسائی کا چہرہ کسی صحرا میں نخلستان کی طرح نمودار ہوا۔حال احوال پوچھا تو جان گئی۔میٹھی سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیر کر بولی۔

''گھبراؤ نہیں بس تھوڑا سا وقت ہے۔بیٹی بڑی ہو جائے گی تو تمہاری سہیلی بن جائے گی۔ایسی پیاری گوڑی سہیلی جس سے تم دل کی ہر بات کر سکو گی۔''

اور واقعی ایسا ہی تو تھا۔سوچا کاہے کو اُسے ٹینشن دوں۔لوٹ آئی تھی کہانی والے بدھو کی طرح۔پر شام میں عمران جب دفتری کام کے سلسلے میں اسی طرف جا رہا تھا۔میں نے تھین آن من سکوائر اتارنے کو کہا۔خیال تھا کہ ادھر ادھر گھومیں پھریں گے۔عمران نے تجویز دی فاربڈن سٹی کو دیکھ لیں۔دراصل اس کی وسعتیں تو اتنی ہیں کہ ایک بار میں اسے دیکھنا ممکن ہی نہیں۔دو بار میں کہیں یہ قلعہ سر ہوگا۔

اب دو باتوں پر سمجھداری کا ثبوت دیا۔ایک تو اِس تکرار میں نہیں پڑی۔

''ارے میاں مجھے اِس قلعے کو سر کے کون سا تمغہ جیتنا ہے۔ایک بار میں جتنا دیکھا جائے گا دیکھ لیں گے بس۔''

دوسرے مزاج کے برعکس سعادت مند اولاد کی طرح ہرگز یہ بھڑک مارنے کی چھوٹی سی کوشش بھی نہ کی کہ نکلی تو تھی آج وہاں جانے کے لیے۔پر لوٹ آئی تم لوگوں کی پریشانی کا خیال کر کے۔تو سوچا کہ کیا ہرج ہے؟ گو شام ہے۔بڑے آیٹم کے اندر گھسنے کا وقت نہیں تو نکّی نکّی چیزیں بھی بے شمار ہیں۔ان کی تفصیلات کے لیے بھی دسیوں بار جاؤ تب بھی کم ہے۔تو بس کوٹ پہنا۔ہونٹوں کو رنگا اور چل پڑے۔شام کے خوبصورت لمحوں میں تیز ہواؤں کے جھلاروں میں آنکھوں کی پتلیاں کسی مضطرب و بے قرار پرندے کی طرح تھین

آن من سکوائر کی وسعتوں میں دائیں بائیں متحرک کیا ہوئیں کہ دفعتاً ایک منظر برق کی طرح ان سے آٹکرایا۔ بڑا منفرد بڑا رومانی سا۔ گہرے سرخ اور پیلے رنگ میں ڈوبا تین یا دو چھجے دار چھتوں میں لپٹا۔

دونوں رنگوں نے بوا کی ڈولی اور اس کا عروسی جوڑا یاد دلا دیا تھا۔ پیراشوٹ کی کلیوں کا سرخ جوڑا اور پیلے رنگی کپڑے کی ڈولی اور بوا کے ساتھ جڑی بیٹھی کہاروں کے کندھوں پر چڑھی ہلکوروں میں جُھومتی جھامتی اور اِن دونوں رنگوں کے دلکش عکس میں بوا کے چمک دار چہرے کو حیرتوں سے تکتی ایک چھوٹی سی لڑکی جس کی بچپنے کی آنکھوں میں یہ منظر جیسے جم سا گیا تھا۔ آنے والی زندگی میں ہمیشہ اِن دو رنگوں کی یکجائی اس منظر کو گھسیٹ کر سامنے لے آتی تھی۔ تھین ان من سکوائر میں یہی تو ہوا تھا۔ پہلی ملاقات میں ایسا کچھ نہ تھا۔ شائد نظر طائرانہ سی تھی۔

پوچھنے پر سعدیہ نے کہا تھا۔

یہی تو ہے۔ ''فاربڈن سٹی'' اس کا ایک داخلی دروازہ اس طرف سے بھی ہے۔ اِسے گیٹ اف ہیونلی پیس Heavenly Peace کہتے ہیں۔ یہ قدیم چینی بادشاہوں کی محل باڑیاں ہیں۔''

''او ہو یہ تو بالکل اس کے گوانڈ میں ہے۔ چلو بھئی اسی کے پاس چلتے ہیں۔''

نظریں کسی حریص کی طرح کچھ سمیٹنے کچھ چھیننے کے چکر میں وہاں جم سی گئیں۔ عمارت کے ماتھے کے عین بیچ میں ماؤ کی بڑی سی تصویری چھتر چھاؤں میں کھلے شگاف نما دروازوں سے لوگوں کا ایک اژدہام اندر داخل ہو رہا تھا۔ دو ستون اژدھے کے خوفناک منہ کے ساتھ نظر آتے تھے۔ دو شیر بھی موجود تھے۔ شیر طاقت کی علامت، اژدہا خوف اور دہشت کی نشانی۔ سچی بات ہے دنیا تو پہلے ہی اِن چینیوں کی برق رفتاری سے ڈری

سہمی بیٹھی ہے۔اب مزید بیچارے سیاحوں کو کیا ڈرانا دھمکانا؟

سوال نے سر اٹھایا تھا۔پر اِس شاہی محل مینارے کے ماتھے کا یہ ماؤ کیسے جھومر بنا ہوا ہے۔تھین ان من سکوائر میں بہت سی جگہوں پر اس کی پردانی تو سمجھ میں آتی ہے۔پر یہاں؟ جواب سعدیہ نے دیا تھا۔

یہ تھین ان من سکوائر کا ایک حصّہ ہے۔دراصل اُس نے اِس محل میں کچھ وقت گزارا تھا۔وہ تیراکی کا بہت شیدائی تھا۔اور یہاں کے سوئنگ پول اُس کی خواہش اور معیار پر پورا اترتے تھے۔روسی انقلاب کی طرح چینی انقلاب کے بعد کیمونسٹوں کے ایک بڑے گروہ کا یہاں لوٹ کھسوٹ کرنے اوراس کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا پروگرام تھا۔بھلا ہو چواین لائی کا جس نے بہت تدبر اور فراست سے اسے ناکام بنادیا۔

ایک دوسرے بڑے انتظامی کیمونسٹ گروپ نے جب ماؤ کے زیرِنگرانی بیجنگ کا چارج لیا تو انہیں سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ وہ اِس قیمتی ساز و سامان سے سجے شہر کا کیا کریں۔دھیرے دھیرے انہیں سب عقلیں آتی گئیں۔اوراب تو خیر سے وہ بہت سیانے اور ہوشیار ہوگئے ہیں۔آج شہرِممنوعہ اپنی اہمیت کے بل پر اُن کے لیے باعثِ فخر ہے کہ یہ چینیوں اور اُن کی عظیم ،قدیم اور شاندار تاریخ کا نمائندہ ہے۔ماؤ نے اِس بارے کیا کہا؟اس کے خدشات ،اس کے تحفظات ،اس کے ارشادات اور فرمودات کی آج کے کاروباری چینیوں کی نظر میں بھلا کیا اہمیت؟۔یہاں پہلی بار داخل ہونے پر اس نے کیا کہا تھا۔وہ سب انہوں نے سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا ہے کہ چھوڑو اِسے مت کھولو۔نہ ہی ہوا لگنے دو۔بس آج کا یہ سبق یاد رکھنا ہے کہ یہ ہمارا اثاثہ ہے۔ہمیں دنیا میں ممتاز کرنے والا ،پیسے دینے والا۔

یقیناً یہی وہ شعوری احساس ذمہ داری تھا کہ جب چین پر جاپان نے حملہ کیا تو

چینیوں کو اِن بیش قیمت نوادرات کو محفوظ جگہوں پر منتقل کرنے کی فکر ہوئی۔اور جب بیجنگ پر قبضہ ہوا تو بیچارے جاپانیوں کے ہاتھ صرف کانسی کا ایک آدھ ٹب اور کچھ توپوں کے ٹکڑے ہی آئے۔دوسری جنگ عظیم کے بعد سوال وار پھوٹی۔ پہلا حملہ تو قوم پرستوں نے کیا کہ کوئی 6لاکھ کے قریب نوادرات لے اڑے۔تائیوان کے میوزیم آج بھی ان کی یاد دلاتے ہیں۔

''اف مولا اتنا رش جتنا بندہ جھوٹ بول لے۔غیر ملکی تو جو تھے سو تھے پر ماشاءاللہ چینی ہی مان نہ تھے۔اب اس شہرِ ممنوعہ کی فصیل کے ساتھ بہتی گدلے سے پانیوں میں نہر کو دیکھتے ہوئے بہت سی لایعنی باتیں آگے پیچھے دوڑتی چلی آرہی ہیں۔میں اور سعدیہ لوگوں کو دیکھتے ،ان پر تبصرے کرتے ،گپیں لگاتے ،ڈرائی فروٹ سے ہاتھ منہ چلاتے شام کے بھرے میلے سے لطف وانبساط کشید کر رہے تھے۔

اِدھر اُدھر گھومنے اور جائزہ لینے سے ایک سمت برج اور بلند وبالا شاندار قسم کے دروازے اور فصیل کی بلندی بارے احساس ہوا کہ اِن کی دیواروں کی قامت اتنی پرشکوہ نہیں جتنی ہمارے ہاں تاریخی عمارات کی نظر آتی ہیں۔بس چینیوں جیسی ہی ہے۔یوں آج کی نئی نسل خاصی بلند قامت دکھتی ہے۔یقیناً اُنہیں دوائیں کھلا کھلا کر لمبا کر دیا ہے۔ہم نے نہر کے پانیوں پر بھی باتیں کرلیں۔کچھ بادشاہوں کے تکبر ونخوت سے بھرے رویے ،گالیوں اور لعن طعن کی سان پر چڑھا لیے۔تب بھی عمران واپس نہیں آیا۔اب پریشانی شروع ہوگئی۔خدا خیریت رکھے۔موبائل بھی اسی کے پاس تھا۔کوئی ڈھائی تین گھنٹے بعد اس کی صورت نظر آئی تو جان میں جان آئی۔ پتہ چلا کہ اُسے پارکنگ نہیں مل رہی تھی۔قریبی Hotongs جانے کی ترغیب عمران نے پیش کی مگر سعدیہ کے ساتھ ساتھ میرا موڈ بھی اس وقت گھر جانے پر مائل تھا۔

☆☆☆

باب نمبر:۱۵   تھین آن من اور ریڈ سکوائر کے موازنوں میں نئے انکشاف

- سکوائر کی قدیم وجدید تاریخ شاہانہ عظمتوں اور جبر وستم میں لپٹی ہوئی ہے۔
- لونگ مارچ دراصل انقلاب کے بیج بونے کی مشین تھی۔
- ریڈ سکوائر، کریملن کو دیکھنے والی بیتابی وشتابی تھین آن من سکوائر میں کیوں مفقود تھی؟

جیسے کہا جائے بندے کی سوئی کہیں اٹک سی جاتی ہے۔کچھ ایسا ہی سیاپا میرے ساتھ بھی تھا۔تشنگی تھی میرے اندر۔اکیلے گھومنے پھرنے کی، پابندیوں سے آزاد ہونے کی۔اس صبح میں نے سعدیہ کے ہاتھ پکڑ لیے تھے کہ وہ میرے پنجرے کو کھول دے۔مجھے آزاد کردے۔بھرنے دے قلانچیں مجھے۔میرے اندر کی بے چینی اور اضطراب کو تسکین پانے دے۔

صدقے جاؤں اپنی نورچشم کے۔بیچاری میرا منہ دیکھ رہی تھی۔شاید خود سے کہتی ہو۔''پاگل ہوگئی ہے میری ماں تو۔اب میری جان تو سولی پر ہی اٹکی رہے گی۔''

ماں اپنے طور پر جز بز ہو رہی تھی۔پاگل سی بیٹی سمجھتی ہی نہیں۔کہتے ہیں گوشت اگر سڑ بھی جائے تب بھی چنے کی دال سے پنھٹ (خراب) نہیں ہوسکتا۔

''ارے بھئی بے شک بوڑھی ہوگئی ہوں۔بے شک اجنبی ملک ہے۔تو بھئی کیا ہوا؟ یہ سب میرے لیے کچھ نیا ہے کیا؟ میری آزمائی ہوئی چیزیں ہیں۔ان سے کیا ڈرنا؟

رات پروگرام بناتے ہوئے باقاعدہ سوال جواب کا ایک چھوٹا سا سیشن بھی اپنے

اندر کرلیا تھا۔

''میں لولی لنگی بن کر زیادہ دیر نہیں رہ سکتی ہوں۔ مجھے بہت سارا وقت وہاں گزارنا ہے۔ تھین آن من سکوائر ٹھیک رہے گا۔'' خود سے تائیدی قسم کا سوال کیا تھا۔

''ہاں ہاں بالکل درست۔ بچوں کے لیے فاتحہ بھی پڑھنی ہے۔ اُن سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔'' جواب بھی اپنے آپ کو دے دیا تھا۔

اور ہاں میرے ذہن میں بے شمار کلبلاتے سوال پیدا ہوئے ہیں۔ جن کا جواب وہیں بیٹھ کر سوچنا اور خود کو دینا ہے۔

چلو کچھ حوصلہ، کچھ جگرا اس نے کیا۔ طے پایا کہ وہ مجھے دیدی (پاکستانی اوبر) میں چھوڑ آئے گی۔ اور میں چند گھنٹوں بعد اسی میں گھر آ جاؤں گی۔

جب وہ مجھے اس کی وسعتوں میں چھوڑ رہی تھی اس نے پھر تاکید کی تھی۔

''زیادہ دور مت جایئے گا۔ اور ایڈریس سنبھال کر رکھنا ہے۔''

اس کے جانے کے بعد میں کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ میں نے گردوپیش کو چاہت سے دیکھا تھا۔ موسم میں خنکی تھی۔ دھوپ میں نرمی تھی۔ میرے چھوٹے سے بیگ میں چھوٹی سی فلاسک، شامی کباب اور نٹز تھے۔ کچھ دیر بیٹھ کر میں نے اپنی آزادی کا جشن منایا پھر خود سے پوچھا۔

''اب کہاں سے شروع کرنا ہے۔''

سوچا پہلے ماؤ کی زیارت کرتی ہوں۔ وہی ریڈ سکوائر، لینن کے مقبرے اور اسی سے ملتی جلتی تصویریں اور رنگ ہیں۔ مقبرہ اسی جگہ بنایا گیا ہے جہاں کبھی گیٹ آف چائنا تھا۔ سکوائر کمال وسعتوں والا ہے۔ اس وقت صبح ہونے کے باوجود بہتیرے لوگ تھے۔

مقبرے کے سامنے لوگوں کی قطار تھی اور بہت لمبی تھی۔ کم بخت ماری مشترکہ

یادیں جونک کی طرح ساتھ چمٹی ہوئی تھیں۔ ریڈ سکوائر بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ انیتا یاد آئی تھی۔ بہت رش تھا یہاں تو۔ کوئی سکول یا کالج آیا ہوا تھا۔ مرکزی دروازے کے پاس ہی پھولوں کے گل دستے قطار در قطار سجے ہوئے تھے۔ لوگ انہیں خرید رہے تھے۔ سوچا اور خود سے پوچھا۔

''میں نے لینن کے لیے کچھ خریدا تھا؟''

یاد آیا ''نہیں۔ تو پھر یہاں بھی ضرورت نہیں۔'' مگر دل نے فوراً کہا۔

''نہیں یہ میرا دوست ملک ہے۔ گہرا اور مشکل وقت پر کھڑا ہونے والا۔''

شکر ہے میرے جیسی بھلکٹر نے اپنا پاسپورٹ بیگ میں رکھ لیا تھا۔ رش کو آئرن سٹیل کی راہداریوں سے بہت منظّم انداز میں گزارا جا رہا تھا۔ پھولوں کا گلدستہ صرف تین یوآن میں خریدا تھا۔ اسے اپنے بازوؤں میں سنبھالے زرد روشنی میں مجسموں کی طرح ساکت کھڑے گارڈوں اور مسمریزم جیسی فضا میں سانس لیتی دھیرے دھیرے آگے بڑھتی چلی جاتی ہوں۔ بڑے دروازے سے اندر جاتے ہی ایک شاندار کمرے میں ماؤ کا سفید براق سنگ مرمر کا مجسمہ کرسی پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ یہیں اس کے قدموں میں پھول رکھ دیئے جاتے ہیں۔ پتہ چلا تھا کہ یہی پھول واپس اسی سٹال پر پہنچا دیئے جاتے ہیں جہاں سے خریدے جاتے ہیں۔

تو اب ماؤ کو دیکھتی ہوں جو ایک شوکیس میں سجا چین کے قومی پرچم میں لپٹا گہری نیند سو رہا ہے۔ بہت فراخ پیشانی جس نے چوتھائی سر بھی ساتھ شامل کر لیا تھا۔ ساری بنگالی سہیلیاں یاد آ گئی تھیں جو اس کے نغمے گاتی تھیں۔

ماؤ نے اپنے جسم کو جلانے کی خواہش کی تھی مگر پرستاروں اور عقیدت مندوں نے اسے محفوظ کر دیا۔ اسی طرح جیسے لینن نے بھی ایسا نہیں چاہا تھا۔ اس کی بیوی کرپسکایا واہ ویلا

مچاتی رہ گئی کہ اُس کے نظریات اور فرمودات پر عمل کی ضرورت ہے۔مگر سٹالن جیسا شاطر لیڈر لاش پر سیاست کرنے کا متمنی تھا۔

ماؤ کی ایک نظم یاد آئی تھی۔چینی عورت کو خراج پیش کرنے والی۔ابھی کوئی دو دن پہلے نظر سے گزری تھی۔بہت پسند آئی تھی مجھے۔

پانچ فٹ لمبی رائفلوں کو کندھوں پر لٹکائے
وہ کتنی خوبصورت اور شاندار نظر آتی ہیں
چین کی بیٹیوں کے عزائم بہت بلند ہیں
صبح کی اولین مدھم روشنی میں انہیں
پریڈ گراؤنڈ میں جنگی مشقوں کی قطار بننے سے پیار ہے
ریشم اور ہار سنگار کی چیزوں سے کہیں زیادہ

لونگ مارچ کو بیج بونے کی مشین کہہ لیں جسنے گیارہ صوبوں میں انقلاب کے بیج بوئے۔پہلے شگوفے، پتے، پھول اور پھل سب بڑی محنت و مشقت سے لگے۔پھر ایک فصل کٹی۔سچی بات ہے۔یہ ایسا شور تھا جس نے دنیا کو واشگاف لفظوں میں بتایا کہ سرخ فوج ہیروں کی فوج ہے جب کہ سامراجی چیانگ کائی شک اور ان کے حالی موالی انتہائی ناکارہ لوگ ہیں۔

اس کی ایک اور نظم لونگ مارچ کے حوالے سے یاد آ گئی تھی۔

سرخ فوج لونگ مارچ کی سختیوں سے ذرا بھی خائف نہیں
دس ہزار چٹانوں جیسی مضبوطی سے اور بہتے طوفانوں جیسے
پانچ چٹانوں سے آنے والی سبک لہروں جیسی ہوا
اور عظیم الشان Wumeng چکنی مٹی کے ڈھالے برتن

Jinsha کے پانیوں میں ابھری چٹانوں کوگرماتے ہیں
اور Dadu دریا کی آہنی زنجیروں کوٹھنڈا کرتے ہیں
اور Min کی چوٹیوں کی برف کوخوشی سے پار کرتے ہیں
اور تینوں فوجیں بڑھی چلی جاتی ہیں، چمکتے چہروں کے ساتھ

جب باہر نکلی ۔دھوپ میں ابھی تک کوئی شوخی، کہیں کوئی چلبلاہٹ، کسی قسم کی تندی وتیزی کچھ بھی نہ تھا۔وہی مری مری سی زوردار ہواؤں کے سامنے گھگیاتی ہوئی۔

تاحدنظر پھیلے اِس سکوائر میں کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔سوچا یہیں کالم کے پاس پھسکڑا مار کر بیٹھتی ہوں۔اٹھنے کا مرحلہ مشکل ہوگا۔مگر کچھ نہ کچھ تو ہوجائے گا خیر سے۔

شانوں سے بیگ اتارا۔چاہت سے چھوٹی سی فلاسک نکالی۔شامی کبابوں کی خوشبو نے بے چین کردیا۔بھوک ابھی چمکی نہیں تھی۔اندر نے کہا۔ ''لعنت بھیجو کھاؤ پیو لطف اٹھاؤ۔''

بس تو گھونٹ گھونٹ چائے کی چسکیاں اور شامی کی چھوٹی چھوٹی بائٹ لینا کیا مسرورکن عمل تھا۔

پھر یوں ہوا کہ میں نے ٹانگیں پیاریں۔اپنے سامنے بکھرے سکوائر کو دیکھا اور 1989 کے دنوں کو اپنے سامنے مجسم کیا۔

سکوائر تو رونقوں سے بھرا ہوا تھا۔ جمہوریت کے لیے نئی نسل کے جذبات تو 1976 سے ہی اندر ہی اندر پرورش پانے لگے تھے۔اور پھر 1989 میں تو لاوہ ہی پھوٹ نکلا تھا۔نئی نسل آزادی اظہار کی متمنی تھی۔ پرانی نسل غلط پالیسیوں پر احتجاج کرنے کی آرزو مند تھی۔شاعر،لکھاری زندگی کے دیگر شعبوں سے منسلک لوگوں میں یہ بیج پھلنے پھولنے لگے تھے۔نئی نسل نمائندہ بن کر ابھری تھی۔اور پھر وہی ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

زمین گلزار بنی ،جیلیں بھریں۔جلاوطنی ہوئی۔مستی شاعر اور لکھاری وجود میں آئے اور تھیان آن من نسل پیدا ہوئی۔

کل لیپ ٹاپ پر میں نے بہت سارے منظر دیکھے تھے۔اس وقت ان کی یاد نے میری آنکھوں کو پھر گیلا کر دیا تھا۔

تب میں نے اس چینی نژاد امریکی شاعر Bei Dao جس کا اصل نام Zhao Zhenkal ہے کو یاد کیا جو ایسی خوبصورت انقلابی شاعری کو تخلیق کرنے کا خالق تھا کہ جس نے احتجاجیوں کے دلوں کو گرما دیا تھا۔جس کے شعروں سے انہوں نے بینر سجائے اور جنہیں وہ مائیک پر پڑھتے اور لوگوں کو احساس دلاتے تھے کہ ملک کی سنجیدہ اور انٹیلکچوئل کلاس آپ کے ساتھ ہے۔

تب اس کی بہت سی انقلابی نظمیں میں نے پڑھیں۔جدوجہد کرنے والوں کے لیے لکھی جانے والی۔

شاید آخری وقت آن پہنچا ہے
میں کوئی شہادت نہیں چھوڑنا چاہتا
سوائے ایک پن کے جو میری ماں کے لیے ہے
ایک ایسے وقت میں جو ہیروز کے بغیر ہے
میں صرف ایک فرد کے طور پر رہنا چاہتا ہوں

\-------------

امن کا افق
زندوں اور مردوں کو الگ کرتا ہے
میں صرف جنت کا طلبگار ہوں

اور میں حاکم وقت کے آگے
جھکوں گا نہیں کہ وہ لمبا لگے
اور آزادی کی ہوا کو روکے

ستاروں کے گولیوں جیسے سوراخوں سے
خون آشام صبح جھانکے گی

1989 کی سب یادوں کی ایک کے بعد ایک کی یلغار تھی۔

میں نے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ پڑھی اور خود سے بولی۔

''میں نہیں جانتی غلطی تمہاری تھی۔ مجھے اس پر بھی کوئی رائے نہیں دینی کہ تمہارے مطالبات جائز تھے یا نہیں۔ تمہاری حکومتوں بارے بھی کچھ نہیں کہنا کہ انہوں نے تم پر ظلم کیا۔ بس میں ایک بات جانتی ہوں کہ کہیں اگر تم زندہ ہو کر ایک بار اپنے ملک کو دیکھنے آجاؤ تو فرط حیرت سے گنگ رہ جاؤ گے۔ اور یقیناً کہو گے۔

اے وطن ہم نثار تجھ پر

ہمارے خون نے تمہیں حیات نو دی ۔اِسے دنیا میں ممتاز کیا۔ ہزاروں کیا، لاکھوں کیا کروڑوں ہم جیسی جانیں تجھ پر قربان۔

چائے کا دوسرا کپ بھرا اور پیا۔ باقی بچا کھچا کباب پار کیا۔ اردگرد گھومی پھری۔ تھک کر ایک جگہ بیٹھی۔ سوچوں کی پھر یلغاریں تھیں۔

میں ایک بار پھر کچھ الٹے پلٹے سوالوں کی زد میں تھی۔ اب خود سے مکالموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ آپ بھی شامل ہوں۔

اب حملہ آور خیال کونسے تھے؟

چین اور روس دو بڑے ملک جو نظریاتی مسلک کے اعتبار سے ایک دوسرے سے گہری مماثلت رکھتے تھے۔ گو بدلتے حالات میں دونوں ہی بہت حد تک تائب ہوئے پڑے ہیں۔ اقتصادی پالیسیوں نے کایا کلپ کر دی ہے۔ تاہم بہت سی چیزوں میں ابھی بھی جڑے نظر آتے ہیں کہ ہمسائے بھی ہیں اور ماڑے موٹے سرخے بھی۔

تھین آن من سکوائر کی وسعت حیران کُن ہے۔ تاریخ بھی بڑی قدیم، ساتھ ساتھ جدید زمانے کے نئی نسل پر ظلم وستم، ٹینک توپوں کے چڑھاوے اور لہو رنگ کہانیاں بھی اس کی ناموری کا ایک بڑا حوالہ ہیں۔ جگہ بھی بڑی مرکزی۔ سکوائر کی ایک سمت چینی کیمونسٹ انقلاب کے بانی ماؤ اور قوم کے جیالے اور سربکف مجاہدوں سے سجی کھڑی ہے۔ وہی ریڈ سکوائر میں لینن کے مقبرے اور اسی سے ملتی جلتی تصویریں اور رنگ۔

نیشنل میوزیم آف چائنا میں دیکھ چکی ہوں۔ ریڈ سکوائر کے سٹیٹ ہسٹری میوزیم نے بہت کچھ یاد دلا دیا ہے۔ ایک طرف قدیم شاہوں کے فاربڈن سٹی کی سرخ کنگری دار دیوار نظر آتی ہے۔ ریڈ سکوائر کے پہلو میں کریملن کی کنگورے دار سرخ دیوار بھی یادوں میں بے طرح ابھر آئی ہے۔

اِس ضمن میں اب تھوڑا سا ذکر اور سوالوں کی تکرار بھی سُن لیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چین سے پاکستان کے گہرے روابط آج سے نہیں ہیں۔ چین کو ہم اپنا ایسا قابلِ فخر دوست کہتے ہیں جو ہر کڑے وقت میں ہمارے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ ہم جذباتی پاکستانیوں نے اِس دوستی کی وضاحت کے لیے بہت سی مثالیں بھی گھڑ رکھی ہیں۔ جن کی قوموں کی سیاسی اور عملی زندگی میں اہمیت نہیں ہوتی۔ یہاں دوستیاں قومی مفادات کے تابع چلتی ہیں۔ مگر جی کیا کریں۔

ہم جذباتی پاکستانیوں کی نفسیات بھی بڑی عجیب ہے۔ اب جہاں تک روس سے

تعلقات کا سوال ہے۔ یہ کبھی بہت خوشگوار نہیں رہے۔ کبھی کبھی تو بہت تلخیاں بھی پیدا ہوئیں۔ پاکستان نشانے پر رکھا گیا۔ تو پھر کیا وجہ تھی کہ میں اپنے دوست ملک کی اس مرکزی جگہ پر جا کر بھی اپنے اندر کی اس ہماھمی سے جیسے خالی سی تھی۔

فاربڈن سٹی کا نام تو سُنا تھا۔ مگر لاعلمی بھی انتہا کی تھی۔ تھین آن من سکوائر دیکھنے میں شوق تو تھا مگر اس رومانیت کا عشرِ عشیر بھی نہ تھا۔ جو ریڈ سکوائر کے لیے تھا۔ مجھے یاد ہے ماسکو جانا خواب تھا کہ ویزا کی پابندیاں بہت تھیں۔ آج جیسے حالات نہ تھے۔ پہلا دن اور پہلا کام ریڈ سکوائر جانا، لینن کا مقبرہ اور ریڈ سکوائر کے گردونواح میں کریملن کی کنگوروں والی دیوار کہ جس میں قرونِ وسطی کا تعمیری حسن مضمر تھا کو دیکھنا گویا اس عہد کی خوشبو میں سانس لینے جیسا احساس تھا۔ مگر میں کریملن میں نہیں گُھسی کہ اُسے ایک تحفے کے طور پر سنبھالنا چاہتی تھی کہ وقت آخر مزے سے دیکھوں گی۔ روح افزا کے میٹھے اور یخ ٹھنڈے مشروب کی طرح اُسے گھونٹ گھونٹ پیوں گی۔

غور کرتی ہوں تو جیسے پردے سے اُٹھتے ہیں۔ روسی ادیب ایک کے بعد ایک یاد آتے ہیں۔ ستر اسی (۷۰ ۸۰) کی دہائیوں میں لیو ٹالسٹائی کو پڑھا۔ میکسم گورکی، پشکن، دستووسکی، چیخوف گوگول اور پینو وا ویرا Panova Vera کو ایک بار تھوڑی بار بار پڑھا۔ کتنے آنسو بہائے۔ کتنے پُرمسرت لمحے بتائے ان کی صحبتوں میں۔ روس اور اس کے شہروں اور جگہوں سے انجانی سی محبت ہوئی۔

میرے خیال میں سوویت یونین کی وزاتِ اطلاعات ونشریات نے بھی اِس ضمن میں بہت کام کیا۔ دوسرے برصغیر کے ترقی پسند مصنفین جنھوں نے ٹالسٹائی ،میکسم گورکی، پشکن ،دستووسکی ،چیخوف ،گوگول، کو ترجمہ کرنے میں روس کے ساتھ اپنی محبت سمجھا۔ ان کتابوں کو سستے کاغذ پر چھپوایا اور عام لوگوں کو پڑھایا۔ کچھ یوں کہ روس کا طاقتور

ادب اپنی پوری توانائیوں سے پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے آیا۔ وہ روسی ادیبوں سے مانوس ہی نہیں ہوئے انہوں نے ان سے محبت بھی کی۔ گورکی کی ماں نلوونا تو اپنی ماں جیسی ہی لگتی تھی۔صوفیہ ٹالسٹائی کے دکھوں اور ٹالسٹائی کی جانب سے کی جانے والی زیادتیوں پر ہمیں اپنی عورت کی جھلک نظر آتی ہے۔ایسے ہی تو پیٹرز برگ کے ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہی دستووسکی کے گھر جانے کی ہڑک اٹھی تھی۔ سچی بات یہاں تو ایسی کوئی ہڑک ہی نہیں تھی کہ مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے کہ میں نے کسی چینی لکھاری کو نہیں پڑھا تھا۔ کتابیں کتنی اہم اور ادیب کتنا بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔

تھین آن من سکوائر میں یہی اہم نکتہ میرے اوپر منکشف ہوا تھا۔

☆☆☆

باب نمبر:١٦ موتھیان یوجانا بھی حسین تجربہ تھا

- بادہ لنگ اور موتھیان یو میں وہی پنڈ اور شہر کی ماڈرن کڑی والی بات تھی۔
- چین کی جغرافیائی ساخت اور آب وہوا نے اسے دو مختلف کلچر دیئے ہیں۔
- چین کے اپنے پہلے خلاباز یانگ Yang Liwei کا کہنا تھا کہ اسے تو چاند پر کوئی دیوار شوار نظر نہیں آئی۔

Mutianyu جانا اور اُسے دیکھنا میرے حساب سے میری زندگی کا ایک اور انتہائی حسین تجربہ تھا۔

دیوار چین کے اس بادہ لنگ Badaling والے حصّے کو دیکھ کر واپسی شام کو ہی ہوئی تھی۔ یہ ہفتے کا دن تھا اور تینوں بچے گھر پر تھے۔ میرے آنے کے بعد سے یہ ان کا معمول تھا کہ اسکول سے واپسی پر جونہی وہ مجھے دیکھتے۔ یکے بعد دیگرے بول اٹھتے۔

''ہاں تو نانو آج کی خبریں کیا ہیں؟ کہیں گئیں؟ کچھ دیکھا؟ جیسے سوالوں کی یلغار ہوتی۔''

یہی بادہ لنگ سے واپسی پر ہوا۔

''اُف ابو، ماما آپ لوگ نانو کو موتھیان یو Mutianyu کیوں نہیں لے کر گئے۔ یہ عظیم دیوار کا بہترین اور شاندار حصّہ ہے۔''

اب ان کے اعتراضات کا نشانہ میں بن گئی تھی۔

’’حد ہوگئی ہے نانو آپ کی بھی۔ بہت ضروری تھا کہ آپ کیبل کار سے چوٹی تک جاتیں اوراس موڈ سے لطف اندوز ہوتیں۔ شاندار Toboggan سے واپسی کرتیں۔اور یقیناً کہتیں میری زندگی کا شاندار دن اور تجربہ۔‘‘

’’ارے بھئی بادہ لنگ کو آرٹ اور کلچر کے حوالے سے دیکھو۔ کیسے کیسے شاہکار ہیں وہاں۔تمہاری نانو لکھاری ہیں۔انہیں پہلے یہ دکھانے کی ضرورت تھی۔‘‘

عمران قہقے لگاتے ہوئے کہتا۔

مگر بات وہی کہ بچے ہمارے عہد کے ہم سے زیادہ ہوشیار ہوگئے ہیں۔دونوں نواسوں نے ماں باپ کا ناک میں دم کرنا تو کیا ایک طرح انہیں طعنے مار مار کر جینا حرام کردیا کہ آپ لوگوں نے نانو کو سیڑھیاں چڑھا چڑھا کر ہپوہان کردیا۔آپ کو انہیں چیئر لفٹ رائڈ سے چوٹی پر لے جانا چاہیے تھا۔

مجھے بھی ساتھ ساتھ اُکساتے۔

’’دیکھ لیں نانو آپ کی بیٹی نے آپ کے ساتھ دو نمبری کردی ہے۔‘‘

خوب خوب شغل لگتا۔اِس ساری بک بک، جھک جھک کا نتیجہ عمران کے ہاتھ کھڑے کردینے کی صورت میں تھا۔’’بھئی غلطی ہوگئی۔معافی کا طالب ہوں۔تین دن کے لیے مجھے چندو جانا ہے۔آنے کے بعد سب سے پہلا کام آپ کی نانو کو موتھیان لے جانا ہے۔‘‘بچوں نے تالیاں بجائیں باپ کے نعرے لگائے۔اس دوران میرے لاڈلوں نے انٹرنیٹ سے معلومات کے ڈھیر لگادیئے۔اپنے لیپ ٹاپ پراس حصّے کے کون کون سے منظر نہ دکھائے۔اُف واچ ٹاور کی انوکھی تعمیری ساخت، سبزے سے بھرے جنگل، بہار میں کھلتے پھول، موسم خزاں میں درختوں سے لٹکتے پھل اور سارا ماحول سُرخ اور پیلے درختوں سے ڈھنپا ہوا۔لگتا تھا جیسے جنگل میں آگ لگ گئی ہو۔سردیوں میں برف کی چادریں اوڑھے

چوٹیاں اور ڈھلانیں۔ ایک طرف اگر فطرت اور حسن کے یہ نظارے تھے تو دوسری طرف اس کی تاریخ، اس کی کہانیاں۔ سچی بات ہے میں تو اِن دونوں کے درمیان لٹک گئی تھی۔ یوں موتھیان Mutianyu سے خاصی آشنائی ہوگئی۔ تصویری بھی اور تحریری بھی۔

چندو سے واپسی پر اگلے ہی دن عمران نے آفس سے آتے ہی زوردار آواز میں اعلان کر دیا کہ کل بچوں کی نانو Mutianyu جائیں گی اور جھوٹے لیں گی۔ تینوں بچوں نے ہُرّا کہتے ہوئے تالیاں بجائیں اور نانو کے بوسے لیے۔ اب آئے گا مزہ۔ یوں میرے لاکھ انکار کے باوجود وہ مجھے وہاں لے ہی گئے۔ بہرحال یہاں آ کر شناسائی کے جو نئے انداز سامنے آئے وہ تو اپنی مثال آپ تھے۔

یہ بیجنگ کے شمال مشرق میں کوئی 70 ,75 کلومیٹر پر ہے۔ کیبل کار میں بیٹھنے اور جھوٹے لینے کا پتر یاٹہ میں مزہ چکھ چکی تھی۔ مگر بات وہی پنڈ اور شہر کی ماڈرن کڑی والی تھی۔ کار اسٹیشن کی خوب صورتیاں اور کاروباری حسین طریقے سلیقے والے انداز کس درجہ شاندار تھے کہ واہ واہ کہہ اٹھنے کو جی چاہتا تھا۔ پیار سے سہج سے اطمینان سے بیٹھنے کے بعد آپ نیچے دیکھتے ہیں۔ نیلگوں دھویں کے غبار میں لپٹی سرسبز ڈھلانوں والے تہہ در تہہ پہاڑی سلسلوں کا حسن آپ کی سانسوں کو روکتا ہے۔ آپ کی آنکھوں کو تحیر سے پھاڑتا ہے۔ آپ کے زبان سے بے اختیار سبحان اللہ، الحمدللہ جیسے الفاظ نکالتا ہے۔ اِن سبز سلسلوں کی بھی انواع کا سلسلہ ہلکے اور تیز رنگوں کے شیڈ کے ساتھ ساتھ بہتے پانیوں کی طرح نظروں میں کُھبا جاتا تھا۔ ان پر تیرتی رقص کرتی ہوائیں یقیناً یہ جنگلی خوشبوؤں سے بوجھل ہوں گی۔ پرندوں کی دید نے آنکھوں کو حسرت سے لبالب بھر دیا ہے۔

درختوں اور بوٹوں کے جوشیلے ہلارے ہواؤں کی تندی اور تیزی کو بتاتے تھے۔ ایسے میں مجھے وہ سلطنت تھانگ Tang کا عظیم شاعر Du Fu کیوں نہ یاد آتا جس نے ایسی

ہی کسی اونچائی اور ایسی ہی کسی بلندی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ یہ نظم میں نے ڈاکٹر نسرین سے چند دن قبل سنی تھی۔

اونچائی سے

ہواؤں میں کاٹ ہے، بادل بلند ہوتے ہیں

بندر اپنے دکھوں پر بین کرتے ہیں

ہوا تازہ، ریت سفید،

اور پرندے دائروں میں اڑتے ہیں،

مدھم سی آواز میں

ہر طرف گرتے ہوئے پتے

جبکہ ایک تواتر سے دریا کی لہریں

ہلکوروں کی صورت بہتی ہیں

خزاں کی دھندلاہٹ میں طے کی ہوئی ہر میل کی مسافت

مجھے تو اپنا ہی سفر لگتا ہے

تنہا، نڈھال اور بیمار سا

اس بالکونی پر چڑھتے ہوئے

زندگی کی ناکامیاں اور پچھتاوے

میری کنپٹیوں کو جذبات سے منجمند کر رہی ہیں

اور یہ میں شکستہ دل بدقسمت

کہ جو پینا چھوڑ چکا ہے۔

اور اب میں ہواؤں میں اڑتے اِس اڑن کھٹولے میں بہتی چلی جا رہی ہوں۔

میرے قدموں کے نیچے برجیاں تھیں۔ کشادہ دروں میں بھاگتے دوڑتے لوگ تھے۔ چوٹی پر پہنچ کر میں نے اک ذرا رک کر ماحول کے سارے حسن کو سرشاری سے دیکھا ہے۔ انگ انگ میں مسرت رقصاں ہے۔ لمبی سانس لے کر اپنے اردگرد بھنگڑے ڈالتی ہواؤں کو سونگھا ہے۔ اسے اپنے سینے میں اُتارا ہے۔ آنکھیں بند ہوگئی ہیں۔

اب چلتی جا رہی ہوں۔ نیچے جھانکتی ہوں۔ چیلسی Chelsea اور بل کلنٹن یاد آئے تھے۔ خوب رو امریکی صدر اور اُن کی بیٹی یہیں بھاگتی پھر رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر سینے سے ''کاش'' نکلا تھا۔ ''میں کب اِسے دیکھوں گی۔'' ہوک نے تب سوال کیا تھا۔

''حاسدی عورت شکر ادا کر اوپر والے کا۔'' اندر نے کہا تھا۔ مسکراتے ہوئے اوپر والے کو محبوبانہ انداز میں دیکھا تھا۔ اب دیوار سے چپک کر کھڑی ہوگئی ہوں۔ بیٹی اور داماد سے بے نیاز۔ نظریں رکتی ہیں۔ رُک رُک کر، پلٹ پلٹ کر اپنے گردوپیش کو دیکھتی ہیں۔ سامنے لگتا ہے جیسے سبزے کا ایک جہان ہے جو دھیرے دھیرے کسی آبشار کی طرح پہاڑوں کے دامن میں گرتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ میرا دل رُکتا تھا۔ ذرا ٹھہرتا تھا۔ کیا منظر تھا۔

یہ تاریخ بھی کم بخت کتنی بوریت والی شے ہے۔ ذرا بیٹھی ہوں تو فوراً مجھے جتانے کے لیے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے اور پوچھتی ہے۔ تم نے اپنے قارئین کو ابھی تک اس کے بارے کچھ خاص نہیں بتایا۔ یونہی حقائق کی تکا بوٹیاں کرتی پھر رہی ہو۔ تم نے تو بادشاہوں کے ادوار کی خشکی کو مزاح اور خوش مزاجی کے بہتیرے پیرھن پہنا دیئے ہیں۔ حد ہوگئی ہے تمہاری بھی تاریخ بی بی بجائے میری شکرگزار ہونے کے کہ میں تمہاری کھٹی میٹھی تفصیلات کو دلچسپ بناتے ہوئے اُسے اختصار کا جامہ بھی پہنا رہی ہوں۔ تم الٹا مجھے ہی رگید رہی ہو۔

بیچاری میری اِس پھٹکار پر شرمندہ ہوئی اور بولی۔ بس بھئی بس بہت ہوگیا اب

مزید مجھے کچھ نہیں کہنا۔ ہاں تمہاری مہربانی تم نے بادشاہوں کے عدل وامن کے گیت بھی بہتیرے گا لیے ہیں۔ اپنی قومی تاریخ کو سجانے، سنوارنے اور ماضی کے حکمرانوں کو پھنے خان ثابت کرنے کے لئے دلائل اور تاویلوں کے ڈھیر بھی لگا دیئے ہیں۔ تاہم یہ کھوج کرنا بھی تو ضروری ہے کہ آخر اِسے بنانے کی ضرورت کیا تھی؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ تاریخ کے پاس اپنے حوالے اور وجوہات ہیں، دلائل اور توجیحات ہیں۔

سچ بات تو یہی ہے کہ امن اور عام لوگوں کی حفاظت اور انہیں جنگ وجدل سے بچانے کی ضرورت کے حوالے زیادہ ٹھوس صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ہماری ناقص رائے میں تو پرانے بادشاہوں کے سامنے بھی آج کے بادشاہوں جیسی سوچ ہی کارفرما تھی۔

اقتدار، تخت وتاج اور طاقت کی بھوک نے سدا انسان کو بے چین رکھا۔ پہلا اور اہم فکر تو اپنا اور اپنی راجدھانی کی بقا کا ہوتا۔ تاج وتخت محفوظ، اپنی سلطنت کی گدی بیٹے، پوتے، پڑپوتے کو نصیب ہو جیسی فکر کے تابع ہو۔ ہاں بیچ میں کچھ نیک دل بھی جنم لے لیتے جن کے دلوں میں کہیں تھوڑا بہت پرجا کا بھی خیال آجاتا کہ اسے مظبوط کرو کہ ان غریبڑوں کا تحفظ بھی یقینی ہو جائے ورنہ تو بیچاروں کی تکّے بوٹیاں ہی اڑتی پھریں گی۔ یوں اس میں مبالغے والی تو ذراسی بات بھی نہیں۔ ہر چھوٹی بڑی مصیبت کی موری کے آگے تو انہوں نے ہی آنا ہوتا ہے۔ اور جب وہی نہ رہے تو کہاں کا راج پاٹ؟ تب کے زمانے کم بخت مارے آج جیسے تھوڑی تھے کہ خلق خدا بس ایک بٹن دبانے کی مار پر ہوتی۔ یوں تجارتوں کے ہوکے بھی بڑے تھے کہ اکلوتی شاہراہ ریشم کی حفاظت بھی تو مقصود تھی کہ دنیا کا لمبا ترین اور قدیم ترین راستہ تو یہی تھا۔

ہاں مگران کے علاوہ بھی بڑے اہم مسائل تھے۔ اِس میں شک نہیں کہ زمانہ قدیم سے ہی یہ خیال بڑا طاقتور تھا کہ چین کی جغرافیائی ساخت اور آب وہوا نے اِس ایک ملک

میں دو مختلف کلچروں کو رواج دے رکھا تھا۔ جنوب گرم آب و ہوا کے ساتھ زراعت کے لئے موزوں ترین حصّہ خیال کیا جاتا تھا۔ شمال سرد اور جانوروں کی چراگاہوں کے لئے بہترین جگہ سمجھی جاتی تھی۔ آب و ہوا اور موسم کے مطابق ہر ایک کا کلچر بھی اسی مناسبت سے ترقی یافتہ اور قدرے پسماندگی کے زمرے میں آٹھہرتا ہے۔ اگر زرعی پیشے سے منسلک آبادی کے لیئے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیئے امن اور استحکام ضروری تھا تو اِس کے برعکس، شمالی علاقوں کے لوگ خود کو زندہ رکھنے کی تگ و دو میں زیادہ متحرک تھے۔ قدرتی امر تھا کہ ایسے حالات میں ایک حصّے کا دوسرے پر انحصار بڑھ جاتا ہے۔

اب سچی بات ہے تاریخی تناظر میں شمال کے خانہ بدوشوں کے جنوب کے لوگوں پر حملے دراصل زندگی کی ضروریات کے حصول کے لئے تھے۔ اُن بیچاروں کو علاقے فتح کرنے سے رغبت نہ تھی۔ ساری جدوجہد تو روٹی اور پیٹ کے لئے تھی۔ اِس لئے شمال کے حملہ آوروں سے بچاؤ کی بات تو نری فضول ہی لگتی ہے۔ اب دوسرا اس کی حمایت میں یہ کہا جانا کہ یہ عظیم دیوار ہی تو تھی جس نے اگر ایک طرف شمال اور جنوب کے لوگوں کو اپنی اپنی حدبندیوں میں تقسیم کیا تو ساتھ ہی انہیں رہنے کا قرینہ بھی سکھایا۔ اس نے دونوں کے درمیان جھگڑے کم کرتے ہوئے انہیں شعور دینے کی بھی کوشش کی۔ اِس چھوٹے سے قدم نے جنوب کے پیداواری ڈھانچوں اور معشیت کو عروج دیا۔ یقیناً بندہ اِس سے اتفاق کرتا ہے کہ جب لوٹ مار کے راستے بند ہو گئے تو شمال کے لوگوں کو بھی احساس ہوا کہ لوٹ مار پر تکیہ کرنے کی بجائے اپنے وسائل کو استعمال میں لاؤ۔ اپنی تہذیبی ثقافت کو بہتر اور نمایاں کرو۔ اور یہی وہ اقدام تھے کہ جنہوں نے دونوں کے درمیان بہتر افہام و تفہیم کے دروازے کھولے۔

اس حوالے سے چینی تاریخ میں ایک اور کہانی بہت اہم کردار ادا کرنے داخل

ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سن یات سین Sun Yat, Sen (1866-1911) 1911 کے انقلاب کے مرکزی کردار جنہوں نے Qing سلطنت کو کھڈے لین لگایا تھا کا کہنا ہے۔ ''اگر یہ سب عظیم دیوار کی حفاظت کے لئے نہ کیا جاتا تو چینی تہذیب ان شمالی لوگوں کے ہاتھوں کن اور ہن سلطنتوں میں ہی تباہ و برباد ہو چکی ہوتی۔ سونگ 1279-960 اور منگ کو دیکھنا کہاں نصیب ہوتا۔''

ہاں اب ذرا تعمیری تفصیل پر بھی بات ہو جائے۔

پہاڑوں پر جب جب بننے کے مراحل آتے تب ان ہی پہاڑوں کے پتھر استعمال کئے گئے۔ چلو جب یہ میدانوں سے گزری تب اینٹوں گارے چونے سے کام چلا۔ جب صحرا لپیٹ آئے تو پھر ولو Willow درختوں کی شاخیں اور گہرائیوں سے نکالی ہوئی ریت نے کام کیا۔ 7 قبل مسیح سے ہی یہ دیواریں بننے تو لگی تھیں مگر انہیں جوڑ کر باقاعدہ ایک بڑی دیوار کی پہلی صورت 220 قبل مسیح میں شہنشاہ Qimshi Hang نے دی جو چین کا پہلا بادشاہ تھا۔ لیوچی Liuche، ہین Han شہنشاہیت نے سلک روٹ کی حفاظت کی۔ پھر ونگ کے زمانے 1368-1644 تک پتھر اور اینٹوں سے اسے مزید مظبوطی دی گئی۔ کہتے ہیں مظبوط کرنے میں چاول بھی بڑے اہم رہے۔ جہاں تک مدافعانہ حیثیت کا تعلق ہے عظیم دیوار ایک طویل لمبے پھیلاؤ والا سلسلہ ہی نہیں بلکہ اس کے مختلف حصّے جو مختلف دفاعی مقاصد کے تحت ہیں جن میں بلاک ہاؤس، گریژن ٹاؤن، فوجی چوکیاں، درے، سگنل ٹاور پر مشتمل ہیں۔ وہ بہت منصوبہ بندی سے بنائے گئے تھے۔ اب تعمیری پہلوؤں کے ساتھ ساتھ کچھ تخریبی پہلوؤں پر بھی بات ہو جائے۔ اسے وقت کی طوالت نے اپنے اپنے عہد کے لوگوں کا خون پسینہ، اُن کے آنسو آہیں، شاہوں کے جلال اور اُن کے جبر دبدبے، اُن کی تخلیقی ذہنی اپچ سبھوں کو شامل کیا۔

ذرا چند لمحوں کے لئے سوچیں ۔بیچارے غریب غربا اور مزدور لوگوں کا حال پتھروں کو توڑنا کتنا کٹھن کام۔کہیں اوپر بلندیوں سے لانے میں ہلکان اور کہیں ہزاروں فٹ نیچے گہرائی سے ڈھویا ڈھوئی کا سلسلہ۔مفت بیگار کے یہ جبری سلسلے ۔لوگوں کو گھروں اور خاندانوں کے بیچ سے اٹھا کر لے جاتے ۔تو اب بھلا اُن بیچاروں کے آنسو آہیں کیسے نہ شامل ہوتیں ۔Qin سلطنت کے پہلے بادشاہ کا زمانہ۔جب اِس عظیم دیوار کو بنانے کے لیے ایک نئے نویلے دولہا کو بھرتی کیا گیا۔بے حد خوبصورت دلہن کے یہ دن تو ابھی مرادوں بھرے تھے کہ اِن کے سہانے شب وروز میں جدائی کا زہر گھل گیا۔

محبت بھرے جذبات نے طوفان اُٹھایا۔ایک دن اُس سے ملنے کے لیے نکل پڑی۔کوسوں میل دور کا سفر۔ پوچھتی پوچھاتی بھوکی پیاسی جب اُس جگہ پہنچی جہاں تعمیراتی کام ہورہا تھا۔ساتھی لوگوں نے بتایا کہ اس کا شوہر تو مر گیا ہے۔اُسے تو دیوار کے نیچے ہی دفنا دیا گیا ہے۔خبر تھی یا کوئی بجلی جو اس پر گری۔تین دن اور تین راتیں وہ مسلسل روتی رہی حتیٰ کہ دیوار کے بیشتر حصّے ایک کے بعد ایک گرتے چلے گئے۔

سچی بات ہے قیمت تو عام آدمی کو ہی ادا کرنی پڑتی ہے۔لیڈی Mengjiang تو ایک مثال ہے۔شمال کے گھڑ سوار لٹیروں کو بھی سب سے زیادہ اِس بات پر اعتراض تھا کہ یہ کیا انہیں محصور کر دیا۔وہ کیا بزدل ہیں؟انہیں تو یوں بھی جنوب کے کھاتے پیتے لوگوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔وہ تو برملا کہتے سب بکواس ہے کہ یہ اُن کی حفاظت کے لیے بنائی جارہی ہے۔ یہ تو بادشاہ کن کے راج کو دوام دینے کی کوشش ہے۔شاید اسی لیے وہ بادشاہ سے بھی متنفر تھے۔

اب یہ سوال کرنا بھی ضروری تھا کہ کسی نے اِسے کبھی سر بھی کیا؟

سنگاپور کے Monks مونک ز کے بارے روایت ہے کہ انہوں نے کوئی نو ماہ

میں اِسے تسخیر کیا تھا۔مگر اس پر بھی کہا گیا کہ کہاں ؟ صرف بیجنگ کا پورشن کور ہوا تھا۔113170 میل کی لمبائی کو پیدل نو ماہ میں سر کرنا کوئی خالہ جی کا گھر تھا۔ مارکو پولو کو تو یہ اعزاز حاصل ہوا نا کہ وہ قبلائی خان کا ہر دل عزیز بندہ (Yuanchina) منگولیا تک گیا۔اس نے دیوار کا ذکر بھی کیا۔اس افریقی شہرہ آفاق سیاح ابن بطوطہ کا حوالہ بھی تو بڑا اہم ہے کہ Garin Menzies کی کتاب میں اِس کا ذکر کھل کر ہوا۔چینی نقشہ جو غالباً 1421 سال کا ہے بتاتا ہے کہ یہ چینیوں نے دریافت کیا۔

71 سال قبل کولمبس کہ جب وہ کوسوں کا سفر کر کے Yuan شہنشاہیت کے دور میں یہاں آیا تھا۔یہی لگ بھگ 1346 میں۔کہا جاتا ہے کہ اس نے دیوار چین کے بارے چین آنے سے قبل سن رکھا تھا۔اس نے اسے الہامی کتاب قرآن کے ساتھ بھی جوڑ دیا تھا۔ یاجوج ماجوج کا بھی ذکر کیا۔اب یہ اعزاز بھی تو چینی دھکّے شاہی سے اپنے کھاتے میں ڈالتے ہیں کہ امریکی خلابازوں کی آنکھوں میں زمین سے نظر آنے والی کوئی شے چُبھی تھی تو وہ یہی دیوار چین ہی تھی ۔ہماری عظیم دیوار۔اب نیل آرمسٹرانگ Neil Armstrong لاکھ کہیں کہ اُنہیں تو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی۔چین بھلا اس پر یقین کرتا ہے۔اس کے حسابوں ایسا بیانیہ نری سازش ہے اوراس سے چین کی تذلیل مقصود ہے۔

سچی بات ہے اب اس کا کیا علاج کہ ان کے اپنے پہلے خلاباز YangLiwei نے 2003 میں یہ انکشاف کر دیا تھا کہ اس نے خلا سے کوئی دیوار شوار نہیں دیکھی۔یہاں تو خیر سے مسلمان بھی چینیوں سے پیچھے نہیں رہے۔انہوں نے اپنی اذان کو سرمایہ بنایا اور فخر کیا کہ چاند پر سنی جانے والی آواز اذان کی تھی Toboggan کا تجربہ بھی نہ کرنا گویا خود کو بُہت سے رنگوں سے محروم کرنے کے مترادف تھا۔اور وہ میں نے کیا۔

☆☆☆

باب نمبر:۱۷ تنگ شیاؤ سے ملنا

- تنگ کا ملنا خدائی تحفہ تھا۔
- منڈا فائٹر پائلٹ اے۔کڑی دی اڈی زمین تے نہیں لگدی پیئی۔
- چین بارے دنیا محوِ حیرت ہے۔میری اوقات کیا تبصرے کی۔
  گیمبیا کی مریم سے سوال جواب۔

کِیا کرایا تو کچھ بھی نہ تھا۔بس بات اتنی سی تھی کہ اوپر والے کو رحم آ گیا تھا۔یقیناً سوچا ہوگا۔فقیر کی سوکھے ٹکڑے کھانے والی لڑکی میری نظر کرم کی بھینٹ چڑھ کر بادشاہ کی ملکہ کے روپ میں شاہی محل میں آتو گئی تھی۔مگر مہینے بھر میں ہی سوکھ کر کانٹا ہوگئی کہ شاہی انواع واقسام کے مرغن کھانے اس کے حلق میں اٹکتے تھے۔اور یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔آرام،آسائش اور سہولتوں کی فراوانی ڈسنے لگی تھی۔

تنگ کا ملنا خدائی تحفہ تھا جو تجُل خواری کے چس کو پورا کرنے کے لیے اوپر والے نے عطا کیا تھا۔ڈی آرسی کا یہ خوبصورت علاقہ جو اپنی طویل القامت عمارتوں کے ایک مناسب جھرمٹ اور ایک چھوٹے سے کمپاؤنڈ کے ساتھ دیدہ زیب لگتا تھا۔کہیں کہیں بچوں کے چھوٹے پارک جھولوں،ان کی سی سا اور دلچسپی کی دیگر کھیل تماشوں والی چیزوں سے سجا بڑا خوبصورت لگتا تھا۔۔یہاں چوبی شیڈوں جیسے پگوڈا نما چھجّے اپنی سنگی بینچوں کے ساتھ بوڑھوں لوگوں کے لیے بھی بڑی کشش کا باعث تھے۔اکثر یہاں فارغ لوگ دھوپ تاپتے اور بچے بھی کھیلنے آجاتے تھے۔

ایک دن میں بھی گھومتے پھرتے وہاں جا پہنچی۔دھوپ اتنی میٹھی،فضا میں خاموشی

اور ماحول میں درختوں اور کہیں کہیں ان پر کھلے سفید اور گلابی پھولوں کا حُسن ماحول کی دلکشی کو چار چاند لگا تا تھا۔مزہ آرہا تھا۔بینچ پر بیٹھ کر لُطف لینے لگی تھی۔

دفعتاً تین پاکستانی خواتین نظر آئیں۔ایک دوسری کے آگے پیچھے چلتی یہ سیدھی سادی کھلے ڈوپٹوں سے ناک منہ ڈھانپے، باتیں کرتی جب قریب پہنچیں تو جیسے ایک میٹھی سی اپنایت کا احساس اندر سے اُبھرا تھا۔مسکرا کر میں نے حال احوال دریافت کیا تو پتہ چلا یہ پاکستانی سفارت خانے کے درجہ چہارم ملازمین کی بیویاں تھیں۔اُن کے بچے ایمبیسی اسکول میں پڑھتے تھے۔آج بچوں کی جلدی چھٹی ہونے کی وجہ سے گیارہ بجے ہی وہ وہاں آگئی تھیں کہ اسکول بس بچوں کو یہیں اُتار کر آگے بڑھ جاتی تھی۔

تھوڑی سی مزید جانکاری نے بتایا کہ ایک کا تعلق پشاور، دوسری بہاول پور اور تیسری راجن پور سے تھی۔ایک کا ڈھائی سالہ خوبصورت بچہ ایسا ذہین فطین کہ اِس عمر میں ایسی ہوشیاری اور ذہانت کم بچوں میں ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

عورتیں مزے کی تھیں۔چین کے حوالے سے اُن کے اپنے تجربات تھے جنہیں سُننا دلچسپ تھا۔ایسی ہی باتوں میں دفعتاً سوکھینہ باجی کا ذکر آگیا۔سعدیہ کے گھر میں بھی کوئی چار پانچ بار اس نام کا تذکرہ ہوا تھا۔جانی تو بس اتنا سا کہ یہ ایرا تاشی کی مسز ہیں۔

سوکھینہ بڑا منفرد سا نام تھا۔مگر میری اس نام سے شناسائی ہو چکی تھی۔کربلا میں حضرت عباسؓ علمدار کے روضہ مبارک کی زیارت کے لیے جا رہی تھی۔دروازے پر رش کی صورت دیکھ سوچا کہ قیمہ بننے والی بات ہو جانی ہے اگر محبت بھرے جذبات کو لگام نہ ڈالی۔باہر کھلے میدان میں قالین بھی بچھے ہیں اور پنکھے بھی ہیں۔رنگ رنگیلی خلق خدا بھی موجود ہے۔چل رب کی دنیا دیکھ۔اُن سے باتیں شاتیں کر۔آدھی رات کے بعد اندر جانا۔ اور یہیں مشہد سے آنے والی فیملی کی بچی کا نام سوکھینہ سننے کو ملا۔پہلی بار سن رہی

تھی۔تعجب سے انہیں دیکھا۔اپنے بیگ سے کاغذ قلم نکال کر بچی کو تھمایا کہ لکھو تو ذرا۔

''اوہو اسے تو ہمارے ہاں سکینہ بولا جاتا ہے۔''

تصیح ہوئی کہ غلط ہے۔یہ فارسی کا لفظ ہے اور اس کی ادائیگی اسی طرح کی جانی چاہیے۔

خواتین کی باتوں سے ایک اور بات کا انکشاف بھی ہوا کہ سوکھینہ باجی بہت حسین ہیں۔سفارت خانے کی عورتوں میں کوئی ان کی ہم پلّہ نہیں۔

میرے ہونٹوں پر صرف مدھم سی ہنسی بکھری۔لفظ میں نے بکھرنے نہیں دیئے کہ مخاطب عورتوں کو اس کی گہرائی جذب کرنی مشکل تھی۔ہاں میرا اپنا اندر ضرور محظوظ ہوا تھا۔

''بھئی ایر فورس کے پائلٹ کی بیوی ہے کوئی مذاق تھوڑی ہے۔یہ جنگی ہوا باز بیویوں کی خوبصورتی بارے بڑی پکّی ہوتے ہیں۔حسن کے ساتھ دس بارہ شرائط کا کاغذ بھی ان کی جیب میں ہوتا ہے۔

ساٹھ ستّر کی دہائیوں میں ان شاہینوں کا کتنا کریز تھا۔کوئی ہم سے پوچھے۔

باغبانپورہ کی امیر ترین سیاسی منظرنامے پر بھی بڑی متحرک میاں فیملی کی صبیح نامی ایک لڑکی ہماری دوست اور کالج فیلو تھی۔اتنی ہی حسین تھی کہ جس کے لئے تشبیہیں، استعارے ناکافی ہوجاتے ہیں۔سیکنڈ ایر میں ہی شادی ٹھہر گئی اور وہ بھی ایر فورس کے پائلٹ سے۔لڑکا قد کا ذرا چھوٹا اور رنگت کا بھی ماٹھا تھا۔خاندان کی بزرگ خاتون نے دیکھا اور اعتراض کیا کہ ہیرے جیسی لڑکی کس کے پلے باندھ دی ہے۔بڑی بہن نے ہنستے ہوئے کہا۔

''چاچی جی تہانوں پتہ اے منڈا فائٹر پائلٹ اے۔کڑی دی تے اڈی نیں لگدی پئی زمین تے۔صبیح کا شوہر یونس حسن، سرفراز رفیقی، سیسل چودھری جیسے لوگوں کا بیچ میٹ

تھا۔

تہمینہ کے بھانجے کا قصہ بھی بڑے مزے کا ہے۔ میراج جیٹ فائٹر کی ٹریننگ لے کر فرانس سے آیا تو خالہ کے ساتھ میرے ہاں بھی آ گیا۔

''لڑکی پھول جیسی ہونی چاہیے خالہ۔''

اس کے سراپے پر پیار بھری نظریں ڈالتے ہوئے میں نے دل میں کہا۔

''خود بھی شہزادوں جیسا ہے۔ پھول مانگنے میں حق بجانب ہے۔ تاہم مذاقاً کہا۔

''اب یہ بتادو کہ پھول گوبھی کا ہو یا گیندے کا۔''

''اف خالہ مذاق چھوڑیں۔ خاندان ماڈرن ہو، کھاتا پیتا بھی ضروری ہے۔ لڑکی کی انگریزی آب رواں جیسی ہو۔ سلیقہ مند ہو۔ خود پسند ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔

تہمینہ اور میں دونوں ہنس پڑیں۔

تو بھئی اب سوکھینہ باجی کا بے مثل ہونا تو بنتا ہے نا۔

ایک تو بیچ میں کتنی ہی ادھر ادھر کی باتیں، یادیں چھلانگ مار کر کود پڑتی ہیں۔ اصل کہانی جو سنانے لگی تھی وہ لٹکتی مٹکتی رہ گئی۔ یہ تنگ شیاؤ سے ملنا تھا۔ سوکھینہ باجی کی گلیمرس شخصیت کی دلدادہ خواتین جب اسکول بس سے اُترنے والے بچوں کے بستے پکڑ کر مجھے خدا حافظ کہہ کر چلی گئیں۔ یکدم مجھے محسوس ہوا تھا جیسے ماحول میں سناٹا سا ہو گیا ہے۔ اٹھی اور گھر آ گئی۔ سعدیہ نہیں تھی۔ فاطمہ سے میں نے کہا۔

''اپنی ماں کے موبائل کی پکچر گیلری تو ذرا مجھے نکال کر دو۔''

ڈھروں ڈھیر تصویریں تھیں۔ اِن میں جو نمایاں تھی۔ اندر نے کہا تھا۔ یہی ہو سکتی ہے سوکھینہ۔

اور فاطمہ کی تصدیق پر میں نے خود کو شاباشی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''واہ کیا بات ہے تیری۔''

سعدیہ جب آئی تو تفصیلی رپوٹ اس کی خدمت میں پیش کی کچھ اِس انداز میں کہ صبح کا وقت میرے لیے وہاں گزارنا کتنا دلچسپ شغل تھا۔ یہ بھی کچھ ڈھکے، کچھ کھلے لفظوں میں واضح کر دیا کہ بھئی اتنی سی آزادی کا ملنا تو بہت ضرری ہے نیز یہ سرگرمی میں جاری رکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔

چلو اُس کی بھی تسلی ہوگئی کہ اتنی آوارہ گرد اور پھراؤ ندو ماں کے لیے اتنی سی محفوظ تفریح نما سیر سپاٹا تو ضروری ہے۔ ہاں سوکھینہ کے ذکر پر کھلکھلا کر ہنسی اور بولی۔''صورت کے ساتھ دل کی بھی حسین ہے۔''

اگلا دن بڑا بھاگوان تھا۔ سرشاری کی سی کیفیت میں باہر نکلی۔ مطلوبہ جگہ پہنچی۔ کوئی نہیں تھا۔ سناٹا اور ویرانی تھی۔ آج دھوپ بڑی مٹھی اور ہواؤں میں بھی بڑی کاٹ سی تھی۔ تھوڑی دیر بینچ پر بیٹھی۔ اوپر والے سے کچھ گٹ مٹ کی۔

پھر ذرا گھومنے پھرنے نکل پڑی۔ اِن عمارتوں میں کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں کے سفارت خانے بھی تھے۔ اور یہیں گھومتے پھرتے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ یہ مریم تھی۔ گیمبیا کے سفارت خانے کی ملازم۔ خوب گپ شپ رہی۔ دفعتاً اس نے پوچھا۔

''چین بارے کیا کہتی ہیں؟''

''ارے بھئی میری کیا اوقات کچھ کہنے کی۔ یہاں تو دُنیا محو حیرت ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہیں ایسا ہی ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ فون نمبر کا تبادلہ ہوا اور میں واپس اسی جگہ آبیٹھی کہ اب اُن میوہ جات سے کچھ شغل کروں جنہیں جیب میں بھر کر لائی تھی۔ اور جب میں باداموں کو ایک پھکے کی صورت منہ میں ڈال رہی تھی میں نے اُسے دیکھا تھا جو کسی ڈرامائی کردار کی طرح نمودار

ہوئی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھے کسی خدائی انعام کی طرح ہی ملی تھی۔ یہ چینی خاتون تنگ شیاؤ تھی جو کسی بادِ بہاری کی مانند آئی تھی۔ سنگی بینچ پر بیٹھنے اور صرف چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد اس نے خوبصورت لہجے والی انگریزی میں میرا نام اور کہاں سے ہوں پوچھا۔ میرے اندر نے خوشی سے جیسے کلکاری ماری۔ پاکستان کا سُنتے ہی اس نے بہت گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھاما۔ وہ پاکستان تین مرتبہ جا چکی تھی۔ اجوکا اور پیرو تھیٹر سے واقف تھی بلکہ مدیحہ گوہر سے مل بھی چکی تھی۔

پھر ایک اور عجیب سی بات ہوئی۔ اس نے ذرا رازداری سے پوچھا تھا۔

''آپ کا خدا پر یقین ہے۔'' اِس بار میں نے گہری نظر سے اُسے دیکھا۔

بیٹی اور داماد کی باتوں سے چینی لوگوں کے عقائد بارے جو کچھ بھی سُننے کو ملا تھا اس میں خدا تو کہیں نہیں تھا۔ یہاں بہت گہری بات ہی اِس حوالے سے تھی۔ چند لمحے اُسے خاموش مگر قدرے حیرت بھری آنکھوں سے تکتے رہنے کے بعد بولی۔

''یقین کو تو پیچھے کرو۔ میرا تو سب کچھ وہی ہے۔ رگوں میں دوڑتے خون کی طرح۔ وہ عیسائی عقیدہ سے جڑی ہوئی تھی۔ انگلینڈ کے دی چرچ اف گاڈ سے منسلک رضا کارانہ کام کرتی تھی۔ بے شمار ایوارڈز اور انعام جیت چکی تھی۔ Queen's ایوارڈ بھی اُسے مل چکا تھا۔

لاؤشی ٹی ہاؤس کے اوپیرا تھیٹر سے بھی وابستہ رہی تھی۔ جب بقول اس کے اُسے ہدایت ملی تو زندگی کی پٹڑی بدل گئی۔ خدا سے جڑ گئی۔ اس کے بندوں کی خدمت میں جت گئی۔

لاؤشی ٹی ہاؤس کے اوپیرا سے تعلق کا سُن کر میں نے اُسے غور سے دیکھا تھا۔

شاید اس لیے کہ عمران کا اسی میں مجھے او پیرا دکھانے کا پروگرام بھی تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔ رقص و موسیقی اور آرٹ و ادب سے میری چار پیڑھیاں جڑی ہوئی ہیں۔ میری نانی نے اپنی آنکھوں کا دان دیا۔ اپنی جان نذر کی۔ ماؤ کی بیوی اور اس کے کارندوں نے اُسے، اس کے شوہر، اس کی دوست سبھوں کو سولی پر چڑھا دیا تھا۔

ماؤ سے بہر حال عقیدت اور شخصیت پرستی والا ایک رشتہ تو جڑا ہوا تھا۔ لگا تھا جیسے اس کے لفظوں نے اس میں آناً فاناً دڑاریں ڈال دی ہیں۔ اب کھوج کہ جانوں کہ جیل کیوں گئی اور اندھی کیسے ہوگئی؟

اور جب اِس خواہش کا اظہار ہوا تو بولی۔

''میرے گھر آؤ گی تب تفصیل جانو گی۔''

اس کا گھر وہیں قریب ہی تھا۔ میری بے تابانہ خواہش کے اظہار پر اس نے کہا کہ وہ کسی دن مجھے اپنے گھر لے کر جائے گی۔ اس کی ایک ساڑھے چار سال کی بچی ہے جسے اس کی والدہ سنبھالتی ہے۔ شوہر گذشتہ ہفتہ بھر سے کام کے سلسلے میں جنان Jinan گیا ہوا ہے۔ یہ یقیناً چین کا کوئی شہر ہوگا۔ قیاس خود ہی کر لیا تھا۔

میں نے اُسے آئس کریم کی دعوت دی۔ مارکیٹ زیادہ دور نہ تھی۔ یہاں میں سعدیہ کے ساتھ دو تین بار آ چکی تھی۔ روسی سپر سٹور تھا۔ روسی لڑکیاں انگریزی میں کچھ دال دلیہ کر ہی لیتی تھیں۔ آئس کریم کھاتے ہوئے میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مجھے پرانے بیجنگ اور اس کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کی جھلکیاں دکھانے میں مدد دے سکتی ہے؟ اس کے اظہار میں میری ہچکچاہٹ کے ساتھ ساتھ کچھ ڈھکے چھپے اور کچھ کھلے لفظوں میں یہ پیشکش بھی تھی کہ میں اس کی خدمات کا ایک مناسب سا معاوضہ بھی دینے کو تیار ہوں۔

اُس نے اِسے سمجھا اور اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔

جس مذہب سے میں وابستہ ہوئی ہوں۔ وہ صرف انسانوں کی خدمت کے لیے کہتا ہے۔تم بوڑھی بھی ہواور لکھاری بھی۔ میرے ملک پر لکھنے کی خواہش مند ہو۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ پرانے بیجنگ میں اگر تم نے لاؤشی ٹی ہاؤس نہ دیکھا تو پھر کچھ بھی نہ دیکھا اور لاؤشی جیسے عظیم لکھاری اور فنکار بارے کچھ نہ جانا۔اور ہاں آپ نے میری نانی وانگ نینگ اور چین کی سدابہار مترنم گلوکارہ چھانگ چھوان بارے بھی کچھ نہ پڑھایا نہ سُنا تو پھر بھلا چین آنے کا فائدہ؟ اُن کی کہانیاں سُن یا پڑھ کر آپ کے دل سے درد نہ اٹھایا آپ کی آنکھ سے چند آنسو نہ ٹپکے تو پھر بھلا چین آنے کا فائدہ؟

اُس کی باتوں نے مجھے دم بخود کر دیا تھا۔ میں ہڑ بڑ اس کا چہرہ دیکھتی تھی۔اس نے میرے چہرے پر پھیلے ہونق پن اور حیرت کو دیکھا اور بولی۔

چین کی تاریخ اِن ناموں کے بغیر ادھوری ہے۔ظلم جبر آمریت کے تندوتیز اندھے بگولوں میں لپٹے یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے سچ کے لیے آواز اٹھائی۔ان کے بارے پڑھنا،سننا تو بہت ضروری ہے۔اور میں اِس کام میں آپ کی جی جان سے مدد کروں گی کہ یہ تو میرا فرض ہے۔

اس کی باتوں سے میری تو روح تک سرشاری میں بھیگ گئی۔

''اف اللہ۔احسان عظیم تیرا۔''

تو کیسا مسبب الاسباب ہے۔ چلتے چلتے میں نے اس سے یہ بھی التجا کی کہ وہ میرے گھر آئے۔ میری بیٹی اُس سے مل لے گی تو اس کی بھی تسلی ہو جائے گی۔اوکے کہتے ہوئے وہ جس خوشدلی سے مسکرائی جی اس پر قربان ہونے کو چاہا تھا۔

☆☆☆

باب نمبر:۱۸ ثقافتی انقلاب کی داستانیں

- o چھانگ کی آواز میں سروں کا جہاں بولتا تھا۔
- o چواین لائی فن اور فنکار دوست شخصیت تھی۔

اور آج وہ مجھے لینے آئی تھی۔ وہ جوتنگ شیاؤتھی۔ غیر معمولی پھولی گالوں والی جن میں پھنس کراس کی آنکھیں بس سرمے کی سلائی جیسی نظر آتی تھیں۔اس کا جسم بھی کچھ زیادہ ہی بھرا بھرا تھا۔اصل میں میٹھی بہت تھی نا۔

سمجھ نہیں آتی تھی کہ تنگ کے پاؤں تلے ہاتھوں کا راستہ بناؤں یا آنکھیں بچھاؤں۔من کی مراد برآئے تو اس سے بڑی خوشی کیا ہوسکتی ہے؟ بیٹی بھی خوش تھی کہ چلو ماں کسی ذمہ دار ہاتھ میں ہوگی۔اس کی آنے جانے والی کیچل بھی ختم ہوجائے گی۔اور ماں کا رانجھا بھی راضی رہے گا۔

گو یہاں دونمبری والے تو کام تھے ہی نہیں۔بندے محفوظ اور کھانے پینے کی چیزیں بھی ٹھیک۔مگر ہوا یہ کہ وہ اس دن معذرت کرنے آئی تھی۔اس کی ماں کچھ ٹھیک نہیں تھی۔دوایک دن کے بعد ہی پروگرام بنے گا۔وہ کہتی تھی۔

سچی بات ہے میں کچھ بجھ سی گئی تھی۔یقیناً اُس نے میرے اترے ہوئے چہرے کو پڑھ لیا تھا۔تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''گھبرائیں نہیں۔مجھے پرانا بیجنگ آپ کو ہر صورت دکھانا ہے۔Qianmen سٹریٹ کا حسن رات کو ہی دیکھنے والا ہوتا ہے۔اور ہاں آپ نے میرے گھر آنا ہے۔'' پتہ اس نے سعدیہ کو لکھوا دیا تھا۔

''چلو یہ اچھا ہوا۔کل تو یوں بھی ہمیں فاربڈن سٹی جانا تھا۔'' سعدیہ شگفتگی سے بولی۔

اس نے جانے کی اجازت چاہی تو میں نے ممتا بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''ارے یونہی میری بچی کچھ کھائے پیئے بغیر۔اور ہاں کچھ سُنا بھی دو۔گھر تمہارا ہو یا میرا ایک ہی بات ہے۔''

میں اُسے بانہوں کے ہالے میں سمیٹ کر ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔چار بج رہے تھے۔ظاہر ہے ٹی ٹائم تھا۔

صوفے پر کھلے ڈلے انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے سعدیہ کو مخاطب کیا۔

''چائے میں سموسے پکوڑے چلیں گے۔''

میں نے ہکّا بکّا سی اُسے دیکھا۔

سعدیہ ہنس پڑی اور بولی۔''فکر نہ کریں شامی کباب بھی ساتھ ہوں گے۔''

پتہ چلا کہ سعدیہ کے گھر میں چینیوں کی دعوتوں پر ہمیشہ پاکستانی کھانے ہی بنتے ہیں جنہیں وہ شوق اور مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔اگر کبھی وہ کوئی چائنیز ڈش میز پر سجا بھی دے تو مجال ہے کوئی اُسے ہاتھ بھی لگا جائے۔

تنگ نے ہنستے ہوئے بتایا کہ وہ کبھی کبھی اتوار کی شام خان بابا ریسٹورنٹ پر مٹن کڑاھی اور چپلی کباب کھانے جاتی ہے۔جواب نہیں پاکستانی کھانوں کا۔

صدقے جاواں تیرے تنگ۔جی چاہا تھا آگے بڑھ کر منہ چوم لوں۔

اپنے ملک کی کسی بھی انداز میں تعریف ہو۔بندہ پھولے نہیں سماتا۔کچھ ایسا ہی حال میرا تھا۔

بیجنگ میں خان بابا کا مشہور ریسٹورنٹ سان لی تون Sanlitun میں

ہے۔اسے آنے کے دوسرے دن ہی دیکھ بیٹھی تھی۔رات کے کوئی دوسرے پہر تینوں بچے مجھے زبردستی گھسیٹ کر وہاں لے گئے تھے۔ان کے ماں باپ سفارت خانے کی کسی تقریب میں مدعو تھے۔بیچارے پڑھتے پڑھتے تھک گئے تو خان بابا کے کباب کھانے نکل پڑے۔میں تو دم بخود تھی یہاں آ کر۔یہ تو رنگوں کی، روشنیوں کی، مختلف النوع عمارتوں، ان کے ڈیزائنوں، اُن کے ہار سنگاروں اور رنگ رنگیلے پیرھنوں کی دنیا تھی۔دنیا کا ہر برانڈ یہاں پیر پسارے ہوئے ہے۔ہر فرنچائز کمپنی ادھر ٹھسے سے بیٹھی ہے۔کھانے پینے کے کلب بارز سب موجود۔میکڈونلڈ بھی چمکتا دمکتا تھا۔

شکر ہے پانچویں فلور پر پاکستان کا خان بابا تھا۔جس کے اندر ایک رش کا عالم تھا۔پاکستانی ہی نہیں۔مجتبیٰ بتاتا تھا انڈین زبھی بہت ہیں۔چینی بھی دکھتے تھے۔اب اِن میں شمالی اور جنوبی کوریائی ہیں یا جاپانی بھی ہیں۔اس کا پتہ لگانا مشکل۔چہرے کی ٹھیکری ہی ایک جیسی نہیں خدوخال بھی ایک سے ہیں جیسے ہم برّصغیر کے لوگ۔

فاطمہ بتاتی تھی۔پاکستانی سفارت خانہ یہاں سے بس میل بھر کے فاصلے پر ہے۔یہاں سفارت خانے بھی بہتیرے ہیں۔

سعدیہ چائے پانی کی تیاری میں جت گئی اور میں اُس کے ساتھ باتوں میں۔اندر کھاتے تو بہت کچھ جاننے کی تڑپ تھی۔یہ اور بات تھی کہ جب جاننے کا سوال ہونٹوں پر آیا تو اس نے گہری یاس بھری مسکراہٹ سے کہا تھا۔

’’دراصل اس دن میں بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔سوچتی ہوں اب اِس نانی، اس کی سہیلی اور دیگر بے شمار لوگوں والے گڑھے مردے کب تک اکھیڑتی رہوں گی؟ کچھ اور باتیں کرتے ہیں۔‘‘

’’ترقی کی شاہراہ پر چھلانگیں اور فلائنگ ککیں مارتی قوم یہاں تک کیسے پہنچی ہے؟

اب میں ہزاروں کوس دور سے پینڈے مارتی ایسے تو نہیں آئی۔ کچھ جاننے کی تڑپ ہی تو لائی ہے۔ اب یہ بھی نہ سُننے کو ملے تو پھر فائدہ؟''

''بڑی دردناک کہانیاں ہیں اس دور کی بھی۔ سوچتی ہوں عروج و زوال کے المیوں میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں قومیں فتنہ و فساد کی نوک پر ہی رہتی ہیں۔

میری نانی وانگ نینگ رقص کی ماہر ہی نہ تھی۔ شاعرہ بھی تھی۔ ڈرامہ نگار بھی تھی اور تنقید کے لیے بھی شہرت رکھتی تھی۔

اس کے بچپن کی عزیز دوست چھانگ چھوان تھی۔ چھانگ کی آواز میں جیسے سروں کا جہان بولتا تھا۔ ایسا جہان جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ ہواؤں میں اڑتے پرندوں کے کانوں میں اگر وہ سر چلے گئے تو پرندوں کا پھڑ پھڑاتے ہوئے زمین پر گرنا لازمی ہے۔

یہ موسم بہار کے دن تھے جب پیکنگ (بیجنگ کا پرانا نام) کے امریکی سفارت خانے کی ایک تقریب میں دونوں سہیلیوں کو اپنے اپنے فن کے مظاہرے کی دعوت دی گئی۔ اس وقت چین ابھی اتحادیوں کا غلام تھا۔ محفل کو دونوں نے لوٹا تھا۔ دونوں کو امریکہ کی آرٹ اور میوزک یونیورسٹیوں میں تعلیم کے لیے وظیفے کی پیش کش ہوئی۔ نانی نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا کہ میرے بڑے ماموں بہت چھوٹے تھے مگر ان کی دوست چھانگ چھوان نے اس سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ دونوں بچے ساتھ تھے۔ اور اجنبی ملک میں مسائل کا بھی سامنا تھا۔ ہمت، حوصلے سے اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے چھوٹے موٹے کام کیے۔ گریجوایشن پھر پوسٹ گریجوایشن کی۔

چین کی آزادی پر اس نے ہماری نانی کو جو خط لکھا وہ آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہ ایسٹ مین اسکول آف میوزک نیویارک سے لکھا گیا تھا۔ پیار و آداب کے بعد

چھا نگ لکھتی تھیں۔

تم یقین نہیں کروگی کہ میں کتنی خوش ہوں۔ نیو یارک ٹائمز کے پہلے صفحے پر اپنے محبوب لیڈر ماؤ کو ہاتھ میں پیپر پکڑے تھین آن من سکوائر کی شہ نشین سے چین کی آزادی کا اعلان کرتے دیکھ کر کسقدر خوش ہوں۔

وانگ میں نے واپسی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ یہاں میرے دوستوں اور خیر خواہوں کا کہنا ہے کہ میرا یہ احمقانہ فیصلہ ہے۔ چین ابھی مسائل سے گھرا ہوا ملک ہے۔ ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار۔ مگر وانگ میری تو روح پیاسی ہے جسے وطن کی فضائیں ہی سیراب کرسکتی ہیں۔ اور یوں بھی دیکھو نا میں نے کتنا کچھ حاصل کیا ہے؟ تو اب میرا فرض ہے کہ میں اِسے اپنے دیس کو واپس لوٹاؤں۔

میری نانی اور چھانگ چھوان کی یہ داستان میرے بچپن کی وہ اساطیری کہانی ہے جو میں بار بار اپنی ماں سے سُنتے نہ تھکتی تھی۔

یہ دن میری نانی کے لیے امیدوں اور امنگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ معاشی حالات گو بہت ابتر تھے مگر اُسے تو جیسے کسی بات کی پرواہ ہی نہ تھی۔ اس کی جان وجگر وطن لوٹنے کا تہیہ جو کر بیٹھی تھی۔

ہاں ایک بات اُسے پریشان کرتی تھی۔ حکمران پارٹی کے ممبران کی ایک تعداد طفلانہ اور بعض اوقات متعصّبانہ رویے اپنائے بیٹھی تھی۔ یورپ بالخصوص امریکہ سے آنے والے چینیوں کی وفاداری پر مشکوک سے انداز، کسی صحیح بات پر بھی ان پر دائیں بازو سے تعلق کا ٹھپہ لگانے اور اُنہیں ذلیل کرنے کے ہتھکنڈے اور کوشیش بہت خطرناک تھیں۔ اس نے یہ سب کچھ ڈرتے، کچھ جھجھکتے چھانگ کو لکھ بھی دیا تھا۔ اور وہ خوش تھی کہ چھانگ نے اپنا ارادہ نہیں بدلا تھا۔

اور پورے تین سال بعد وہ آ گئی۔ وہ آئی۔ اس نے چین پر ایک نظر ڈالی۔ پیکنگ کو دیکھا اور وہ چھا گئی۔

سعدیہ کا ٹرالی گھسیٹتے ہوئے آنے کے شور نے ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

تنگ ہنسی۔ ''پاکستانی خاطر مدارت مزہ آئے گا۔''

شامی کبابوں کو اس نے رغبت سے دیکھتے ہوئے اپنی پلیٹ میں ایک نہیں دو ڈالے۔ میں نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے ایک اور رکھ دیا۔

''ارے نہیں نہیں پہلے اِن سے تو نپٹ لوں۔''

سعدیہ چینی مزاج آشنا تھی۔ یقیناً اسی لیے ٹرالی میں ایک بھی میٹھی چیز نہیں تھی۔ قہوہ ہماری پتی کا تھا۔ کڑوا کسیلا گھونٹ بھرتے ہوئے اُس نے بات کو وہیں سے جوڑا جہاں سے چھوڑا تھا۔

پہلا کنسرٹ جو بیجنگ میں ہوا وہ فیصلہ کن تھا۔ لوگوں کی غیر معمولی تعداد جن میں نمایاں شخصیت وزیر اعظم چواین لائی کی تھی ہال میں موجود تھی۔ اس کی آواز کے جادو نے پورے ہال کو مسحور کر دیا تھا۔ وزیر اعظم نے خوبصورت انداز میں اُسے خراج پیش کرتے ہوئے کہا۔

وہ بیرونی دنیا سے آنے والے سب فنی ماہرین، دانشوروں، فن کاروں اور آرٹ لورز کو خوش آمدید کہنے اور ان کا شکریہ ادا کرنے میں بے پایاں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ چین کی تعمیر نو میں ہمیں ہر قدم پر ان کے تعاون کی ضرورت ہے۔ چھانگ چین آپ جیسی فنکار پر نازاں ہے۔

دونوں دوستوں کا فن عروج پر تھا۔ جذبوں پر بھی شباب تھا۔ چیزوں کو جانچنے

، پرکھنے اور انہیں میرٹ پر دیکھنے میں چھا نگ کی نظر میں جو گہرائی تھی اس میں اس کا بیرونی دنیا کا تجربہ بولتا تھا۔ وہ پورا یورپ گھومے ہوئے تھی۔۔ان کے آرٹ میوزیم، کنسرٹ ہالز اور اوپیرا ہاؤسز کا فنی مطالعہ کیے ہوئے تھی۔اس کی وسعت نظری کو سرکاری اوپیرا ہاؤس میں بہت سی خامیاں نظر آتی تھیں۔ وہ یہ سب باتیں میری نانی سے کرتی تھی۔

اکثر و بیشتر کہہ اٹھتی۔'' وانگ تم لکھو تمہاری تحریر میں حسن بھی ہے اور کاٹ بھی۔احساس دلاؤ انہیں۔ رجعت پسند سوچ اور رویے سے باہر آنے کی ضرورت ہے۔''

میری نانی نے بھی کچھ نہ سوچا۔ بہت تفصیلی مضمون لکھا اور اُسے ادبی گزٹ میں چھپوادیا۔مرکزی کمیٹی کے رجعت پسندوں کے لیے یہ سب نا قابل برداشت تھا۔ایک ایسے اوپیرا ہاؤس پر تنقید کی بارش ہوئی تھی جو مرکزی کمیٹی کے عہدے داران کے تابع تھا۔جس کی قیادت ماؤ کی شیطان صفت بیوی چیانگ چھینگ کرتی تھی۔بس تو میری نانی کو اٹھا کر جیل پھینکا اور چھانگ کو اس کے شہر میں نظر بند کر دیا گیا۔

یہ کسقدر ستم کی بات تھی کہ چھانگ کا شوہر مُوکوئی شین جو ایک ماہر آرکسٹرا کنڈکٹر تھے میرے نانا جو ایک نامور شاعر تھے کو بھی سزا کے لیے چن لیا گیا۔دونوں کو شمال مشرق کے لیبر کیمپوں میں پھینک دیا گیا۔مشقت، خود کو تبدیل کرنے کا پریشر اور ناقص غذا جس نے بالآخر نہ صرف موکوئی کو بلکہ میرے نانا کو بھی اگلے جہاں پہنچادیا۔

نانی جیل میں آنکھوں کی ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوئی جس نے انہیں اندھا کر دیا۔اور یونہی ایک دن وہ بھی ختم ہوگئی۔

ایک دہائی گزر گئی تھی جب کہیں ایک دن چواین لائی کو چھانگ یاد آئی۔ پتہ کروایا کیس کا مطالعہ کیا تو جانا کہ وہ ہیرا سی فنکارہ ظلم کی کس چکی میں پس رہی ہے؟

خصوصی توجہ اور اختیارات کے استعمال سے اُس پر سے دائیں بازو کا لیبل

ہٹایا گیا اور اُسے بیجنگ کنسرٹ میں آنے کی دعوت دی۔

چھانگ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔مقررہ دن وہ تقریب میں شامل ہوئی۔اس کے پرانے ساتھی، اس کے مداح اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔اس کی مترنم آواز کے جادو نے آج بھی محفل کو اسی طرح سحر زدہ کیا تھا۔گیت اختتام پر تھا جب چواین لائی ہال میں داخل ہوئے۔سریلے سُر کا اُتار پورے ماحول کو گویا مٹھی میں جکڑ چکا تھا۔آواز خاموش ہوئی اور ہال میں تالیوں کی گونج میں چواین لائی بھی تالیاں بجاتے اسٹیج کی طرف بڑھے جہاں چھانگ سر کو نیم خم کیے حاضرین کا شکریہ ادا کرتی تھی۔چواین لائی نے اس کا ہاتھ تھاما اور میٹھی سی مسکراہٹ میں نہاتے چہرے سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’تمہاری آواز سدا بہار ہے۔یہ مسحور کرتی، جادو جگاتی اور دل کی دنیا کو زیروزبر‘‘ کرتی چلی جاتی ہے۔

چھانگ کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے جو اس کے صبیح رخساروں پر اک پل رکے اور پھر اس کی ٹھوڑی سے نیچے کہیں ٹپک گئے۔

اور چواین لائی کی خواہش پر چھانگ نے ان کے ساتھ رقص کیا۔رقص کرتے ہوئے انہوں نے میری نانی، اس کے شوہر، بچوں اور میرے نانا بارے پوچھا۔جان کر وہ مہربان سا انسان دکھی ہوا۔اس کے تسلی آمیز لفظوں اور دوستانہ رویے نے چھانگ کی دلجوئی کی۔اس کے زخموں پر پھاہے سے رکھے اور وہ اِس یقین سے رخصت ہوئی کہ ریاست اس کے دکھ کا ازالہ اور اپنی غلطی کا مداوا کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

اور اگلی بار ریاستی سطح پر اس کا اظہار بھی ہوا کہ جب ایسے ہی ایک پروگرام میں چواین لائی نے اُسے بھرپور خراج پیش کرتے ہوئے پارٹی اور حکومت کی جانب سے سراہا۔مگر یہ سب عارضی ثابت ہوا۔کچھ ہی عرصے بعد ثقافتی انقلاب کے نام پر دائیں بازو

سے تعلق، انقلاب دشمن، غدار، دشمن کے ایجنٹ جیسے ناموں والی زہریلی ہوائیں چلنا شروع ہوگئی تھیں۔

چھانگ ایک بار پھران ہواؤں کی لپیٹ میں تھی جنہوں نے ہر اس شخص کا گلا گھوٹنے کی کوشش کی جن کی روشن خیالی، چین سے باہر کی تعلیم، اظہار رائے میں جھوٹ اور منافقت سے گریز شامل تھا۔

بھلا کونسا ذلت آمیز خطاب ایسا تھا جو اس پر لگایا نہ گیا۔ وہ غیر ملکی جاسوس ہے۔ اس الزام کو منوانے کے لیے ہی تشدّد کی انتہا کردی گئی۔ دراصل ماؤ کی بیوی چیانگ چھینگ Jiang Qing اوراس کے ساتھیوں سے وہ برداشت نہیں ہوتی تھی۔ پس منظر میں چواین لائی تھے جو چیانگ کے عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔

ماؤ کی وفات کے بعد اُسے تمام الزامات سے بری کیا گیا۔ سٹیج کی دنیا میں واپسی کے بعد اُس نے مرحوم وزیر اعظم چواین لائی کو جو منظوم خراج پیش کیا وہ نغمگی، موسیقیت اور احساسات کی گہرائی کے اعتبار سے شاہکار سمجھا گیا۔ جب ہم چھوٹی الا یچی کا خوشبوئیں اڑاتا تازہ قہوہ جو سعدیہ ابھی ابھی ہمارے ہاتھوں میں تھما کر گئی تھی اور جسے ہم گھونٹ گھونٹ پیتی تھیں۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی۔ مجھے نہیں پتہ تنگ کی سوچیں کیا تھیں؟ ہاں البتہ میرے سامنے ملکوں کی قوموں کی تاریخ تھی۔ ظلم وجبر کی کہانیاں اگرچہ چار دس ہاتھ پرے کی تھیں تو وہیں ہم مسلک نظریاتی ساتھی روس تو ہاتھ بھر کے فاصلے پر تھا۔ کیمونسٹوں کا دور، سٹالن کا The Great Purge تو ابھی کل کی بات تھی۔ مخالفین کے سروں کی کھوپڑیوں کے میناروں اور لیبر کیمپوں کی رونگٹے کھڑے کرنے کی داستانیں۔

''ہائے میرے پروردگار یہ تیرا اشرف المخلوق بھی کیا شے ہے؟''

☆☆☆

باب نمبر:۱۹ شہر ممنوعہ سے ملاقات

- چینی بادشاہوں کو ہمیشہ دنیا کی ہر چیز کے مرکز میں رہنا پسند تھا۔
- شہر ممنوعہ کا تعمیری ڈھانچہ اسی خیال کی بنیاد پر کھڑا ہے۔
- آٹھ کلومیٹر کے رقبے پر پھیلے اِن محلات کے رڑے میدان بابے اور بابیوں کے لیے بڑی آزمائش ہیں۔
- اس طلسمی دنیا کا منفرد فن تعمیر ہر قدم پر نئے جہان وا کرتا تھا۔

صبح ہی کچن میں ناشتہ کرتے ہوئے فوجی نے اعلان کر دیا تھا۔ سامان شامان تیار کر لیں۔ پیٹ پوجا کے لیے مزیدار چیزیں ساتھ چلنا ضروری ہیں۔ کڑا امتحان ہے تمہارا۔''

اس نے بیوی کو سُنایا۔ 180 ایکڑ کی پیمائش کرنی ہے آج۔

''نہیں بھئی بازو بیلنے میں نہیں آیا ہوا ہے۔ بس ہمیں تو جو اچھا لگے گا وہی دیکھیں گے۔''

اب میرے ہونٹوں پر اِس شکوے کا آنا تو بنتا تھا نا۔ ''کیا تھا جو جوانی میں آنا مقدر کر دیتا۔ تیری دنیا کو جی بھر کر توروندتی۔''

ساتھ ہی اندر سے لتاڑ پڑی۔ ''واہ نی ماں صدقے تیرے۔ اتنی تیری اوقات کہ اُس کی کائنات کو روندنے چلی ہے۔''

سچی بات ہے بہت سے ملکوں کے بادشاہوں کے مشہور اور شاندار محل دیکھ بیٹھی ہوں۔ پر اُن کا پسارا اور کھلارا اتنا تو نہ تھا۔ جتنا ان منگ بادشاہوں کے محلوں کا ہے۔ چلو میرے تو گھٹے گوڈے بیمار شیمار ہیں۔ پر اِس آٹھ کلومیٹر کے لمبے چوڑے رقبے پر پھیلے محل کو

دیکھنا تو جوانوں کے لیے ممکن نہیں۔''

''میرے اللہ اندر کوئی ویل چیئر یا کارٹ کریج کا بندوبست ہو۔''

اب اسے کیا کہوں کہ اندر ایسا کچھ انتظام نہ تھا۔عمران تو یونہی طفل تسلیاں دے رہا تھا۔اندر جانے کا واحد راستہ جنوبی سمت سے ہے۔یہ میریڈئین Meridion گیٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ٹکٹوں کا بکھیڑا نہیں تھا کہ عمران نے منگا لیے تھے۔خلقت ہی خلقت۔مولا ابھی تو شکر ہے ویک اینڈ نہیں تھا۔

اور جب اندر جانے کے لیے فصیل کے پہلو میں بنے کشادہ کھلے راستے پر چلنے لگے تو خیال آیا یہ بادشاہ بھی کتنے ذلیل ہوتے تھے۔یہاں آنے کی عام لوگوں کو کب اجازت تھی۔خاص لوگ آتے تھے۔یہ خاص عام کے چکر بھی تھے اور آج بھی اسی شدت سے کارفرما ہیں۔

تو آج میریڈئین Meridian گیٹ کے سامنے کھڑی کہیں اس بڑے جثّے والی عمارت، کہیں اس کے پہلو میں تمکنت سے بیٹھی اسی حال حلیے والی بس ذرا قد وقامت میں کچھ مانو جیسے اس کی دو چھوٹی بہنیں ہوں،ان کے ساتھ ارغوانی رنگی دیوار میں بنے محرابی دروازوں کو دیکھتے ہوئے خود سے کہتی تھی۔

''دیکھو نا کیسی خوبصورت ہوائی طشتریاں لگتی ہیں جیسے کہ بس ابھی اڑ پڑ جائیں گی۔''

بیریئر کے تنگ سے راستے میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا۔

''ارے ہاں مجھے تو اندر بیچ والے دروازے سے جانا ہے کہ چینی بادشاہ اسی سے جاتے تھے۔پر یاد آیا کہ چینی بادشاہ تو خود کو جنت کے بیٹے خیال کرتے تھے۔اسی لیے انہیں

ہمیشہ دُنیا کی ہر چیز کے مرکز میں رہنا پسند تھا۔ شاید کیا یقیناً اسی لیے اِس شہرِ ممنوعہ کا تعمیری ڈھانچہ اسی خیال کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ ہاں ایک رعایت اُس خصوصی دن اُس شہزادی کو حاصل ہوتی تھی جو صرف دلہن بن کر اپنی شادی والے دن یہاں سے گزرتی تھی۔ پر میں نہ کہیں کی شہزادی، نہ راجکماری نہ ملکہ ایک مزدور عورت، اللہ کی گنہگار بندی جسے اپنے دوزخی ہونے کا پورا یقین ہے۔ بہتر ہے اپنی اوقات میں رہوں۔

یوں یہ اور بات ہے کہ شاہوں والے دروازے سے اندر داخل ہونے کی تو اجازت ہی نہیں تھی۔ کہ وہ دروازہ ممنوعہ تھا۔ حیرت ہوئی۔ کیا آج بھی وہ خاص لوگوں کے لیے ہے یا ایسا وقتی طور پر تھا۔ ہاں جب رُک رُک کر ہجوم کا خیال رکھتے ہوئے کہیں اس کے اندر کے حُسن اور کہیں اس کے عامیانہ پن کو جذب کرتی تھی تو سوال اور جواب کے سلسلے بھی ساتھ ساتھ ہم رکاب تھے۔

ہمیشہ کی طرح مزدور آدمی کی اس بیٹی کی سوئی اس بات پر اٹک جاتی ہے کہ ہائے ان محل ماڑیوں کو بنانے میں لوگوں نے کیسے دیوہیکل پتھروں کو ڈھویا ہوگا۔ برف سے اٹے پڑے پھسلوان راستوں پر شدید سردیوں میں کن کن اذیتوں سے گزرتے ہوں گے۔

اب پھر خود سے کہتی ہوں ''ٹھیک ہے بھئی گزرے ہوں گے۔ پر یہ میرا ہمہ وقت شاہوں کو لعن طعن کرنا بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ ہماری تمہاری اور دنیا کی موجودہ حکومتوں کے عوامی سربراہوں یا ذرہ بکتر والے وہ اور اُن کی آج کی محل ماڑیاں کسی طرح بھی اِن محلوں سے کم ہیں کیا؟ بندہ پرتو مار کر دیکھے ان کے شاہی دروازوں پر۔ مُنڈی نہ مروڑ کر رکھ دیں محافظ۔ آج کے یہ بیچارے بے بس لوگ بھی اِن ایکڑوں میں پھیلے گھروں میں ایسے ہی کہیں برفیلے اور کہیں تپتے دنوں میں اپنا خون پسینہ بہاتے ہیں۔ تو واویلا مچانے کی قطعی ضرورت نہیں۔''

پھر ایک اور سوچ نے دروازہ کھول لیا تھا۔

مگر یہ احساسات شاید کہیں میرے تعصب کی بنیاد پر تو نہیں ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ایسا محفوظ اور شاندار اثاثہ نہیں۔ لاہور قلعہ ضرور ہے پر کس شکستگی سے دوچار ہے۔

اب ایک اور پھٹکار پڑی۔ ''جاہلوں والی باتیں کرتی ہو اتنا بہت کچھ ہے۔ مگر سنبھالنے کا سلیقہ نہیں۔ ان کی نقاب کشائی کا طریقہ نہیں۔ چینی اس پر نازاں تو ہیں نا۔ ہمیں تو اِس کی بھی تمیز نہیں۔ دیوارِ چین کے بعد یہ انہیں دُنیا بھر میں ممتاز کیئے ہوئے ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا محل ہے۔ اس کا متاثر کن طرزِ تعمیر اور رنگا رنگ ہائے مجموعہ جات چین کے امیرانہ ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی خوشبو کو سنبھالنے کی زندہ گواہی ہیں۔''

تو Mardian gate سے جب اندر داخلہ ہوا تو مجھے خود کو کسی خوبصورت اور دلکش سے وسیع و عریض قطعہِ زمین میں کھڑے ہونے کا احساس ہوا۔ دھوپ اگر چنگھاڑتی تھی تو ہواؤں کی تیزی اور اس کے سراٹے اس سے بھی تیز تھے۔ چلنا تھا۔ پیدل چلنا تھا۔ قہر درویش بر جان درویش والا معاملہ تھا۔

پختہ فرش، تاحد نظر پھیلی ہوئی زمینی وسعتیں جن کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے رنگوں کے پگوڈا یونٹ بنے ہوئے۔ پھر جیسے گولڈن واٹر برج Golden Water Bridges کسی صحرا میں کھلے جنگلی گلاب جیسے یا کسی نخلستان کی طرح نمودار ہوا۔ اس کے سفید ماربل کے ٹیڑھے میڑھے بل کھاتے پلوں کے نیچے ندی نالے بہتے تھے۔

بڑا موہ لینے والا منظر تھا۔ لوگوں کے پُرے، نیلا آسمان، ٹھنڈی ہوائیں، میٹھی سی دھوپ اور تاحدِ نظر پھیلا ہوا خاکستری افق، زمینی وسعتیں اور اُن میں جگ مگ کرتی چھجے دار ارغوانی عمارت جو ایک طرح دوسرا گیٹ تھا۔ ایسے حسین اور موہ لینے والے منظر نمودار ہو رہے تھے کہ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئی تھیں۔ چند لمحوں کی اِس دید نے آنکھوں کو بند کر دیا تھا۔ لمبی سانس سینے سے نکلی تھی۔

اف تو یہاں تک آ کر ہی ہانپ گئی تھی۔ ہائے آگے کیسے جانا ہوگا؟اب وہیں ڈھلان سی جگہ پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ ’’دیکھوتو! ہے کہیں بیٹھنے کے لیے کوئی سنگی یا چوبی بینچ۔ توبہ سنگ دلی کی ہے نا انتہا۔‘‘

پانی پیا۔ بادام کھائے۔ کچھ توانائی بحال ہوئی۔ اٹھی اور آگے چلی۔ اب کسی کٹیا میں جلتے چراغ کی روشنی کی طرح ایک سرخ عمارت ٹمٹمائی ۔ یہ The Hall of Suprem Harmony تھی۔ قدم اس کی جانب اٹھتے چلے جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے چلتی تھی اور گالیاں بھی نکالتی تھی چین کی وزارت سیاحت کو۔ کم بختو کچھ تو بوڑھے بابوں اور بابیوں کا خیال کرو۔ یہاں ان رڑے میدانوں میں شٹل سروس یا کارٹ کیرج کا بندوبست ہونا کتنا ضروری تھا؟ ایک دفعہ پھر پہلا کام منزل پر پہنچنے کے بعد بیٹھنے کا تھا۔

سعدیہ نے فلاسک سے چائے کا کپ دیا۔ یہ کپ تھا یا آبِ حیات تھا۔ کیسے مزے سے گھونٹ گھونٹ پیتے اپنے اردگرد بکھری رعنائیاں دیکھتی تھی۔ سامنے ماربل کی سیڑھیاں نظر آ رہی ہیں۔ لوگ دھڑا دھڑ چڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ بھئی جوان ہیں نا۔ سچی بات ہے 30 میٹر کی اس بلندی پر چڑھنا ان کے لیے تو گویا کھیل تماشے والا کام ہے۔ ہاں البتہ ہم جیسوں کے لیے عشوہ طرازیاں اور ناز و ادائیں دکھانے والے کسی محبوب جیسا ہی ہے۔

چائے ختم ہوئی تو اردگرد کے منظروں پر حاشیہ آرائیوں کی بجائے شاہوں کی تواضع ہونے لگی تھی۔ میری تو عقل قاصر ہے کہ ان منگ اور چھینگ Qing بادشاہوں کے گٹے گوڈے کیا چینی کشتوں کے مرہون منت تھے یا پھر ڈنڈے ڈولی والے کہار منتظر رہتے تھے۔ بھئی آخر کچھ تو ہوگا۔ آخر یہ ہر روز کا اُترنا چڑھنا کارے دارد۔

اب اٹھنا تو تھا۔ اٹھی۔ سیڑھیوں کا پل صراط پار کیا۔ برآمدے کے سرخ ستون اور

ان کے پیچھے سانپوں اور حشرات الارض کے جانے کون کون سے نمونوں کی آرائش وزیبائش سے سجے تھے۔ بندہ تو سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ پروردگار یہ تو نے اِس ناشکرے بندے کو کیسے کیسے ہنر اور تخلیقی جدتوں بھرے ذہن دیئے ہیں۔ یہ جو سامنے دیکھ رہی ہوں اگر رنگوں کے خوبصورت امتزاج کو ہی سراہنے لگوں تو سانس بھی رک جائے اور اگر خالق کائنات کی ان تخلیقات کی پیدائش کے اسباب وعلل پر غور کروں تو جیسے حیرتوں میں گم ہو جاؤں۔ سچی بات ہے یہ کریہہ اور خوفناک تصویریں خون رگوں میں جیسے منجمند کر رہی تھیں۔

بعض کمروں میں جانے کی ممانعت تھی۔بس کھلے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر کے منظروں کو دیکھ لیں جتنا دیکھ سکتے ہیں۔

تخت وتاج والے ہال میں جو چھ ستون تھے وہ سب کے سب طلائی تھے۔اف میرے خدایا اُن کی چمک دمک اوپر سے ساری جگہ ڈریگون Motifs سے گھری ہوئی ہے۔رنگوں کا حسن اور ان کی آمیزش کا ایسا شاندار اور خوبصورت ملاپ مجھے یہیں نظر آیا تھا۔ان کی شوخی اور چلبلا پن کہیں سرسوں پھوٹتی محسوس ہو،کہیں سبز پتوں کی تازگی،کہیں بیر بہوٹی جیسی سرخی،کہیں خاکستری۔تخت شاہی کے بارے کہا جاتا ہے کہ صندل کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔جی چاہ رہا تھا قریب جا کر سونگھوں۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ سطوت شاہی کی طاقت وعظمت کا مظہر ومرکز ہے۔ یہ چین کا ابھی تک محفوظ چوبی فن تعمیر کا شاہکار ہے۔

اب کیا کہوں کہ یہ کیسی طلسمی پُر اسرار دُنیا تھی۔ ہر تھوڑے فاصلے پر سرخ پٹوں اور پیتل کی جہازی سائز میخوں جڑی دروازوں والی پگوڈا عمارتیں اپنے من موہنے رنگوں اور نقش ونگاری سے قلب ونظر کو سحر زدہ کرتی تھیں۔تب کھل جا سم سم کی طرح ایک نیا جہاں وا ہو جاتا۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے کچھ یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں عالمِ خواب ہے۔ وسیع وعریض

قطعۂ زمین یا ایلس ان ونڈر لینڈ کی دنیا ہے جس میں داخل ہوگئی ہوں۔ جس کے چاروں طرف سرخ اور کیسری چھوٹے بڑے پگوڈا گھر حیرتوں میں گم کرتے تھے۔

مسرت بھری کلکاری آنکھوں سے نکلی۔ ہونٹوں سے نکلی۔ جی چاہا تھا جھوم جاؤں کیوں کہ عالم سارا مستی میں ہے۔ شہرِ ممنوعہ کی سب سے اہم سب سے بڑی عمارت دعوت دیتی تھی کہ آگے بڑھو، مجھے دیکھو اور جانو میں کیسے کیسے اسرار، کیسی کیسی کہانیاں اپنے اندر لیے ہوئے ہوں۔ یہ جو تمہاری نئی نسل کی لڑکیاں بالیاں جو ماڈرن ڈریس پہنتی ہیں۔ میری شہزادیاں اور ملکائیں ایسے ہی لباس زیب تن کرتی تھیں۔ اِن وسیع و عریض صحنوں میں شاہی تقریبات ہوتی تھیں اور کیا سماں ہوتا تھا تم تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔

منظروں نے طبیعت میں چونچالی تو پیدا کر دی تھی مگر منیر نیازی بھی بے طرح یاد آ رہا تھا کہ ایک کے بعد ایک نیا دریا میرے سامنے آتا تھا جسے تیر کے پار کرنا تھا۔

چھتوں والے محل کے سامنے وسیع و عریض سفید ماربل کے ٹیرس تھے۔ لوگوں کے ہجوم ماربل کی ان سیڑھیوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ سرخ ستونوں کے گرد کھڑے انہیں بہ نظر غائر تکتے تھے۔ برآمدوں میں گھومتے پھرتے اُوپر چڑھ گئی تھی مگر پھر وہیں بیٹھ ہی گئی تھی۔

سچی بات ہے کوئی ان رنگوں اور اُن کی خوبصورتی کا سوچ نہیں سکتا کہ اُن کا اطلاق کِس کِس انداز میں کیا گیا ہے۔ سُرخ تو قدیم چین سے ہی شاہانہ طاقت اور خوشی کے اظہار کا عکاس ہے۔ پیلا اور سُرخ دونوں کی آمیزش ہی سارے شہرِ ممنوعہ میں پردانی کر رہی تھی۔

تو یہی وہ ہال تھا جہاں بادشاہ شاندار تقریبات میں شرکت کرتا تھا۔ جہاں معاملاتِ سلطنت سلجھائے جاتے تھے۔ سب سے بڑا، سب سے شاندار، سب سے خوبصورت اور اہم۔ یہیں بادشاہ کا ڈریگون تخت موجود ہے۔

تو پھر اسے ہی دیکھ لینا کافی تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نگارخانے میں قدم رکھ دیا ہے۔چمکتی ہوئی سونے رنگی چھتوں کی ٹائلیں اور سرخ چمکتی دیواریں اور جابجا کھڑے ستون جو یوں لگتا تھا جیسے چھت کو تھامے ہوئے ہیں۔

یہاں کیا نہیں تھا۔پینٹنگ ،برتن،خطاطی،کانسی Bronze ware اور دستاویزات۔یہاں جو کچھ تھا اس کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ہر چیز بول رہی تھی۔اپنی تاریخی کہانی سُنا رہی تھی۔اپنے قد وقامت اوراپنے بارے بتارہی تھی۔یہاں خزانہ تھا۔بندہ تو فنّی مہارت کے ہاتھوں ہی دم گرفتہ تھا۔گولڈن کپ کی اپنی ہی کہانی تھی۔نسل درنسل پھیلی ہوئی۔

دروازے ،روشن دان ،شاہی کرسی اِس پر سایہ فگن ڈریگون ۔کس کس بات کی تفصیل سناؤں۔سارا شہرممنوعہ تو بادشاہوں کی کہانیوں سے بھرا پڑا ہے،اِن عمارتوں کی کہانیاں ،یہاں بسنے والے شاہی اور غیر شاہی لوگوں کی کہانیاں وہ کہانیاں جو جغرافیائی فاصلوں،آب وہوااورتمدنی تبدیلیوں کے باوجود پوری دنیامیں کم وبیش ایک جیسی ہی ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر:۲۰ تسنیم، سلک مارکیٹ اور سپر پاور چین

- چین ماضی کی بھی سپر پاور رہی ہے۔
- برصغیر کی تہذیبی وتمدنی زندگی چینی سلک بغیر ادھوری تھی۔
- ہمارے تن نے نئی نہیں پرلنڈے کی سوغات شنگھائی کے مزے تو لوٹے ہیں۔

ریشم مارکیٹ بھی ابھی چلنا تھا۔شام ڈھلنے لگی تھی ۔اس وقت ہم سب ریتان Ritan پارک میں سیر اور کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔تسنیم بھی ہمارے ساتھ تھی جو شاپنگ کی بڑی ماہر سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہوں کہ مارکیٹ جانے اور مجھے وہاں گھمانے کی ترغیب ساری کی ساری تسنیم کی تھی تو کچھ غلط نہ تھا۔

سعدیہ نے مجھے تنبیہ بھی کی تھی۔

''تسنیم کو شاپنگ کا کریز ہے۔اور اس کی چوائس بھی بہت اچھی ہے۔اب فقیر فقراء کی طرح اٹھ کر نہ چلی جایئے گا اس کے ساتھ۔ دل کسی چیز پر آجائے تو لے لینا۔ چلو بہوؤں کو ہی دے دینا۔''

ہنس پڑی تھی میں۔ہاں بولی کچھ نہ تھی۔مگر دل میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

''لو بڑی ہیجلی بو بو بھاوجوں کی۔ ٹکے کی چیز نہ خریدوں۔یاد ہے مجھے سب ذرا ذرا۔کِس چاؤ سے دلّی سے کتان سلک کی ساڑھی سستے زمانوں میں سو ڈالر کی خرید کر لائی تھی۔ بڑی والی نے پھیکے منہ اور بیزار ہاتھوں سے لے کر ایک طرف رکھ دی۔شکریہ ضرور کہا پر یوں جیسے تحفے کو قبول کر کے میرے اوپر احسان عظیم کر رہی ہو۔اور رہی چھوٹی والی تو

آنٹی شکر یہ کہہ کر کسی کونے کھدرے میں پھینک دینی ہے سوغات یا تحفہ۔اور جو پھر کبھی اس کی صورت نظر آجائے ناممکن۔ بخشو بی میں تو لنڈوری ہی بھلی۔''

اور رہی دل کی بات۔ بڑا رجّا پُجّا ہے یہ میرا دل اللہ کے فضل وکرم سے۔

تسنیم کو تو میں نے ساری کہانیاں سنا دینی ہیں۔سمجھ دار ہے جان جائے گی کہ بڈھی جان جائے پر دمڑی نہ جائے والی کلاس سے ہے۔

اُسے گھر سے لینے کے لیے بھی میں ہی اوپر گئی تھی۔ بلکہ یہ کہنا کچھ مناسب نہیں کہ میں اُسے لینے گئی تھی۔حقیقتاً تو اس نے مجھے لے کر جانا تھا۔ میں تو یونہی ویلی رن پروہنیاں جوگی کے مصداق بس ادھر ادھر کی منہ ماری چاہتی تھی۔اُسے یاددہانی کروانے کی تو کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔سعدیہ کو بھی نہیں بتایا تھا۔

یہ حکومتی لوگ بڑے تکلفّات اور رکھ رکھاؤ میں پڑنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اطلاع کر کے جانا تہذیب اور ایٹی کیٹس کے زمرے میں آتا ہے۔پسند ہے مجھے بھی یہ۔مگر اس سے آگے جانے میں بھئی ہماری تو جان جاتی ہے۔بڑے کھلے ڈلے لوگ ہیں ہم تو۔ بندہ من کو بھا جائے تو پھر پوتڑوں تک کے راز کھول دیتے ہیں۔ویسے بھی وہ دوست کیسی جس کے بیڈروم میں آپ بے تکلفی سے گُھس نہ سکیں۔جس کے شکنوں سے بھرے پلنگ کی چادر پر ٹھسے سے بیٹھ کر کارڈز نہ کھیل سکیں۔

تاہم تسنیم بیبی بچی تھی۔اِس کے اسی بیبے پن نے مجھے بھی بے تکلف ہونے کا موقع دے دیا تھا۔اس کا میاں شنگھائی یونیورسٹی کا پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھا۔لائق فائق نوجوان۔

جب میں لفٹ سے نکل کر دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی۔ بند کواڑوں کے اندر سے نکلتی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے پوری رہداری کو معطر کر رکھا تھا۔

''تسنیم تم نے میاں کے دل میں اُترنے کا فن اس کے پیٹ کے راستے سے جان لیا ہے۔''

دروازہ کھلنے اوراس کے ہنستے مسکراتے چہرے کو دیکھتے ہوئے میں کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

کسی دقیق سی کتاب کے مطالعے میں گم ڈاکٹر ارشد نے مودبانہ سلام کیا۔کھڑا ہوا۔اپنے قریبی صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ دیا۔

''میاں میں تو تمہاری بیگم کو جانے کی یاددہانی کروانے کے لیے فون کی بجائے خود چلی آئی کہ اسی کے ایما پر آج ریشم مارکیٹ جانے کا پروگرام بنا ہے۔میں نے سوچا۔تسنیم جیسی سوچاری لڑکی کے ساتھ جانے کا تو مجھے بہت فائدہ ہوگا۔اس کی صحبت میں کچھ جاننے کا موقع بھی ملے گا کہ تم جیسے چین کی قدیم وجدید تاریخ سے شناسائی والے شوہر کے علم کی کچھ چھینٹوں نے اسے بھی ضرور بھگویا ہوگا۔

کھلکھلا کر ہنسا۔''ویسے مجھے امید ذرا کم کم ہے۔مگر آزمانے میں کوئی حرج نہیں۔''

نارنگیاں اس نے زبردستی کھلائیں۔چائے کے کپ کے لیے بے پناہ اصرار ہوا۔

''ریتان میں پئیں گے۔'' کہتے ہوئے میں نے اس کا اور ڈاکٹر ارشد کا شکریہ ادا کیا اور نیچے آگئی۔

وہ ریشم مارکیٹ مجھے دکھانے کے لیے کچھ زیادہ ہی پر جوش تھی۔چاہتی تھی کہ میں کپڑے کے اُن نادر نمونوں کو ایک نظر دیکھوں جن کے لیے چین زمانوں سے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔چینی برتنوں اور دیگر مصنوعات کی مارکیٹوں میں گھمانے پھرانے کی بھی شدید متمنی تھی۔

اس کے اِس پیار بھرے جذبے کو میری ممتا نے سراہتے ہوئے سوچا۔

’’وقت بھی کیا ظالم شے ہے۔ جب شوق تھا تو پیسہ نہ تھا اور جب پیسہ آیا تو جوگی بن گئی۔‘‘

بس تو ایسی ہی سوچوں کی گھمن گھیریوں میں مارکیٹ پہنچ گئے۔ زیادہ دور نہ تھی۔ چار منزلہ روشنیوں میں نہائی ہوئی عمارت۔ ہر فلور شاپنگ کے لوازمات سے سجا ہوا۔ شنگھائی کے دلفریب کڑھائی اور رنگوں کے تھانوں کی دید نے میرا جی شاد کر دیا تھا۔ جوانی اور نا آسودہ خواہشوں کی یلغار نے بھی بہت کچھ یاد دلایا۔ سلک کے ڈوپٹے نہیں تھے مگر اس کے علاوہ اتنی بے شمار چیزیں کہ بندہ پاگل ہو جائے۔ کانوں، گلے، ہاتھوں کی انگوٹھیاں اتنے ڈیزائن، اللہ اتنی ورائٹی۔ بندے کی مت ماری جائے۔

میں نے انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہونے کی غرض سے 50 یوآن کا ایک دیوار چین کا سونیئر خریدا کہ جب یکا یک تسنیم نے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ مجھے گھسیٹ کر اس فلور پر لے گئی تھی جو اس کے حسابوں کچھ بہت خاص تھا۔ دراصل تو وہ بیجنگ کی رگ رگ سے واقف تھی۔ کہاں کون سی چیزیں بہترین اور نسبتاً سستی ملتی ہیں۔ کہاں کہاں اور کب کب سیل لگتی ہے؟ بھاؤ تاؤ والا معاملہ تو خیر ہمارے ہاں جیسا ہی تھا۔ آسمان پر چڑھتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے زمین پر بھی آ جاتے ہیں۔

تسنیم کچھ کہہ رہی تھی شاید۔ کیا؟ مجھے تو کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ میں تو اپنے اردگرد دل کش رنگوں کا ایک جہان دیکھ رہی تھی۔ اس نے چنبیلی رنگا تھان کھلوانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ تسنیم پہلے ذرا پورا چکر تو لگا لیں۔

موتیوں کی دکانوں نے روکا۔ دیکھا مگر ٹھہری نہیں آگے بڑھ گئی۔ پورسلین کے برتن تھے۔ گنگ کھڑی انہیں دیکھتی تھی۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر میں نے ذرا مسکینی سے اُسے

دیکھا اور کہا۔

''چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ باتیں کرتے اور کچھ کھاتے پیتے ہیں۔''

''کہاں چلیں گی۔ یہاں ویسٹرن ماہ خوا Mahua ہے۔ بڑا زبردست قسم کا ریسٹورنٹ جس کی لامیان Lamian کھائیں گی تو یاد رکھیں گی۔''

''لامیاں۔'' میری آنکھوں کی حیرت پر اس نے کہا تھا۔

''اپنی زبان میں اسے ہاتھ سے بنی سویاں کہوں گی۔ ہاں اِس دیس والے اِسے نوڈلز کہتے ہیں۔ مزے کی چیز ہے۔''

''ہاں''

تسنیم نے پھر میری طرف دیکھا تھا۔ بولی تھی۔ اِس کے ساتویں فلور پر مرچ مصالحے کا ایک ریسٹورنٹ بھی ہے جو ہندوستانی کھانوں کے لیے بہت شہرت رکھتا ہے۔ ریسٹورنٹ ہے تو کِسی پاکستانی کا مگر چلاتے اِسے ہندوستانی لوگ ہیں۔ کھانے بھی مشرقی پنجاب اور ساؤتھ انڈیا کے ہیں۔

ایک لمحے کے لیے میرے اندر ڈوسا کھانے کی خواہش ابھری پر اگلے لمحے ہینڈ میڈ سویوں کی ہڑک غالب آگئی تھی۔

اوپن کچن میں سویاں بننے کا عمل عروج پر تھا۔ بڑے بڑے میدے کے لچھوں کے ساتھ کھینچ تان کا سلسلہ کِس جان جوکھوں سے جاری تھا۔ یادوں میں اماں ابھری تھیں ۔گھر کی چھت اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ سامنے تھی۔ اس چھت پر صبح کا منظر پوری دلفریبیوں سے جھلملایا تھا۔ ہاتھوں میں لہراتے لمبے لمبے میدے کے مشین سے نکلے لچھوں کے گچھے جنہیں چھت پر بندھی رسیوں پر لہرا لہرا کر ڈالا جاتا تھا۔

اس وقت میرے سامنے جدّت کے منظر تھے۔ مگر تھیں تو وہی لمبی لمبی موٹی سویاں

جن سے ہماری پیاری یادوں کے سلسلے جڑے ہوئے تھے۔

اُس نے ڈمپلنگ Dumpling کا بھی آرڈر کر دیا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ضد نہیں کرنی تسنیم۔ اتنے مختصر سے وقت میں جان چکی ہوں کہ تم بہت دریا دل ہو۔ مگر بل آج میں ادا کروں گی۔ اور ہاں جان بحث نہیں۔''

اور جب ہم انتظار کرتے تھے اور میرے دیدے گردوپیش کے جائزے میں بھی مصروف تھے۔ میں نے سُنا تھا تسنیم کہتی تھی۔

''آپ کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے شاید۔ ورائٹی بہت ہے نا۔ ابھی تو دو تین جگہیں ایسی ہیں جہاں کپڑے کی وہ نادر اقسام ہیں کہ بندہ تو ٹک ٹک دیدم ودم نہ کشیدم کی مثال بن جاتا ہے۔''

ڈمپلنگ واقعی بہت لذیذ تھی۔ اُس کی بائٹ سے لطف اٹھاتے ہوئے میں نے کہا۔

تسنیم میرے بچپن اور جوانی نے چین اور جاپان کے بہترین کپڑے پہنے ہیں۔ ابھی ابھی کپڑوں کا جو مینا بازار میں دیکھ کر آئی ہوں اس سے بھی خوبصورت سلک میں نے پہنی ہے۔ سُناوں گی کہانی اس کی بھی۔ پر پہلے تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ چین کاروباری دنیا میں اتنا آگے کیسے بڑھ گیا؟

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''آپ اِس کی حالیہ حیرت انگیز ترقی دیکھ کر اسے آنے والے کل کی سپر پاور خیال کر رہی ہیں۔ آنٹی کل کی سپر پاور تو اب اس کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ مگر یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ ماضی کی بھی سپر پاور تھی۔ 1200 سے 1700 تک دنیا کی سب سے

بڑی معاشی قوت رہی۔اس کے پروسلین کے برتن، چائے، گن پاوڈر، ریشم اور دیگر بے شمار اشیاء دولت کی چاندی کی صورت اس پر ہُن کی طرح برستی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلم ہندوستان دوسری بڑی معاشی قوت بن کر ابھرا تھا۔

آنٹی بے شک میں ایم اے پاس ہوں۔مگر مجھے تاریخ سے لمبی چوڑی دلچسپی نہیں ہے نہ ہی سیاست سے۔ ہاں بس میں تو یہی کہہ سکتی ہوں کہ بہتر ہوگا اگر آپ ارشد کے ساتھ ایک نشست کرلیں۔ وہ یقیناً چین کی تاریخ زیادہ بہتر انداز میں آپ کو بتا سکیں گے۔

ہاں آپ کچھ سُنانے لگی تھیں۔ وہ سُنائیں۔ یقیناً بہت دلچسپ ہوگا۔''

''ارے کیا دلچسپ ہونا ہے۔اب دیکھو نا تم مارکیٹ میں لے لے کر پھری ہو اور میں نے دھیلے پولے کا کپڑا نہیں خریدا۔اپنی پیاری سی بیٹی نما دوست سعدیہ قریشی کے لیے بھی بس سوونیئر پر ہی اکتفا کرتے باہر آ گئی ہوں۔

لو پہلی کہانی تو خالصتاً کچھ ذاتی کچھ کتابی ہے۔ہم جیسوں کی ماسیاں، مامیاں، پھوپھیاں مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کی جم پل جو اپنے پڑھے لکھے شوہروں کے ساتھ کہیں کانپور، کہیں جھانسی، کہیں لکھنو اور دلی جیسے شہروں کے طور طریقوں اور چلن سے بڑی جلدی مانوس ہوگئی تھیں۔ ان جیسی عورتوں کے مردوں کو دو گھوڑا بوسکی کا جو کریز تھا اس کی تو کوئی مثال نہیں۔ کن کن ذرائع سے یہ اُسے حاصل کرتے اور پھر شادی بیاہوں پر گاؤں آ کر اس کا شو آف ہوتا۔یہی حال ان کی عورتوں کا تھا۔شنگھائی کی مکھن جیسی ملائمت اس پر دیدہ زیب رنگوں کی کڑھائی اور اس کے زمینی رنگ اور چمک کا کوئی مول تھا کہ جس کا نام سُنتے ہی اُن کی آنکھوں میں ہیرے کی کنی جیسی چمک لہرانے لگتی تھی۔

تقسیم سے قبل کی یہ تصویریں مشرقی اور مغربی پنجاب کے عام گھروں کی عورتوں اور مردوں کی ہی نہیں تھی۔ایلیٹ کلاس جسے پرانی ڈکشنری میں اشرافیہ کہا جاتا ہے بھی اسی

مالیخولیا میں مبتلا تھی۔ دہلی اور اتر پردیش کی اشرافیہ کے لیے شادی بیاہوں میں اِن کپڑوں کا ہونا گویا ایک ناگریز امر تھا۔ نازک اندام بیبیاں ایسے مواقع پر رشتہ دار خواتین سے کِس کِس انداز میں چینی سلک اور شنگھائی کا ذکر کرتی تھیں۔

''اے ہے بٹیا کی شادی میں شنگھائی کی رضائیاں نہ ہوئیں تو سارے میں تھوتھو ہو جائے گی۔''

سمدھیانے کو سلک کے سوٹ نہ گئے تو ناک کٹ جائے گی۔''

اے آر خاتون کے ناول پڑھ لیں۔ بیسویں صدی کے متحدہ ہندوستان کی دوسری اور تیسری دہائی کے مسلم گھرانوں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے عکاس ناول۔

''دستک نہ دو'' الطاف فاطمہ کا مشہور ناول چینی تاجر نوعمر لڑکوں کی کہانی بھی سناتا ہے جو اُس وقت کی دہلی لکھنو کی گلیوں میں صدائیں لگانے والے بڑے تاریخی کردار تھے۔ جن کی آمد کا بیگمات بے چینی سے انتظار کرتی تھیں۔ جن کے گٹھڑ کُھلتے تو پورا محلّہ ڈیوڑھی میں اکٹھا ہو جاتا۔

لو اب اس کہانی کا اختتامی حصّہ بھی سن لو۔

میری پیاری تسنیم یہ بالکل نہیں جانتی ہے کہ جس بوڑھی عورت سے وہ بہت محبت کرنے لگی ہے اس نے اپنی جوانی میں لنڈے کی کیسی کیسی نایاب سلک اپنے تن پر سجائی تھی۔ نولکھا بازار کے اندر اور دلی دروازے سے باہر کے لنڈے بازار کی بھلا کونسی بہترین دکانیں تھیں جن سے یہ لڑکی واقف نہ تھی۔

اس واقفیت کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ لو تم بھی سُن لو ذرا۔ تقسیم کے بعد وہ جٹی مٹیاریں وہ میری ماسیاں، پھوپھیاں، مامیاں لاہور جیسے شہر میں آ کر بسیں تو اِس شہر کا لنڈا بازار کھوجنے میں انہوں نے بڑی پھرتی دکھائی۔ ایک شام ہم بچے گھر کے سامنے واقع

میدان سے کھیل کر واپس آئے تو محسوس ہوا کہ انگنائی میں تو قوس وقزح اتری ہوئی ہے۔فرش پر ریشمی کپڑوں کا بازار سا بکھرا ہوا ہے۔اُن پر ہاتھ پھیرے تو یوں لگا جیسے ہاتھ تو کہیں مکھن پر پڑے ہوں۔جیسے کچی ملائی ہوان کے نیچے۔سرسر کرتے پھسلتے دور تک چلے گئے تھے۔تو بس شناسائی آنے والے دنوں میں گہری ہوتی چلی گئی۔

کالج اور یونیورسٹی میں میرے بہترین سویٹروں ،جرسیوں،شفون کے ڈوپٹوں اور بہترین قمیضوں کی کتنی دھوم تھی۔یاد ہے ڈھاکہ یونیورسٹی میں قیام کے دوران میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر گورنر احسن کی بیگم کا انٹرویو کرنے ڈھاکہ کینٹ گئی۔میرے تن پر پہنی سلک کی قمیض کو مسز احسن نے گہری نظروں سے دیکھا۔اس کے رنگوں کا امتزاج اور کپڑے کی چمک اتنی خیرہ کن کہ مسز احسن کی نظریں بار بار اُس سے ٹکراتی تھیں پوچھنا چاہتی تھیں کہاں سے لی ہے؟ مگر عہدہ اور مرتبہ درمیان میں حائل تھا۔اور کچھ ایسا ہی حال ندیم فلمسٹار کی ساس اور فلم ساز وہدایت کار احتشام الرحمٰن کی بیگم نجمہ احتشام کے ساتھ تھا۔اس نے تو بے اختیار پوچھ بھی لیا تھا۔یہ سلک کہاں سے خریدی ہے؟ اور ہاتھوں سے بھی چھوا تھا اور بیٹی فرزانہ ندیم سے بھی کہا۔

''ارے دیکھونا کس غضب کا سلک ہے۔''

مسکرائی تھی میں۔بہتیرے چاچے مامے پردیسوں میں بس گئے تھے میرے۔تو میری جان نے ایسے جانے کتنے نایاب کپڑے سجائے تھے تن پر۔چلو بے شک وہ اترن تھے۔خیر صلاّ۔بھکاری قوم کی فرد جو ہوئی۔

یوں ایک اور دلچسپ سا قصہ سن لو۔1986 میں شمالی علاقہ جات پر لکھنے کے لیے ہنزہ کی ایک واقف فیملی کے گھر ٹھہری ہوئی تھی۔صاحب خانہ کی پیاری سی بہو جو نیچے سے بیاہ کر آئی تھی چاہتی تھی کہ میں کم از کم اس کے ساتھ جا کر اگر سلک نہیں تو چینی ٹی سیٹ تو خرید

ہی لوں۔

بہت پیار آیا تھا مجھے اس پر جیسے تم پر آتا ہے۔میں نے کہا تھا میری سویٹ میرے پاس چھ کپ ہیں۔میری دونوں دیورانیوں کے پاس بھی چھ چھ ہیں۔اب بتاؤ جس گھر میں اٹھارہ کپ ہوں وہاں مزید کپوں کی کوئی ضرورت ہے؟

میری جان مجھے تو صرف ونڈو شاپنگ کرنی ہے۔کوئی سستی سی چیز مل گئی سوونیئر کے طور پر تو ِکسی پیاری سی دوست کے لیے خرید لوں گی۔باقی معلومات تو ضروری ہیں کہ جانوں کہ چین کی مصنوعات کی برصغیر میں جس درجہ دھوم تھی۔واپسی سے پہلے تسنیم نے مجھے مارکیٹ کا ایک دفعہ پھر چکر لگوایا۔سمجھ دار لڑکی جو شاید جان چکی تھی کہ میرے لیے اِن مناظر کو دیکھنا بھی دلچسپ ہوگا۔مارکیٹ بند ہونے کا وقت قریب تھا۔شاپنگ بند ہو چکی تھی۔عورتوں کو دوکانوں کی صفائی ستھرائی اور جھاڑ و پوچا لگاتے دیکھا۔بھاؤ تھاؤ میں سو فی صد ہمارے جیسے ہی ہیں۔انیس بیس والی بات بھی نہیں۔آسمان پر چڑھ کر زمین پر آنے والے۔

راستے میں اندھے موڑ سے ملاقات ہوئی۔پتہ چلا کہ یہاں سگنل نہیں ہیں اکثر حادثات ہو جاتے ہیں۔

''ہیں۔''میں نے حیرت سے سُنا۔

''چین میں ایسا ممکن ہے۔''

تسنیم کھلکھلا کر ہنسی۔

اور جب ہم لفٹ میں داخل ہوئیں۔میں نے اُس کے ماتھے کو چوما اور کہا۔

تسنیم میری آج کی شام بہت پر لطف گزری ہے۔عین میری خواہش کے مطابق۔بہت شکریہ تمہارا میری بچی۔

☆☆☆

باب نمبر:۲۱ بیجنگ کا الف لیلوی ماحول اور کہانیاں

- چینی نظمیں چینی کلچر، تہذیب وثقافت اور ماضی کی فینٹسی جاننے کا خوبصورت آئینہ ہے۔
- بیسویں صدی کے چائے خانے ہر شعبہ زندگی کے لوگوں کی چوپال تھے۔شوق بھی نرالے تھے۔
- Tianqiao فوک کلچر سٹریٹ ہے۔

میں اسے ملنے آئی تھی۔اُسے جو تنگ تھی۔سعدیہ (بیٹی) نے مجھے بلڈنگ کے باہر ہی اُتار دیا تھا۔اپنے گھر آنے کی فرمائش اس نے پہلی ملاقات کے اختتام پر ہی اس شرط کے ساتھ نتھی کر دی تھی اور جب وہ سعدیہ عمران کے ہاں آئی اُس نے اپنی خواہش کو ایک بار پھر دہراتے ہوئے کہا تھا۔

پرانے بیجنگ میں لاؤشی ٹی ہاؤس نہ دیکھا تو پھر کچھ بھی نہ دیکھا۔اور لاؤشی جیسے عظیم لکھاری اور فنکار بارے کچھ نہ جانا تو پھر چین آنے کا فائدہ۔

لگتا تھا جیسے وہ لاؤشی ٹی ہاؤس اور لاؤشی کی محبت میں پور پور جکڑی ہوئی ہے۔ گذشتہ ملاقات والے جملوں کا اعادہ اس کی اِس چاہت کا غمّاز تھا۔

پتہ بھی سمجھا دیا تھا اور وہ ذرا مشکل نہ تھا اور یوں بھی گھروں کو ڈھونڈنے اور خجل ہونے میں مجھے مزہ آتا ہے۔اس لیے میں نے اس سے چینی میں لکھوا کر سنبھال لیا تھا۔آج میں اس کے گھر آئی تھی۔لفٹ سے بآسانی مطلوبہ فلور پر آکر اب اس کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔

گھنٹی بجانے سے قبل میں نے گردوپیش کو دیکھا تھا۔ بے ہوش ہونے والا معاملہ تو خیر نہ تھا تاہم بے اختیار ٹھٹھک کر رکنے والی بات یقینی تھی۔ دروازے کے ساتھ راہداری نے ہی جٹ چھا ڈال لیا تھا۔ بڑے بڑے دوگلدان جو دروازے کے دائیں بائیں پاسبانوں کی طرح بیٹھے تھے میں ایسے ایسے نایاب پھولوں کے مکھڑے تھے کہ بندہ اعلیٰ تخلیق کار کی بہترین تخلیق کے صدقے جائے کہ کیسا نقالی ہے یہ۔نقل پر اصل کا گمان گزرتا ہے۔آگے بڑھی۔حسین منظروں والا گھر تھا۔ پھولوں، بیلوں اور قیمتی سجاوٹی اشیا سے سجا۔

گھر والی نے ایسا پر تپاک حسن سلوک کا مظاہرہ کیا کہ دل کیا روح کو بھی سرشار کر دیا تھا۔گھر والی محبت اور پیار میں مہکتا خوشبوئیں بکھیرتا گلاب کا عطر بیز سا پھول تھی۔ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے بہت محبت کرنے والے کسی اپنے سے مل رہی ہوں۔دل میں اتر جانے اور گھر کرنے والی۔

چنیوٹ کا ڈرائی فروٹ سیٹ آہستگی سے میز پر رکھا۔جوتے باہر اُتار آئی تھی۔اس نے نرم سے سلیپر پہننے پر اصرار کیا مگر مجھے ننگے پاؤں چلنا زیادہ اچھا لگا۔

جس اولین احساس نے سرشاری سے نہال کیا وہ ایک معصوم سی آواز کی چہکار تھی۔جیسے کوئی لہک لہک کر گیت گا رہا ہو۔

کوئی ساڑھے چار سال کی بیٹی من موہنی سی تتلی جیسی۔نانی کے گوڈے سے جڑی ہوئی تھی۔

میں نے تنگ سے کہا تھا۔’’کمرے میں داخل ہونے قبل مجھے بچی کی مستی بھری آواز میں کچھ پڑھنے کی اونچی اونچی آوازیں سنائی دی تھیں جو میرے اندر داخل ہونے سے خاموش ہوگئی تھیں۔یہ کیا کچھ گا رہی تھی؟‘‘

تنگ ہنسی۔’’ہاں یہ نظمیں پڑھنے کی بڑی شیدائی ہے۔سارا دن چہکتی رہتی

ہے۔دراصل ہماری چینی نظمیں ہمارے کلچر،ہماری تہذیب وثقافت اور ہمارے ماضی کی فینسٹی کو جاننے کے لیے ایک خوبصورت آئینہ ہے۔اس کی وضاحت کچھ یوں کردیتی ہوں کہ جیسے برطانیہ میں ہر بچہ شعور کی آنکھ کھلتے ہی ٹونکل ٹونکل لٹل سٹاز،میری ہیڈ اے لیمب جیسی نظمیں پڑھنے لگتا ہے۔''

میں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''برطانیہ کو چھوڑو۔ہم جیسی غلام اور نقال قوموں کے بچے اُن سے بھی زیادہ اِن نظموں کو پڑھتے ہیں۔ہمارے بچوں کے چاہے وہ سر سے گزر جائیں۔لکھ نہ ان کے پلے پڑے۔انہوں نے انہیں لہک لہک اور مٹک مٹک کر گانا ہے۔ہم لوگوں نے دیکھ دیکھ کر نہال ہونا اور واری صدقے جانا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ چین کا Tang دور حکمرانی شعروفن کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔اس عہد میں تخلیق کے سوتے اُبلے تھے۔بڑوں کا کیا اس دور کے بچوں نے بھی وہ ادب تخلیق کیا جو آج بھی چین کا امتیاز ہے۔

تنگ نے بیٹی سے کچھ کہا۔ماشاءاللہ سے Baozhai (قیمتی ہیر پن) نے بھی فوراً ہاتھوں،سر،آنکھوں اور منہ کے زاویے بنا بنا اور سنوار سنوار کر نظم سنانا شروع کردی تھی۔

بطخ او بطخ او بطخ
تم جب اپنی گردن
آسمان کی طرف موڑتی اور گاتی ہو
تمہارے سفید پر
زمرد جیسے پانیوں پر تیرتے ہیں
تمہارے سرخ پاؤں

شفاف لہروں کو پیچھے دھکیل دیتے ہیں

جانتی ہو یہ کلاسیکل ٹائپ کی نظم تھا نگ دور کے ایک ہونہار بچے جو جوان ہو کر بہت عظیم شاعر بنا اور Luo bin Wang کے نام سے مشہور ہوا نے سات سال کی عمر میں تخلیق کی تھی۔

پھر ایک اور خوبصورت سی نظم تنگ نے سنائی۔Wang Wei کی ۔آٹھویں صدی کے شاعر کی جو آج بھی اتنی ہی ہر دل عزیز ہے۔جتنی صدیوں پہلے تھی۔کیسی دل میں اُتر جانے والی تھی۔عنوان تھا محبت کے بیج

جنوب کی سرزمین پر سرخ بیریاں اگتی ہیں
ہائے بہار میں بیچارے درختوں کا بوجھ کتنا بڑھ جاتا ہے
اکٹھا کرو انہیں کہ تمہاری مٹھی بھر جائے
یہ تمہاری محبت بھری میٹھی یادوں کو
پھر سے زندہ کر دیں گی

چھوٹے سے گھر میں گھومنا پھرنا اچھا لگا۔ دو بیڈ روم کا بہت خوبصورت فلیٹ تھا جس کی آرائش سلیقہ مندی اور شاہانہ انداز میں کی گئی تھی۔اس کی والدہ کوئی پچاس کے پیٹے میں ہوگی۔وہ بہت خوبصورت خاتون تھی۔ نہ بیٹی کی طرح فربہ اور نہ آنکھیں سلائی جیسی۔متوازن سی، دلکش سی دو بچوں کی ماں۔تنگ کا بھائی امریکہ میں تھا۔گھر ماں کا تھا جو پچاس سال کی لیز پر تھا۔خاتون پروفیسر استاد تھی۔ بیوگی کے بعد زندگی بیٹی کے ساتھ گزار رہی تھی۔خاوند کام پر تھا۔چائے جسے ہم قہوہ کہتے ہیں اُس نے پلانے کی کوشش کی۔

’’تکلف چھوڑو میں نے کہا ہم باہر گھومنے جا رہے ہیں۔وہیں کھائیں پئیں گے۔‘‘ مگر وہ مانی ہی نہ۔

’’بولوتم نے مکس فروٹ ٹی پینی ہے؟ سن فلاور، سٹرابیری یا ہربل۔‘‘

میری آنکھوں میں حیرت سی دوڑتے پھرتے دیکھ کر وہ ہنسی اور بولی۔

’’محاورے کی زبان میں اگر بات کروں تو کہوں گی کہ ہمارے ہاں پینتیس (35) سو قسم کی چائے بنتی ہے۔ پانی ہم نے کیا پینا ہے؟ یہی گرم قہوہ ہی سارا دن چلتا رہتا ہے۔

مجھے اٹھا کر وہ اپنے ساتھ کچن میں لے گئی۔ چھوٹے سے کچن کی الماری سے اس نے ایک مُنی سی چینک اور دراز سے بڑا خوشنما ایک بند پیکٹ اور چھوٹی سی قینچی نکالی۔ پیکٹ کا کونہ کاٹا۔ مٹھی بھر خشک پھل اور دیگر دو ڈبوں سے کچھ پھول پتیاں چائے دانی میں ڈالیں اور اُبلتے ہوئے پانی سے اُسے بھر دیا۔

اب کرسی پر بیٹھی ہاتھوں میں بغیر ہینڈل کے چُنا سا کپ پکڑے میں اسکی سنہری رنگت کو دیکھتے ہوئے مُنا چنا سا گھونٹ بھرتی ہوں۔ ذائقے بارے کیا کہوں۔ بس خفیف سی مٹھاس، خفیف سی کٹھاس بھرا مائع جسے قہوہ کہہ لو، صحت بخش مشروب جو مرضی نام دے دو یہ تو آپ کی مرضی ہے۔

پورا ایک گھنٹہ اس کے گھر گزار کر ہم باہر نکلے تھے۔ سڑک پر آ کر اُس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

’’جانتی ہو آج میں تمہیں کہاں لے کر جانے والی ہوں۔‘‘

میں ہنس پڑی پہلے اپنی زبان میں خود کو خوش کرنے کے لیے بولی۔۔

’’ارے جہاں مرضی لے جاؤ۔ ٹھٹھے کھوہ میں لے جاؤ۔ مجھے تو بس مزے لوٹنے ہیں۔ ہاں لاؤشی ٹی ہاؤس دیکھنے کی بہت خواہش ہے۔‘‘

میرے ہنسنے اور کچھ سمجھ نہ آنے پر اُس نے پوچھا تھا۔ میں نے ترجمہ کیا۔ کھلکھلا کر

ہنسی اور پھر قدرے جوشیلے سے لہجے میں بولی۔

’’پرانے بیجنگ کے چائے خانوں میں۔ پہلے جگہ جگہ گھماؤں پھراؤں گی۔ ساتھ ساتھ کہانیاں سناؤں گی۔ پھر شہرآفاق ٹی ہاؤس Laoshe جائیں گے۔‘‘

سچی بات ہے اب خوشی سے میری باچھیں کانوں کی طرف دوڑنے لگی تھیں۔

’’اف دجلہ کے کنارے بغداد کا شہرہ آفاق ال شابندر کافی ہاؤس یاد آیا تھا جسے دیکھنے کے لیے مری جاتی تھی۔

اب کیسے نہ شکرگزاری کے کلمات اس اوپر والے کے حضور پیش کرتی کہ تنگ جیسی لڑکی سے ٹکرایا جو بیجنگ کی جم پل، اس کے چپّے چپّے سے آشنا، اس کی ہڈی ہڈی جوڑ جوڑ سے واقف۔ اس پر طرّہ اللہ سے محبت، اس کے بندوں سے پیار اور ان کی مدد کرنے والی بھی ہے۔

اس نے ٹیکسی کی بجائے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے قریبی سب وے کے گڑھوں میں اتار کر چھک چھک کرتی میٹرو میں بٹھا Qianmen سب وے اسٹیشن پر لے آئی۔ اُس کی زیرزمین دنیا سے باہر نکل کر میں نے آرچری Archery ٹاور کو دیکھا۔ خوبصورت اور شاندار۔ آنکھوں نے اُسے دیکھ کر مسرت بھری کلکاری بھری تھی۔

مجھے کچھ یاد آیا۔ اک ذرا رک کر پوچھا۔ ’’تم نے مجھ سے پیسے نہیں لیے۔‘‘

’’بہت معمولی کرایہ ہے۔ میرا تو پاس بنا ہوا ہے۔ اور ہاں اِن پیسوں ویسوں کے چکروں میں مت پڑو۔ میں جب لاہور آؤں گی تم سے دوگنا وصول کرلوں گی۔‘‘

شام کی میٹھی سی دھوپ میں ماحول لوگوں کی چہل پہل سے جگمگا رہا تھا اور جب پانچ آہنی محرابوں والے خوبصورت دروازوں سے Qianmen سٹریٹ میں داخلہ ہوا تو میری آنکھیں حیرت زدہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں دیکھتیں۔ کیا منظر تھے یہ؟ محرابوں کی

نقاشی اور سڑک کی خانوں میں بٹی وسعتیں اوران پر چلتے پھرتے لوگ محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک طلسماتی دنیا میں داخل ہورہی ہوں۔جس کی شوخ رنگوں سے لتھڑی عمارتوں کے منہ متھے نئی نویلی دلہنوں کی طرح میک اپ اور ہار سنگار کی پٹیوں سے سجے ہیں۔مرکزی شاہراہ سے گلیاں مڑتی اور نئے منظروں کے دروازے کھولتی تھیں۔ جہاں ایک طرف وہ سینکڑوں سال قبل تاریخ کے کچھ رنگ، کچھ عکس اوراس وقت کی بھینی سی خوشبو کا احساس دیتی تھیں۔

تنگ نے بتایا تھا کہ Qianmen سٹریٹ پیدل چلنے کے لیے ہے۔یہاں چھوٹی بڑی کسی ٹرانسپورٹ کی اجازت نہیں۔

Qianmen Street میں داخل کیا ہوئے کہ محسوس ہوا جیسے رنگ ونور سے بھری پری کوئی الف لیلوی دنیا سامنے ہے۔شام تھی۔ برقی روشنیوں میں ماحول کی جگمگاہٹ خیرہ کررہی تھی۔عمارتوں کا حسن جدت اورقدامت کے رنگوں میں گندھا آنکھیں پھاڑتا تھا۔ تنگ جوان لڑکی تھی۔زندگی کی حرارت سے لبالب بھری ہوئی۔مگر احساس اور خیالات کی دولت سے بھی مالا مال تھی کہ جوں کی سی چال چلتی تھی۔تبھی اُس نے کہا تھا۔

’’آپ کو چلنا تو پڑے گا مگر میں کوشش کروں گی کہ کم سے کم چلاؤں۔Qianmen Street میں شمال اورجنوب سے دوداخلی راستے ہیں۔ہم پہلے راستے سے داخل ہورہے ہیں۔ذرا رونق میلہ دیکھیں۔ہوٹانگز کی تاریخ بارے جانیں۔ پھرلاؤشی ٹی ہاوس میں جائیں گے۔‘‘

اب ایک سیاپا پڑ گیا۔تنگ نے معلومات کے دریا بہانے شروع کردیئے تھے۔اُف آنکھوں اور کانوں کا امتحان تھا۔کان سنتے تو آنکھیں بھٹکنے لگتیں۔اب تنگ کونہیں کہہ سکتی تھی کہ رکو میں اسے ہضم نہیں کرپاؤں گی۔سوچا اُسے ٹوکوں گی نہیں۔اتنی پیاری محبت بھری لڑکی ہے۔چلو جومل رہا ہے چُپ چپاتے اُسے لیتے جاؤ۔کمی کا حساب کتاب پھر پراٹھا

رکھو۔

چائے وہ عنصر ہے جو چین کے ساتھ اسی طرح جڑا ہوا ہے جیسے گوشت کے ساتھ ناخن۔ چینی کلچر، چینی روایات سب کا وجود اس کے بغیر نامکمل ہے۔

دارلحکومت کے اِس شہرِ قدیم والے حصّے میں اتنے چائے خانے ہیں اتنے کہ جن کا شمار کرنا مشکل ہے۔ یہ دہائیوں میں نہیں سینکڑوں میں تو جاتے ہی ہیں۔ گذشتہ صدی میں تو یہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کیا صحافی، کیا لکھاری، اداکار، تاش کے کھلاڑی، استاد، طلبہ، ڈاکٹر، انجنیر اور دست کاروں کی ایک طرح چوپال ہوتی تھی۔ لوگوں کے پاس بڑا وقت ہوتا تھا۔ سچی بات ہے ان کی زندگی چھوٹے موٹے غم وفکروں سے آزاد بڑی ہموار، متوازن اور اِس صدیوں پرانے دارلحکومت کے حسن و دلکشی میں پور پور ڈوبی ہوئی تھی۔ اِسے اگر ایک سطر میں بیان کرنے کو کہا جائے تو میں کہوں گی۔

''مزے لوٹنا۔''

چین کے ایک بڑے لکھاری Chen Jiangong نے ایک بار کہا تھا بیجنگ کے لوگ مزے لینا پسند کرتے ہیں۔ اور لطف کی بات کہ یہ مزے تلاش کرنے میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اُن کے لیے ہر دلچسپ شوق یا مشغلہ مزے کا کام ہے۔ پتنگ اڑانا، پرندے پالنا، لہسن کے جوے ساتھ شراب کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنا، گانے گانا یا سُننا سب مزے کے کام ہیں۔

''ارے واہ تنگ تم نے تو میرے پرانے لاہور کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ لاہوریوں کے بھی یہی رنگ ڈھنگ تو ہیں۔ بس اس میں سالوں پہلے چائے کی جگہ پیڑوں والی لسی ڈال لو۔ اٹھک بیٹھک، اوڑھنے پہننے کے ذرا فرق رنگوں کا آمیزہ گھول دیں تو مزے اور فراغت کے کلچروں میں گندھی بہت دل کش تصویریں بنیں گی۔

پرانا بیجنگ چائے خانوں کے لیے بہت شہرت رکھتا ہے۔روزمرہ زندگی سے متعلق کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس کا بندہ یہاں نہ آئے۔مزے کی بات آنے کے انداز بھی بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔کچھ تو آرام کرنے کے لیے آتے ہیں ۔کچھ کی اپنے پالتو جانوروں کے پینجروں کے ساتھ تشریف آوری ہوتی ہے۔ایک ڈنڈے پر پینجرے لٹکا دیتے ہیں۔یا پھر میز پر رکھ دیتے ہیں۔خود چائے پیتے ہیں اور پرندے اپنی بولیاں بولتے ہیں۔ایسا ہنسنے ہنسانے والا منظر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو لطف آجاتا ہے۔دراصل چینی زندگی میں چائے خانہ عوامی جگہ ہے۔لوگوں کی سماجی سرگرمیوں کا مرکز جہاں بیٹھ کر وہ اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔کبھی ہنستے ہیں کبھی افسردہ ہو کر آنسو بھی بہاتے ہیں۔

اسی Qianmen سٹریٹ میں ہی وہ شہرہ آفاق لاؤشی ٹی ہاؤس واقع ہے۔تھوڑا سا بتا بھی دوں۔تفصیل اندر چل کر سناؤں گی۔

دراصل لاؤشی Laoshe ایک مشہور آرٹسٹ اور ٹی وی ڈرامہ نگار نے ’’ٹی ہاؤس‘‘ کے نام سے ایک شاندار اور کامیاب ڈرامہ لکھا جسے بہت پذیرائی ملی۔اسے بہترین کلاسیکل شاہکار شمار کیا گیا۔

ایک تو گلی بڑی شاندار تھی۔داخل ہوتے ہی جس طرح کے رنگ رنگیلے شوخ و چنچل رنگوں سے اُن کے دروازے، پگوڈا نما چھتیں، بالکونیاں معلق محرابی جنگلے اور منہ متھے سجے ہوئے تھے۔وہ سب آنکھوں اور ہونٹوں پر بچوں جیسی معصوم کلکاریوں جیسی ہنسی بکھیر دیتے تھے۔

ایک عمارت کے سامنے رُک گئے۔

کسی الھڑ مٹیار کے باہر کو نکلے ہوئے چمکدار ماتھے کی طرح اس کے فرنٹ پر ایک

نام چمکتا تھا۔

تاہم تنگ اندر جانے کی بجائے سیدھا چلنے لگی اور میرے استفسار پر اس نے کہا۔

''میں نے سوچا پہلے میں آپ کو اس کی مختلف سٹریٹ ز میں گھماؤں پھراؤں۔تاریخ سے بھی آشنائی کرواؤں۔پھر یہاں آئیں گی۔''

تیزی سے باتیں کرتے کرتے اس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے آگے مڑنے والی گلیوں کی طرف اشارہ کیا۔اوراس کے ساتھ ہی میں بھی مڑ گئی تھی۔

کیا منظر کھلا تھا۔نیچی چھتوں والے دومنزلہ عمارتوں والے،چوباروں والے،تنگ گلیوں والے گھر کیسے کیسے نمونوں کا پیرھن پہنے کھڑے تھے۔یہ کیسی دنیا تھی؟رات کے باوجود گھروں کی قدامت کے باوجود ان کے لپے تپے چہرے برقی روشنیوں میں خوب خوب لشکارے مارتے اورنظروں کو لبھاتے تھے۔

پھر وہ اندر ہی اندر پھیلتی تنگ تنگ گلیوں میں داخل ہونے لگی۔میرے لیے یہ منظر قطعاً نئے نہ تھے۔عام لوگوں کے گھر جواب چائے خانے،طعام گھر اور شراب گھر بنے ہوئے تھے۔میرے سامنے میرے لاہور کا چھتہ بازار،سوہا،گمٹی،اعظم مارکیٹ کی گلیاں اور ٹکسالی کے بازار رقصاں تھے۔کبھی کے گھر جواب کاروباری مرکز بنے ہوئے تھے۔دکھ کی لہر نے ضرور اندر بھگویا تھا کہ جدّت کے وہ تڑکے وہاں نہیں تھے جو یہاں تھے یا میں نے انہیں دنیا کے بیشتر ملکوں کے ڈاؤن ٹاؤن کی گلیوں میں دیکھے تھے۔

وہ ایسے ہی ایک سجی ہوئی گلی کے بطن سے نکلتی ایک اور گلی کا شیشے والا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔عام سا چوبی دروازہ جسے کھولا تو اندر جیسے آرائش وزیبائش کا جہاں اُبل رہا تھا۔لوگ میزوں کے گرد بیٹھے خوش گپیوں اور چائے کے پیالوں سے شغل کرتے تھے۔ایک چھوٹی سی میز کے گرد بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

''یہی وہ گھر ہیں جن کی ڈھلانی چھتوں پر کبوتروں کے غول پُھد کتے ،اُچھلتے ،ناچتے،کودتے چہلیں کرتے نظر آتے تھے۔پرانے بیجنگ کے رہائشیوں کو کبوتر پالنے سے عشق تھا۔یہ جب فضاؤں میں اڑانیں بھرتے وہ بے خود ہوجایا کرتے تھے۔بعض لوگ تو اِن کے پروں یا دموں کے ساتھ سیٹی باندھ دیتے تھے۔وانگ سکسیانگ Wang Shixiang جو بیسویں صدی کے آوائل دہائیوں کا ایک بہت بڑا فوک گائیک تھا نے ایک بار ایک محفل میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے دوران کہا تھا کہ کبوتر کی پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اوراس کی سیٹیاں دراصل بیجنگ کی زندگی کی خوبصورت علامت ہیں۔

موسم خواہ بہار کا ہو یا بیجنگ کی فضائیں گرمی سے تپتی ہوں۔سردترین دن ہوں یا خزاں کا ہرسُوراج ہو۔ہواؤں میں ،فضاؤں میں اِن کی اڑانیں ،ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹیں ،ان کی سیٹیاں،ان کی غٹرغوں غٹرغوں جیسی آوازیں آسمانوں پر تیرتی کبھی بہت نزدیک کبھی کہیں دور سے کبھی معدوم ہوتی ہوئیں اور کبھی آپ کے پاس سے کانوں میں رس گھولتی خوشی ومسرت کا پیغام دیتی آپ کوکسی سرمدی نغمے جیسی محسوس ہوتی ہیں۔ایک لطف ایک سرشاری سی رگ و پے میں دوڑنے لگتی ہے۔کبھی یہ پرنور صبحوں میں لوگوں کوان کے خوابوں سے جگاتی ہیں۔اُن کی نگاہیں بہت دور تک ان کے تعاقب میں دوڑتی چلی جاتی ہیں۔

اور جب میں یہ سب سنتی تھی بے اختیار ہی تو میرے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

یہ سب تو میرے بچپن کی یادوں اور میرے لاہور کے گلی کوچوں کے قصے کہانیاں ہیں۔یوں بھی بچپن کا کیا ذکر۔یہ تو میری جوانی اوراب بڑھاپے کے بھی منظر ہیں جو لاہور کیا پورے پاکستان کے شہروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ہماری تو شاعری بھی ان کی رنگینی سے لبریز ہے۔ڈھول کو چھٹی پہنچانے کا کام بھی انہی کے سپرد طرلے منتوں سے ہوتا تھا۔

تنگ نے غالبًا آرڈر کیا تھا۔ چھوٹی سی میز پر چیزیں سج گئی تھیں۔کڑوی کیسلی چائے یا قہوہ۔دراصل اُس نے وضاحت کی۔''میں کچھ سستے سے ٹی ہاؤس میں سب کچھ دکھانا چاہتی تھی۔لاؤشی Laoshe میں تو کھال اُتار لیتے ہیں۔''

کچھ غلطی میری بھی تھی کہ میں نے ٹکٹ کا بندوبست نہیں کیا۔چلو اِسے پھر پر رکھیں گے کہ اس کا اوپیرا دیکھنے کی چیز ہے۔ساتھ میں ٹی ہاؤس کی بھی سیر ہوجائے گی۔اور جب میں اور وہ کڑوا کسیلا قہوہ پیتی تھیں میں سُنتی تھی اِس پرانے بیجنگ کے رہائشیوں کے کچھ اور انوکھے شوق بھی تھے۔ بڑے دیوانے تھے وہ۔گولڈفش کو پالنا،ان کی سیوا کرنا بہت لوگوں کا جنون تھا۔شاہی گھرانے کے لوگ بھی اِس شوق کا شکار تھے۔اُن کے محلوں میں باقاعدہ تالاب اِس مقصد کے لیے بنائے جاتے تھے۔اور شاہی افراد اِس کی سجاوٹ میں بھی خصوصی دلچسپی رکھتے۔ پرسی من درخت بھی اطراف میں لگائے جاتے۔ یوں صحن کی سجاوٹ ہی منفرد نظر آتی۔

اور ایک بار پھر میرے سامنے اپنے عام اور خاص لوگوں کے شوق مرغیاں پالنے اور مرغوں کی باقاعدہ لڑائی کروانے کے شغل تھے۔پھر اٹھے اور باہر آئے۔اب پھر آوارہ گردی شروع ہوگئی۔دفعتاً شنگ ایک جگہ رُک گئی۔

''اوہو یہ تو Tianqiao فوک کلچر سٹریٹ ہے۔چلو اِسے بھی تھوڑا سا دیکھ لو۔یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔''

اس نے مجھے Tianqiao کے ایسے ایسے قصے سُنائے تھے کہ چند لمحوں کے لیے مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے میں وقت کی اس ٹنل میں چلی گئی ہوں جہاں تفریح کے یہ سب انداز تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہمارے ہاں بھی ہوتے تھے۔لوگوں کو ہنساتے اور ان میں خوشیاں بانٹتے تھے۔یہ بھی مجھے تمہیں دکھانا تھا۔اِس وقت سرسری سا دیکھ لو۔مگر یہاں تمہیں

دن کی روشنی میں بھی آنا ہے۔

میرے سوال پر کہ یہ یٹان قیاء چیز کیا ہے؟ پتہ چلا تھا کہ قدیم بیجنگ کا ہی ایک علاقہ ہے۔ جو بیجنگ کے لوک کلچر کی مختلف شاخوں جن میں ذہنی چسکوں کے ساتھ ساتھ ذہنی تفریح کی بھی بہت ساری اقسام ہیں۔اور یہ اِن سب کے لیےخصوصی شہرت رکھتا ہے۔

کھانے کے ریسٹورنٹ،کھوکھے، چائے خانوں کے ساتھ ساتھ تھیٹر ہال، پیکنگ اوپیرا، پتلی تماشا،مزاحیہ گفتگو،مزاحیہ ڈرامے، بازی گری تماشے، جادو کے کھیل اور دیگر بے شمار اسی نوعیت کی چیزیں کل بھی ہوتی تھیں ۔آج ذرا زیادہ شاندار انداز میں ہورہی ہیں۔ بازار بھی سجتے ہیں۔ضروریات زندگی کی چیزیں سستے داموں ملتی ہیں۔اور سچی بات ہے یہاں پھرنا،آوازوں کا شوروغل فضاؤں میں پھیلی کھانوں کی مہک سب مزے کا تھا۔دراصل قدیم بیجنگ کی سب سے زیادہ اہم اور یادرکھنے والی بات صرف ایک ہی تو ہے اور وہ اس کی خوراک ہے۔ کہتے ہیں یہ اس کے انواع واقسام کے کھانے ہی تو ہیں جن کے ساتھ ایک تہذیب جڑی ہوئی ہیں۔روایتیں منسلک ہیں۔طورطریقے جڑے ہوئے ہیں اور زمانوں سے چلے آرہے ہیں۔دوسرے اس کا فوک کلچر ہے۔

اب اِس سٹریٹ سے کِسی اورطرف نکلنا کوئی مذاق تھا۔ جہاں ہر دوسرے قدم پر مجسمے آپ کو روکتے تھے۔اور اِن کے ساتھ جڑی کہانیاں آپ کو وقت کی کِسی دوسری دنیا میں لے جاتی تھیں۔انہی کہانیوں کو بڑے بڑے ہالوں میں تمثیلی انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔جس کا ٹکٹ آپ کو چند لمحے کے لیے سوچ میں ڈال دیتا ہے۔یہ Qing اور منگ بادشاہوں کا عظیم تحفہ ہے۔وقت نے کتنی کروٹیں لی ہیں۔یہ کروٹیں جو تبدیلیوں کا مظہر ہوتی ہیں۔اب یہ تو ممکن نہی کہ تبدیلیاں آئیں اورطرز زندگی کے انداز وہیں کھڑے رہیں۔ بیجنگ کے لوگوں کا طرز زندگی بھی بدل چکا ہے۔بیسویں (۲۰) صدی کے اختتام پر اوراکیسویں (۲۱) صدی کے

آغاز پر سنلیٹن میں بار سٹریٹ (Bar Street) منظر عام پر آئی۔

ڈونگریم میں گیجی سٹریٹ ایک اور دوسری بار سٹریٹ بنی ۔ Shichahai Lake کے گرد ،لوگوں کے لیے کہ وہ اپنے فارغ اوقات میں یہاں لطف اٹھا سکیں۔Shichahai جھیل ایک ویران جگہ تھی لیکن یہ اچانک پر کشش بن گئی۔نئ صدی کے آغاز پر ایک بڑی تعداد میں شراب خانے (bars) شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔بڑے دلچسپ ناموں کے ساتھ جیسے Blue Lotus،--------

سچی بات ہے لاؤشی Laoshe کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔ہمیں تو ان سٹریٹوں نے ہی جھٹ پیچھے ڈال لیے تھے۔تاہم پھر بھی تو آنا ہے۔Laoshe کو دیکھنے۔تنگ مجھے چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزار رہی تھی۔ان کے بارے بتا رہی تھی۔اِن گلیوں میں چھوٹے چھوٹے شراب خانے تھے۔''شکر ہے آل ال مائی جیسز کا میں نے ڈرنک کرنی چھوڑ دی ہے۔ان کے ساتھ بڑی دلچسپ ڈھیروں ڈھیر کہانیاں ہیں۔''شب کے پہلے پہراور دوسرے تو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب پاس سے گزر گئے اوراب تیسرے نے سانسیں بھرنی شروع کردی تھیں۔تنگ میرے چہرے پر برستی تھکن کو دیکھتی اور کہتی تھی۔''میرے خیال میں آپ کومزید پھرانا آپ پرظلم کرنے کے مترادف ہوگا۔

لاؤشی ٹی ہاؤس کو پھر پر رکھتے ہیں۔''ارے ارے تنگ میں تو لطف اٹھا رہی ہوں اوردل ہی دل میں تمہیں دعائیں بھی دے رہی ہوں۔یہ تم ہو جس کے صدقے مجھے یہ سب دیکھنا نصیب ہوا۔

☆☆☆

باب نمبر:۲۲ اک نشہ، اک خمار سا لاؤشی ٹی ہاؤس کا

- لاؤشی ٹی ہاؤس بیجنگ کا تعارفی کارڈ ہے۔
- لاؤشی بیسویں صدی کے چین کا ایک باکمال ناول نگار، کہانی کار اور ڈرامہ رائٹر تھا۔
- لاؤشی جیسی شخصیت بھی ثقافتی انقلاب کی بھینٹ چڑھی۔

میری تو رات کچھ سوتے کچھ جاگتے ہی گزری تھی۔ یوں آتے آتے ڈیڑھ بج گیا تھا۔لیٹی تو لگا جیسے پرستان سے لوٹی ہوں۔اشرف صبوحی کی سیّدانی بی ہوتی تو کیا کیا نہ قصے گھڑتی۔ پر اس جیسی کوثر وتسنیم میں دھلی زبان کہاں سے لاتی؟ وہ انداز بیان کا تحیر اور سنسنی جس سے میں پیر پیر پر آشنا ہوئی تھی۔ کچھ اس سے کم تھا کیا جو الف لیلوی کہانیوں میں پڑھنے کو ملتی تھیں۔

صبح ناشتے کی میز پر میں مسرور تھی۔رات کی تھکاوٹ کا ذرا برابر بھی اثر نہیں تھا۔شاید بندے کا اندر خوش ہو تو اس کا شریر بھی مطمین اور سرشاری میں بھیگا ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی تھا۔ سعدیہ خوش تھی۔ ماں جو خوش تھی۔سعدیہ نے لاؤشی ٹی ہاؤس کے بارے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ میں نے بھی بات نہیں کی تھی۔ دراصل بندہ جتنا مرضی بااختیار ہو۔ جوان اولاد کے سامنے کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت مروت میں ضرور آ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال میرا بھی تھا کہ میں اسی وقت اگلی مہم جوئی کا پٹارہ نہیں کھولنا چاہتی تھی۔ میرے اکیلے جانے کی صورت میں بہر حال وہ تھوڑی بہت فکر میں تو مبتلا ہوتی ہی تھی۔اور مجھے تو ہر صورت وہاں جانا ہی تھا۔

دراصل وہ چینی فوک آرٹ کا ایسا نمائندہ گھر تھا جہاں چینی تاریخ، اس کے کلچر کے مختلف رنگ جو قدامت سے جدّت کی سنہری تاروں میں بندھے یہاں تک پہنچے تھے اب اسی جگہ انہی رنگوں میں پرفارم ہوتے تھے۔ میرا خیال ہے تنگ نے سمجھا ہوگا کہ میرے پاس شاید اوپیرا کے ٹکٹ ہوں۔ مگر میں بھی عجیب بونگی عورت تھی۔ بیچاری نے بازو کیا پکڑایا میرے لچھن تو جیسے اُسے کھا جانے والے ہی ثابت ہو رہے تھے۔ حالانکہ فطرتاً میں ہرگز اِس مزاج کی نہیں۔ ٹکے برابر کسی کا احسان لینے کی کبھی روادار نہیں ہوئی۔ لاوًشی ٹی ہاؤس کا ذکر میں نے بڑے اشتیاق بھرے انداز میں کیا تھا کہ جیسے میں اُسے دیکھنے کے لیے مری ہی تو جا رہی ہوں۔ مگر اس بارے بات کرنا، معلومات لینا ٹکٹ وغیرہ کے مراحل اور ان سے آگاہی کا مجھے دھیان ہی نہیں آیا۔

لاوًشی کے سامنے رُک کر تنگ جب آگے بڑھ گئی تھی تب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ موبائل پر ہی اس سے بات کر لیتی۔ وہ بھی مروت مارے چپ رہی۔ بہر حال باتوں سے اتنا تو میں جان گئی تھی کہ ٹی ہاؤس کے ٹکٹ خاصے مہنگے ہیں۔ اب سوچا تھا کہ تنگ سے بات کر کے دو ٹکٹ اوپیرا کے منگوا کر اسے دعوت دے دوں۔

اور جب اُسے فون کیا کہ اب رہنمائی کرو اوپیرا دیکھنا ہے۔ ٹکٹ منگوانے لگی ہوں کِس کے منگواؤں۔

’’ٹی ہاؤس آج کل چل رہا ہے۔ اُسی کو دیکھو۔‘‘

عمران نے دفتر سے فون کیا کہ ٹکٹ 60 سے لے کر 380 یوآن کا ہے۔ 60 والا بالکل پچھلی نشستوں کا جبکہ اگلی نشستوں کا 380 کا ہے۔ اب فوراً پہلے پاکستانی روپوں میں ضرب تقسیم ہوئی۔ پھر ڈالرز میں ہوئی۔ بہر حال 380 یوآن 60 ڈالر بنے تو پھر ٹھیک ہے کہتے ہوئے دو ٹکٹ خریدنے کا کہہ دیا۔

دو دن بعد کوئی چار بجے تنگ اور میں گھر سے نکل پڑیں۔تنگ اسی طرح مجھے میٹرو سے Qianmen سٹریٹ لے آئی تھی۔ سچی بات یہی ہے کہ سماعتوں کو لاؤشی Laoshe tea house عام سا نام لگنے والا یہ ٹی ہاؤس دراصل بیجنگ کا وزٹینگ کارڈ ہے جو حقیقتاً چھ قدیم بادشاہتوں کا پایہ تخت اور بین الاقوامی میٹروپولس Metropolis شہر کا دارلخلافہ ہے۔عجیب سی بات تھی کہ میں ابھی چار دن پہلے ہی تو یہاں سے گزری تھی۔اِک ذرا رکی بھی تھی لاؤشی ہاؤس کے سامنے۔مگر آج کے سارے منظر یکسر نئے لگ رہے تھے۔سڑک کی چکرا دینے والی وسعتیں جو پورے ماحول پر پھیلی ہوئی تھیں۔عمارتوں کی ایک تناسب سے بلند قامتیں، روشنیوں کی سحر انگیزیاں، بھانت بھانت کے لوگوں کے ہجوم میں ان کی بولیاں اور چہلیں۔چھوٹے بچے بھی ماں باپ کے ساتھ ہنستے مسکراتے مسرور کرتے تھے۔

مرکزی دروازے کے دائیں بائیں ڈریگون سجے ہوئے تھے۔قد بُت شیروں جیسے تھے۔اور منہ بھی ان ہی کی طرح پھاڑا ہوا تھا۔دوسری منزل کی پیشانی بھی منہ کھولے سانپوں سے سجی تھی۔اف دیکھ کر ہی جسم میں جھرجھری سے آنے لگی تھی۔سانپوں کے تو تصور سے ہی میری جان جاتی ہے۔چند لمحے تنگ باہر کھڑی اُسے خاموش نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔چپ چاپ جیسے کِسی یاد میں کھو گئی ہو۔پھر جیسے اُسے میری موجودگی کا احساس ہوا۔شاید میں وہاں کھڑی ایک خاتون سے باتیں کرنے لگی تھی جو شکل سے چینی لگتی تھی۔وہ بہت اچھی انگریزی بولتی تھی جو مجھے یہ بتانے لگی تھی کہ تم کتنی بے مثال آرٹ کی دنیا کو دیکھنے والی ہو۔شاید تمہیں علم نہ ہو کہ پرانے بیجنگ کے حقیقی کلچر کی روح کو دیکھنے اور اس کی خوشبو محسوس کرنے کے لیے اِس عمارت کے اندر جانا کتنا ضروری ہے؟ جہاں فوک آرٹ، میجک شوز، اوپیرا اور فوک موسیقی کے ذریعے پرانے ادوار کی زندہ تصویر کشی کی جاتی ہے۔

جوش و جذبہ اس کے انگ انگ سے ٹپکتا تھا جب وہ باتیں کر رہی تھی۔ تبھی تنگ جیسے چونک کر پلٹی ۔اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اُسے کھینچا اور میرے دائیں کان میں سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

''کِسی کے جھانسے میں نہیں آنا۔ یہاں اجنبیوں کو پھنسایا بھی جاتا ہے۔ گھنٹوں میں اُن کی جیبیں خالی ہوجاتی ہیں۔'' اُف اندر قدم کیا رکھے جیسے لگا آنکھیں پھٹ کر باہر آجائیں گی۔ رنگوں کی شوخیاں، دیواروں کی انوکھی نرالی وضع قطع، مربع نما میزوں کے گرد سجی کرسیوں کی سیٹیں اور بیک ریسٹ سب جیسے بولتی باتیں کرتی تھیں۔

چھت کی طرف گردن کیا اٹھی۔ آنکھیں تو پھیل پھیل گئیں، ایسی ڈیزائن کاری کہ بندہ تو تکتا چلا جائے۔ سرخ لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ اللہ کی مخلوق کے نئے نئے رنگ اور نئی آوازیں ۔شور، کیلی گرافی اور پینٹنگ کے دوہوں کے نمونے دیواروں پر لٹکتے تھے۔ چوبی کھڑکیاں اپنی منفرد ساخت کے حوالے سے توجہ کھینچ رہی تھیں۔ شوکیسوں میں دھری چیزوں کو تفصیلاً دیکھنا ہی کتنا مشکل تھا۔ فرنیچر کِسی اعلیٰ لکڑی کا تھا اور اس پر پالش نے اُسے کتنا چمکا رکھا تھا۔ اب پوچھ رہی ہوں ۔تنگ مجھے جواب دے رہی ہے۔ ایک ایک چیز کی نشان دہی اور جانکاری اس نے بڑے خوبصورت انداز میں دی تھی۔

مجھے تو لگ رہا تھا جیسے میں کسی نگار خانے میں داخل ہوگئی ہوں۔

تنگ نے کاؤنٹر پر جا کر درمیانی عمر کے ایک مرد سے بات کی۔ میرا بھی تعارف کروایا۔ مرد نے ہنستے ہوئے ''پاکستان'' دہرایا اور ہونٹوں کے گوشے کانوں کی طرف دوڑائے۔ ویٹرز کے ملبوسات کی بھی عجب شان تھی۔ مردوں نے لمبے گاؤن پہنے ہوئے تھے۔ جبکہ ویٹرس نے خوبصورت چُست گھٹنوں تک لمبائی کی شکل میں کھڑے کالروں والی قمیضیں پہن رکھی تھیں۔ جنہیں چینی زبان میں Qipao (cheongsam) کہتے ہیں۔ یہ چین کا

پرانا روایتی لباس ہے۔بس جدید زمانے نے اس کی لمبائی ذرا کم اور کشادگی کو بھی ذرا سکیڑ دیا ہے۔

لاؤشی ٹی ہاؤس Laoshe Tea House دراصل 1988 میں قائم ہوا۔لاؤشی بیسویں صدی کے چین کا ایک باکمال ناول نگار،عمدہ کہانی کار اور ڈرامہ رائٹر تھا۔ٹی ہاؤس بنانا لاؤشی کا شہرہ آفاق کام ہے جسے بہترین کلاسیک کا درجہ دیا گیا کہ اس نے باہر کی دنیا میں عام چینیوں جو گلی کوچوں کے باسی تھے اُن کی جدوجہد کی طویل کہانی کو جس جس انداز میں پوٹریٹ کیا اُس نے اُسے نہ صرف شہرت دی بلکہ وہ باہر کی دنیا میں شناخت کا باعث بھی بنا۔

تنگ میرے انہماک میری حیرت وتعجب کو دیکھتی تھی۔دفعتاً اس نے پوچھا۔

''کیا تم لاؤشی کا اصلی گھر دیکھنا چاہتی ہو۔''

''ہاں ہاں بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے تنگ۔'' میری آواز شوق واشتیاق میں ڈوبی ہوئی تھی۔''تو چلیں گے کسی دن وہاں۔اس کے استعمال کی سبھی چیزیں محفوظ کر دی گئی ہیں۔وہ تو اب تاریخی جگہ بن گئی ہے۔یہیں فاربڈن سٹی کے پاس ہی ایک ہوٹانگ میں ہے۔''

''تنگ خدا تمہیں لمبی حیاتی دے۔تمہارا مجھے ملنا اس کا احسان عظیم ہے۔''

گراونڈ فلور روایتی عام لوگوں کے کلچر اور طور طریقوں کی نمائندہ ہے۔جس میں لباس اور کھانے پینے کے طور طریقے سبھی شامل ہیں۔تنگ اوپر جانے کا کہہ رہی تھی۔اوپر جانے کی سیڑھیاں بہت آرام دہ کشادہ،خوبصورت ریلنگ اور آرائشی پھول پتیوں سے دمکتی ہوئی جن کے پوڈے سُرخ قالین سے ڈھنپے ہوئے خوبصورت لگ رہے تھے۔ریلنگ پر اپنے ہاتھوں کی مظبوط گرفت نے میری چڑھائی کو بہت آرام دہ کر دیا تھا۔سیڑھیوں کے پہلے پڑاؤ پر جو مجسمے دھرے تھے ان میں سے کچھ کی صورتیں بڑی عجیب وغریب سی تھیں

۔دیواروں پر سانپوں کی موجودگی اس رنگ رنگیلی دنیا میں جیسے مزے کے منہ روڑ آ جائے والی بات محسوس ہوتی تھی۔ایسے ہی خوفناک سے منظراور بھی نظر آتے تھے۔

دوسرے فلور پر ٹی رومز ہیں ۔اسے چائے کا نمائش گھر بھی کہہ سکتے ہیں۔تنگ نے کہا تھا۔اِسے دھیان سے دیکھنا ہے۔یہ خصوصی شہرت رکھتا ہے اپنی منفرد آرائش کے اعتبار سے۔

چھوٹے چھوٹے بوتھ جہاں چار بندے آرام سے بیٹھ کر چائے بنانے کا سارا عمل مسرت وشوق سے دیکھتے اور چائے نوش کرتے ہیں۔سچ تو یہ تھا کہ چائے پینے کا یہ تجربہ اور ٹی ہاؤس کے ماحول سے لطف اٹھانے کا جو کہ ایک میوزیم ہی کی طرح ہے۔بڑی کشش رکھتا ہے۔یہ بڑے مہنگے کمرے ہیں۔

کان تنگ کو سُنتے تھے۔آنکھیں دیکھتی تھیں۔یہاں برتنوں کی خوبصورتی، لائٹ لیمپوں کی جدت،منفرد سی چوبی کرسیوں میزوں،دلکش میز بانوں کی مسکراہٹوں،اداؤں اور سحرانگیزیوں سے گاہکوں کو لوٹا بھی جاتا ہے وگرنہ چائے کی پتی تو عام سی ہوتی ہے۔بس یہ ڈال دیا اور وہ ڈال دیا والا معاملہ۔سیاحوں نے پیسہ لٹانا ہوتا ہے سو وہ شوق سے لٹاتے ہیں۔لوکل سنیک بھی بہت مہنگے ہیں۔

ایک کھلا آنگن جو کہ عمارتوں سے گھرا ہوا ہے۔اِس فلور کی بیش قیمت زینت ہے۔یہاں خوبصورت ماڈرن ریسٹورنٹ جس کی اعلیٰ آرائش کا دیکھنے سے تعلق ہے کہ شاہی کلچر کے رنگوں کا آمیزہ بھی اس میں ملا دیا گیا ہے۔

اب بھلا اس جگہ کو دیکھنا اور وہاں کچھ دیر رکنا اور ان سب سربراہان مملکت کے ناموں کو پڑھنا اوران کی تصویریں دیکھنا کس قدر مزے کا کام تھا جو اِن سالوں میں یہاں آئے اور جنہوں نے اِسے دیکھا اور سراہا۔اِس مرکزی جگہ کی آرائش سادگی اور پروقار

طریقے سے کی گئی تھی۔

مرکزی ہال کا کیا رومانوی ماحول تھا۔وسیع وعریض ہال جہاں میزوں پر کھانے پینے کی چیزیں دھری تھیں۔اطراف میں کرسیاں سجی تھیں۔ایک اپنایت جڑا ماحول جس کی نشستوں کا اہتمام کچھ اِس انداز سے بھی کہ سٹیج سے بظاہر دوری بھی نہ محسوس ہو۔یہ اور بات ہے کہ آگے بیٹھے تو احساس ہوا کہ نہیں اگلی نشستوں کا تو مزا ہی کچھ اور ہے۔حالانکہ اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے ایسا محسوس نہیں ہوا تھا۔چوبی سٹیج کی ساخت اور خوبصورتی ِکس درجہ کمال کی تھی کہ اُسے لفظوں کا پیرھن کیا پہناؤں اور کچھ ایسا ہی حال کرسیوں،میزوں اور ملحقہ چوبی حد بندیوں کا تھا۔نظر جہاں تک جاتی تھی حیرتوں کا ایک جہاں سمیٹ کرلاتی تھی۔

دنیا کا کوئی اوپیرا بیجنگ اوپیرا کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔یہ سر سے پیر تک ہر ہر لمحے اداکاری میں گندھا ہوا ہے۔جسمیں گانا، پڑھنا،لکھنا،لڑنا جھگڑنا، ڈانس کرنا،مزاح، بازی گری، مارشل آرٹ،نقالی،صرف جسمانی حرکات سے تاثر دینا،اداکاری سے کہانیوں کو بیان کرنے کی تکنیک، چائے کےادب آداب اور موسیقی کا تیز ٹمپوجیسی صلاحتیں اپنے دلآویز رنگوں سے شامل ہیں۔احساسات کا کونسا اظہار یہ اس میں رہ جاتا ہے۔خوشی غم،دکھ مصیبت ،ناراضگی،خوف،حیرت،اداسی،فکر،حیرت تعجب۔رونا ہنسنا تو خیر معمول کی چیزیں ہیں۔

تین ایکٹ کا یہ ڈرامہ جس کا پہلا حصہ 1898 کے اس دور کا عکاس ہے جب چین ایک کمزور ریاست تھا جس کی بدامنی میں بیرونی طاقتوں کی مداخلت اہم کردار تھی۔غربت بے حدوحساب۔اتنی کہ لوگ اپنے بچے بیچنے پر مجبور تھے۔کہیں صنعتوں کے قیام کی کوششیں کہ ملک کوخوش حال بنانے کا واحد یہی ذریعہ تھیں۔لوگوں کی امیدیں،کریک ڈاؤن، پولیس کا بہت طاقتور ہونا،ظلم وستم کی کہانیاں۔

ایکٹ نمبر دو بیس برس بعد کی کہانی سناتا ہے۔بادشاہت کے خاتمے کے ساتھ

ریپبلک دورِ حکومت، سول وار، انقلاب کی آواز کا اٹھنا، طلبہ کا قومی سیاست میں بھرپور اور توانا کردار ادا کرنا۔ تیسرا ایکٹ اگلے تیس سال کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ جاپانیوں کے ساتھ جنگ، سیاسی صورت کی مزید ابتری۔ ڈرامہ نگار نے ماڈرن تاریخ کے تین ادوار کے المناک انجام کو پچاس سال کے دورانیے میں ٹی ہاوس میں ساٹھ کرداروں کے ساتھ ہنستے ہوئے بیجنگ کے ہر طبقہ فکر کی نمائندگی کا مشکل کردار ادا کر دیا تھا۔

ہر ایکٹ نے اپنے عہد کے واقعات کی بھرپور انداز میں نمائندگی کی۔ ہر عہد کو کاسٹیوم، جسمانی خدوخال، بولنے اور مکالمہ کے اظہاریئے سے انہیں اتنا طاقتور اور جاندار بنا دیا کہ وہ نمائندہ شاہکار سمجھا گیا۔ اسے دیکھنا۔ کن سلطنت کے روایتی طریقے بہت دل کش تھے۔ حسین شرافت کا بلند ترین مقام کہ جہاں گھٹنوں کے بل جھک کر آداب کہنا کلچر کا حصّہ تھا۔ دوسرے دانشوروں اور فنکاروں کی طرح لاؤ کو بھی اس وقت ریڈ گارڈ کے ظلم و ستم سہنا پڑے۔ ان کی یہی وہ زیادتیاں اور ستم تھے جن سے تنگ آ کر وہ خودکشی پر مجبور ہوا۔

لاؤشی کی کہانی بھی تنگ سے کسی دن سُننی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ تاریخ کا یہ پچاس سالہ دور جو ایک پرآشوب تاریخ سے بھرا ہوا ہے بندے کو جکڑنے کو کافی ہوتا ہے۔ اور سچی بات ہے میں نے سارے منظریوں دیکھے تھے کہ میری ابلتی آنکھیں جیسے پلکیں جھپکنا بھولے بیٹھی تھیں۔ سانس جیسے رک رک کر چلتا تھا۔ پلّے میرے کچھ نہ پڑنے کے باوجود بہت کچھ پڑ رہا تھا۔ تنگ بھی مدہم آواز میں بتائے جاتی تھی۔ مگر کیا لاجواب اداکاری تھی۔ سٹیج سے فضاؤں میں اچھل کود تو کوئی بات ہی نہ تھی۔

چائے نے کیا لطف دینا تھا اور اس کے ذائقے اور دیگر تفصیلات کو کیا دیکھنا تھا کہ نہ ذہن حاضر تھا اور نہ دل۔

☆☆☆

باب نمبر:۲۳ گونگ چو کے لیے روانگی

- اف اندرون ملک پروازوں کے ایرپورٹ بھی میلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔
- چھنگ منگ تہوار آباواجداد کو یاد کرنے اور قبروں کی صفائی ستھرائی کے لیے ہے۔
- مسجد میں داخلے وقت جذبات کا جوار بھاٹا عجب رنگ بھرا تھا۔

میری گندی عادات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گھر سے جن جگہوں کے عشق میں مبتلا ہوتی ہوں۔ کتابوں اور لوگوں نے بھی جن کے پیار کی آنچ کو بھڑکایا ہو۔ اٹھتے بیٹھتے جن کے خواب دیکھتی رہی ہوں۔ مقدر جب ایسی جگہ لے جائے جہاں ان کی دید کے پورا ہونے کے امکان بھی پیدا ہو جائیں۔ بس پھر میں انہی کے بارے کبھی کبھار گومگو کا شکار ہو جاتی ہوں۔ جاؤں نہ جاؤں۔ خودساختہ مفروضوں میں اُلجھنا شروع کر دیتی ہوں۔

گونگ چو کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر عمر عادل یاد آتے تھے جنہوں نے کہا تھا ممکن ہو سکے تو وہاں ضرور جائیں۔ صحابی رسول حضرت سعد بن ابی وقاص کا مدفن ہے۔ فضائیں خوشبوؤں سے لدی پھندی رہتی ہیں۔

سچی بات ہے ایک اسی نام کی کشش تو مجھے بار بار مضطرب کر رہی تھی۔ مگر نقشے نے جو دکھایا تھا۔ اس نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ یہ اس چین جیسی وسیع وعریض راج دھانی کے ہزاروں میل دور اس کے قدموں میں پڑا ہے۔ پایہ تخت سے آنکھیں اٹھاؤ تو اس تک پہنچتے پہنچتے کھوٹی ہونے لگتی ہیں۔ بے چاری بیٹی اور داماد کا کتنا خرچ ہو رہا ہے۔ میرا تو چلو مانو جنون ہے مگر انہیں کیوں وختے میں ڈالوں۔

مگر جنوں حاوی ہو گیا تھا۔ایک صبح میں نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''سعدیہ ہمیں گونگ چو جانا ہے۔عمران سے بات کرو۔کب اور کیسے چلنا ہے؟

دراصل میرے اندر کی ہر پل اُگلتی اُچھلتی ہوس نے رات لعن طعن سے میرا حشر نشر کر دیا تھا۔عمان میں یروشلم والے واقعے کی مثالوں والی چھبّیوں سے کلیجہ تو پہلے ہی چھلنی چھلنی ہوا پڑا تھا۔

کمبخت مقدر اگر لے آیا ہے یہاں تو سمیٹ لے جو سمیٹ سکتی ہو۔مڑیا قسمت یا نصیب جیسی باتوں نے جذبوں کو بھڑکا دیا تھا۔

وہ ہنسی'' آپ میری ماں ہیں، میری سہیلی ہیں۔مجھے تو پتہ تھا ایک دن ایکا ایکی آپ کو ہڑک اٹھنی ہے۔اس خواہش کا اظہار ہونا ہے۔میری پیاری امّاں سب بندوبست ہو چکا ہے۔جمعہ کی سہ پہر ہم چار بجے کی فلائٹ سے جا رہے ہیں۔درمیانی فاصلہ چونکہ بہت زیادہ ہے۔بلٹ پروف ٹرین نے 9 گھنٹوں میں پہنچانا تھا۔سوچا کہ جہاز زیادہ بہتر ہے۔''

''میری سویٹی'' کہہ کر منہ ماتھا چوما۔ایک بار نہیں کئی بار۔

گھر سے ایک بجے نکلے۔ایک بڑے خوش کن اور لطیف سے احساس دید نے پذیرائی دی۔گلابی اور سفید پھول استقبال کر رہے تھے۔دو دن پہلے تک یہ گل میلہ نہیں سجا تھا۔یہ اچانک کیسے جنگل ہرا بھرا ہو گیا۔چھوٹی قامت والے چھدرے چھدرے درخت سبز ٹہنیوں سے لدے پھندے ضرور تھے مگر پھولوں والی ڈوڈیاں کدھر تھیں اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔اور اب سارے میں یہ گلابی گندوراج جیسی صورت والوں نے ماحول میں ایک البیلا اور من چلا سا حسن بکھیر دیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور موٹا تازہ پالتو بلّے کی طرح کانچ جیسی آنکھیں گھماتا تھا۔ٹیکسی میں

بیٹھتے ہی اس نے ہم اجنبیوں کو چینی موسیقی سے محظوظ کرنا ضروری سمجھا اور لگا تار گانے سنوانے کا شغل جاری رکھا۔

ڈومیسٹک فلائٹ ایریا کا ہی کوئی حدوحساب نہ تھا۔ اتنا وسیع ویٹنگ لاؤنج اور لوگوں کے پرے۔ ایک تو ستیاناس ہوا ان موبائلوں کا۔ لڑکے لڑکیوں کے جتھے چارجنگ پوائنٹس سے چمٹے کہیں کھڑے، کہیں بیٹھے اپنے موبائلوں کو چارج پر لگائے باتوں میں مگن تھے۔ کرسیوں پر بیٹھے مسافر یا تو اُونگھتے تھے یا پھر موبائلوں سے کھیل رہے تھے۔

اِس سارے بھرے میلے میں صرف ایک بچہ ایسا نظر آیا تھا جو کتاب پڑھ رہا تھا۔ بڑی خوش قسمت ماں کا بیٹا ہے سوچا۔ میں نے بچے کی ہمسائیگی میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔ یونیورسٹی میں معاشیات کا طالبعلم تھا۔ انگریزی بول لیتا تھا مگر بہت اچھی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور محسوس ہوا کہ بولنے اور سیکھنے میں بے پایاں دلچسپی ہے۔ گونگ چو ہی جا رہا تھا اپنی پھوپھی کے پاس۔ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ چلو شاید کچھ سننے کو ملے۔

''گونگ چو کے بارے جانتے ہو کیسا شہر ہے؟''

لڑکا تھوڑا سا مسکرایا اور بولا۔

''زیادہ تو نہیں بس جنوبی چین کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔ بہت خوبصورت دریائے پرل Pearl کا ساحلی شہر۔ پرانا نام کنٹن Canton تھا۔ ہانگ کانگ کے بالکل ہمسائے میں ہے۔

آپ کی پھوپھی کہاں رہتی ہے؟

لیوان Liwan میں۔ یہ شہر کا پرانا حصّہ ہے جو دریا کے کنارے پر ہے۔ بہت خوبصورت پرانی تہذیب وثقافت کا گڑھ۔

میری راہنمائی کر سکتے ہیں کہ مجھے یہاں کیا کچھ دیکھنا چاہیے؟

’’آپ انٹرنیٹ سے مدد لیں۔وہ شہروں کیا گلی کوچوں کا کچا چٹھا کھول دیں گے۔‘‘

’’اتنی جوگی ہوتی تو تم سے پوچھتی۔دراصل بہت جلدی میں آنا پڑا۔موقعہ ہی نہیں ملا کہ نیٹ کھولتی۔‘‘

وہ میرے بارے جان چکا تھا کہ پاکستانی ہوں۔اس کے ہاں خوشی کا اظہار تھا جو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔عام چینی بچوں کے برعکس اس کی ناک کا چپٹا پن زیادہ نہ تھا۔آنکھیں بھی کچھ بڑی تھیں۔لہجے میں مٹھاس اور تمیز تھی۔

’’بہت زیادہ تو میں نہیں جانتا مگر چونکہ آنا جانا رہتا ہے اور قرب وجوار کا سیر سپاٹا بھی کرتا رہتا ہوں۔دریائے پرل کے کنارے فلک بوس عمارتوں کا سلسلہ بہت دل ربا سا ہے۔ہاں وہاں ایک بہت قدیم مسجد (صدیوں قبل تعمیر ہونے والی) موجود ہے۔یہ چین کی قدیم ترین مسجد خیال کی جاتی ہے۔‘‘

اس دوران سعدیہ نے پاس آ کر کہا۔

’’آیئے چلیں۔‘‘

’’اِس بچے نے بھی گونگ چو ہی جانا ہے۔‘‘

سعدیہ متحمل اور بردبار سی بچی ہے۔میری ہر نوالے بسم اللہ کی عادت سے بڑی شناسا ہے۔اس لیے اطمینان سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے چلانے لگی۔

ٹرمینل 2 کے کوئی 71 گیٹ تھے۔ہمیں 43 سے جانا تھا۔اُف بڑا چلنا پڑا۔شکر کہ شٹل بس سروس نے عین جہاز کے پاس جا کر اُتارا۔جہازوں کا تو جیسے میلہ لگا ہوا تھا۔ پی آئی اے کا بھی دانہ نظر پڑا۔مانو جیسے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔

حنان Hainan ایرلائنز کا یہ دیوہیکل جہاز تھا۔بوئنگ 777 جیسا ہی۔ایک

لائن میں آٹھ سیٹیں جن کی حالت خاصی آسودگی والی تھی۔ٹیکسی کرنے میں پورا آدھ گھنٹہ لگا یا۔اس وقت سورج کی دم واپسی کرنیں ایرپورٹ کے اِس ماحول کو بڑی رعنائی دے رہی تھیں۔یوں لگ رہا تھا کہ جیسے تا حد نظر پھیلا یہ میدان سونے کے پانیوں میں غوطے مار رہا ہو۔فضائی میز بانیں یوں تو دلکش تھیں پر بیچ میں کچھ ماٹھے ٹانکے بھی جڑے ہوئے تھے۔

بڑی بھوک لگ رہی تھی۔شکر کیا برتنوں اور ٹرالیوں کی کھٹ پھٹ شروع ہوئی۔فش چکن چاول تھے۔"کمبختو خالی فش ہی دے دیتے۔چکن بھی گھسیڑ دیا اور چاول بھی۔ذائقہ بھی بس ایسا ہی بےسوادا سا" بڑبڑاہٹ بھی ساتھ ہی شروع ہوگئی۔

سعدیہ تو اِس معاملے میں بڑی وہمی ہے۔اس نے دہی اور بند والی ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا۔میرا ایمان البتہ کچا پکا ہی رہتا ہے۔چائے نے کیا لطف دینا تھا قہوہ ذرا مزے کا نہ تھا۔

باپ رے باپ گونگ چو ایئرپورٹ کوئی شاندار سا شاندار تھا۔نظروں کو ہر ہر قدم پر الجھائے دیتا تھا۔مشرق بعید اور ایشیائی قوموں کا توجمِّ غفیر تھا ہی پر مشرق وسطیٰ کے توپ اور کفایہ والوں نے بھی رونقیں لگا رکھی تھیں۔بیچ میں ہم شلوار قمیضوں والے دانے بھی شامل ہو گئے تھے۔سیکورٹی کی ایک ڈشکری سی عورت نے سٹرپ لگائی اور کلیئر کر دیا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔باہر آنے پر محسوس ہوا تھا کہ زندگی کی تیز رفتاری کو جیسے یہاں برقی پہیے لگے ہوئے ہیں۔ تہہ در تہہ منزلوں کے سلسلے اوپر نیچے چڑھتی اترتی سڑکوں اور ان پر پھر کی طرح دوڑتی بھاگتی ٹریفک اور آسمان کی وسعتوں تک پھیلا ہوا شور و غوغا۔

سچی بات ہے حواس گم کرنے والا منظر تھا۔

ایک جہازی ستون کے پاس ہمیں ٹھہرا کر عمران ہوٹل سے بھیجی گئی ٹیکسی کو دیکھنے

گیا۔ یہیں ذرا چند قدم پرے رک سیک کمروں پر لادے میں نے چند لڑکوں کو دیکھا۔ چال ڈھال اور نین نقش بتاتے تھے کہ اپنے ہی ہیں۔ ہیلو ہائے کی اور پوچھا تو جانا۔ اتر پردیش انڈیا کے ہیں۔ سامان کی خریداری کے لیے آئے تھے۔ کاروباری دنیا کا بہت بڑا مرکز جہاں ہر چیز کی نمبر ایک نمبر دو نمبر تین مارکیٹیں زیر زمین اور بالائے زمین بنی میلوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔

ہوٹل قریب ہی تھا۔ رات تھی۔ علاقہ کیسا ہے؟ رات کو تو کچھ سمجھ آنے والا نہ تھا۔ ہوٹل کی کی دو منزلہ عمارت اگرچہ نئی نکور تھی مگر بس ٹھیک ہے والی صف میں کھڑی تھی۔ ہاں نام کچھ توجہ کھینچتا تھا Liz Wise Choice۔ ڈنڈیاں مارنے کی بھی ساتھ ہی کوششیں شروع ہوگئیں۔ نوعمر سا ایک لڑکا دلالی کا کردار ادا کرنے پر لگایا گیا تھا۔ پہلے جو کمرہ دکھایا گیا اس پر ہماری ناپسندیدگی کی تکرار ہوئی۔ لڑکا انگریزی میں ٹھیک تھا۔ تکرار بڑھنے پر نئے کمرے کھولے گئے۔ پسند آنے پر کمیشن کا مطالبہ۔ ناشتے میں بھی ڈنڈیاں مارنے کی سرتوڑ کوشش۔ الگ سے پیسوں کا مطالبہ۔ عمران نے ذرا کھری کھری سنائیں تو راہ راست پر آ گیا۔

عمران ہنسا۔ ''دراصل بیچارے نئے نویلے نو دولتیئے ہیں۔ بین الاقوامی سیاحت کے طور طریقوں سے آگاہ ہی نہیں۔ ہماری طرح داؤ لگانے کی کوشش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چلو خیر۔''

صبح کے پرنور اجالے نے گرد و پیش کے منظروں کو واضح کیا۔ علاقہ نیا بھی تھا اور ابھی زیر تعمیر بھی۔ ناشتہ ملحقہ ایسی ہی ایک عمارت میں دیا گیا تھا پر تھا مزے کا۔ ابلے انڈے، پھلیوں کی مزے دار بُھر جی، چاولوں کی کھچڑی بیچ میں مونگ کی دال کے دانے لشکارے مارتے تھے۔ اُبلی چھلّی کا ٹوٹا، اُبلی شکرقندی اور مالٹے کی پتلی قاشیں۔ بندہ بیس بھی کھا جائے

تو ایک مالٹا نہ بنے اور ہاں نوڈلز بھی۔ چلو چائے بہتر تھی۔

سب وے تک ہوٹل والوں نے لفٹ دی۔

علاقہ تا حدّ نظر سیمنٹ ،سریے کی ادھوری اور مکمل عمارتوں کے نرغے میں تھا۔ جھاڑیوں اور چھوٹے موٹے کھیتوں کے درمیان سے پختہ سڑکیں بنائی گئی تھیں۔ دفعتاً ایک جگہ ایک حیرت انگیز منظر دکھائی دیا۔ قبرستان تھا اور پچیس تیس کے قریب لوگ وہاں موجود تھے۔ گاڑی کی رفتار خاصی مدھم تھی۔ منظر چونکہ سڑک کے قریب ترین تھا۔ اس لیے لوگ کہیں صفائی کرتے، کہیں مٹی کھودتے، کہیں ان کی مرمت کرتے جان پڑے۔

میرے استفسار پر عمران نے بتایا کہ آج ان کا چھنگ منگ Qing ming Festival ہے۔ اس کی تفصیلات کا احوال میرے استفسار سے قبل ہی اس نے بتانا شروع کر دیا۔ دراصل یہ چینیوں کے اپنے آباء واجداد کو یاد کرنے اور ان کی قبروں کی صفائی ستھرائی کا قومی دن ہے۔ یہ موسم بہار کا تہوار ہے۔ آج 5 اپریل ہے۔ 6 اور 7 کو بھی چھٹیاں ہیں۔ تین دن جب وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ خود کو جڑا ہوا پاتے ہیں۔

میرے دل پر جیسے گھونسہ سا پڑا۔

''ارے کتنی اچھی اور کتنی خوبصورت ریت اور روایت پال رکھی ہے ان لوگوں نے۔ چلو جی جان سے ان کو یاد تو کرتے ہیں۔ انفرادی سطح پر تو بندہ کچھ تھوڑا بہت کر لیتا ہے۔ مگر اجتماعی سطح اور خاص طور پر حکومتی پلیٹ فارم پر اس کا اہتمام کرنا یقیناً قابل صد تحسین ہے۔ سچی بات ہے ہم تو بھول ہی گئے ہیں اپنے والدین کو۔ باقی آبا واجداد کی تو بات ہی چھوڑ یئے۔ ان کے لیئے ایک دن کیا چند لمحے بھی منانے کی ہمیں توفیق نہیں ہوتی۔

اس کی تفصیلات اور پس منظر سے آگاہی بھی عمران نے دی۔ دراصل فوک کہانیوں کا وہ بہت دلدادہ ہے۔ اپنے چینی ساتھیوں کی تو جان نہیں چھوڑتا ہوگا کہ جب تک

کسی واقعے کے کچے چٹھے تفصیلاً سن نہ لے۔

چینی قوم تہواروں میں رنگ بھرنا جانتی ہے۔ یوں بھی مختلف علاقوں میں روایات بھی اپنے اپنے طورطریقوں کے مطابق ہی ہوتی ہیں۔ پچھلے سال ہم چند پاکستانی مدعو تھے۔ پتنگ بازی بھی ہوئی۔ ہماری تو موجیں ہوگئیں۔ سبھوں نے اپنے اپنے رانجھے راضی کیے۔

پتنگوں کے ساتھ ایک اور دلچسپ بات بھی سننے کو ملی تھی کہ قدیم لوگ اپنی محبت و عشق کی کہانیاں، ان کے المیئے، اپنی خواہشات اور آرزؤں کی کتھا ہیں ان پتنگوں پر لکھ دیتے تھے۔ ہمارے پرانے لوگوں کی طرح جو کبوتروں کے ساتھ ایسے ہی شغل کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی پتنگ آسمانوں کی وسعت میں لے جا کر ڈور کاٹ دیتے تھے۔ گویا انہوں نے اپنے دکھڑے اپنے غم سب ہوا کے حوالے کر دیئے ہیں اب وہ انہیں کہاں کہاں لے جاتی ہے یہ ہوا جانے اور اس کا کام۔

بیشتر چینی مزے دار کھانے بناتے، خود کھاتے کھلاتے اور لوگوں میں بانٹ کر بڑی خوشی اور طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ اور وہ ایسا کرنے کے مواقع ڈھونڈتے ہیں۔

اس روایت سے وابستہ کہانی بھی سن لی۔ چینی تہذیب بھی صدیوں پرانے کھاتے کھولتی ہے۔ قبلِ مسیح سے بھی کہیں ہزار اور کہیں ہزاروں سال پرانے قصے لوگوں کو یاد ہیں۔ علاقے فتح کرنا اور دوسری مملکتوں کو تاراج کرنا تو ہمیشہ سے انسانی فطرت کا خاصا رہا ہے۔ سلسلے سینکڑوں سال قبل مسیح کے ہوں یا حال کے۔ انسان حرص و ہوس کے پھندوں سے کبھی باہر ہی نہیں نکلتا۔

یہ کہانی تو 655 قبل مسیح کے وقتوں کی ہے۔ ایک طرف اگر انسان کی وحشی جبلت اور لوٹ کی مار کی عکاس ہے تو دوسری جانب محبت اور وفاداری کے ان لافانی جذبوں کی بھی نمائندہ ہے جس پر انسانیت کی بقا ہے۔

چن Jin ریاست جس کا موجودہ نام شان شی Shanxi ہے کے والی پرنس شن جہ پر ہمسایہ ریاست کن Qin بادشاہت کے ڈیوک میو Mu نے حملہ کیا اور قبضہ کرلیا۔ دربدری چینگ ار کا مقدر بنی۔ فاقوں کی نوبت آئی۔ بھوک نے مرنے قریب پہنچا دیا۔ وفادار ساتھی جیے زی تھوے Jie Zitui نے اپنی ران کاٹ کر اپنے شہزادے چینگ ار کو سوپ کے ساتھ پیش کی۔ شہزادہ ایسی بے مثال قربانی پر بے حد متاثر ہوا۔ عہد کیا جب وقت بدلے گا تو حق خدمت ادا کروں گا۔ انیس سال بعد تاج وتخت دوبارہ نصیب ہوا۔ مگر وہ اپنے محسن کو بھول گیا۔ مہینوں بعد یاد آیا۔ کھوج کیا تو معلوم پڑا کہ وہ اپنی ماں کے ہمراہ کہیں جنگلوں میں ہی رہ گیا ہے۔

تلاش شروع ہوئی مگر ناکامی۔ آخر جنگل کو آگ لگا دی گئی کہ جیے Jie اس طرح باہر نکل آئے گا۔ مگر آگ بجھنے پر جی کو ایک جلے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے دیکھا۔ پاس ایک تحریر تھی۔ شہزادے کی درازی عمر، ملک میں امن اور سلامتی کے اظہار اور ڈھیروں دعائیں لکھی ہوئی تھیں۔ شہزادے نے اس کے حضور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا اور وہاں ایک شاندار مقبرہ بنا کر ہر سال میلہ لگا کر اسے یاد کرنے کا ایک سامان پیدا کر دیا۔

اثر انگیز کہانی تھی۔ دل ملول ہوا۔ مگر سب وے کے نئے منظروں نے آنکھوں کو پھاڑتے ہوئے نئی سوچوں میں اُلجھا دیا۔ میرے سامنے زیر زمین تیز رفتار ٹرینوں کے سلسلے تھے۔ برقی زینوں سے اُترتی اور چڑھتی خلق خدا کے عظیم الشان ہجوم پل جھپکتے میں چنٹیوں کی طرح ظاہر ہوتے اور پل جھپکتے میں ہی غائب ہوجاتے۔ یہی سلسلہ ہمیں بھی دھکیل کر شہر لے آیا۔

اب سب سے پہلے سعد بن ابی وقاص کے مزار مبارک پر حاضری دینی تھی۔ باقی کام تو بعد کے تھے۔ سچی بات ہے اگر عمران کو چینی نہ بولنی آتی تو ذلیل ہونے والی بات ہونی

تھی۔اس نے ٹیکسی رکوائی اور Huaisheng کھوائے شنگ مسجد کا کہا۔تکونی آنکھیں گھماتے ہوئے ڈرائیور نے کہا۔''پتہ بتاؤ مجھے۔''

''ارے بھئی عمران نے موبائل کی سکرین دکھائی اور بولا۔یوئے شیو Yuexiu ڈسٹرکٹ چلنا ہے۔وہاں کی جی فانگ نارتھ روڈ 901 Jiefang North Road پر جانا ہے۔''

تو ہم رنگ روڈ کے دیو ہیکل ستونوں،ان پر کھڑی پٹڑیوں کے سایوں اور رش کے بے پناہ ہجوم میں گھری اس شہر کی قدیم ترین مسجد کے محرابی دروازے سے داخل ہوئیں جس کی پیشانی اُس مبارک نام سے چمک رہی تھی۔محبت وعقیدت کا ایک سمندر تھا جو سینے میں موجیں مار رہا تھا۔کیسے ہم ماں بیٹی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے مقدس فضا اور ہریالی کے حسن کو اپنی آنکھوں میں جذب کرتے بڑھ رہی تھیں۔جائے وضو داخلی دروازے کی قریبی جگہ پر تھی۔یہ بھی حسن اتفاق ہی تھا کہ دن جمعہ کا تھا۔

اور جب دھیرے دھیرے درود پڑھتے ہوئے اس بارہ دری میں پہنچے جو اپنی تعمیری نوعیت کے اعتبار سے بے حد منفرد تھی۔یہاں بیٹھنے کا انتظام اعلیٰ۔پانی کا تاریخی کنواں جس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔جسے ایک سسٹم کے تحت گرم اور معتدل رکھا جاتا ہے۔اس پر انگریزی اور چینی میں تاریخ درج تھی۔1300 سو سال پرانی تحریر کے مطابق تعمیر حضرت سعد بن ابی وقاص کے ہاتھوں ہوئی تھی۔صداقت کتنی ہے؟ میں نہیں جانتی تھی۔کنوئیں کے ساتھ بنی سبیل سے میں نے بیٹھ کر پانی پیا۔نم آلود آنکھوں اور گداز دل کے ساتھ آسمان کو دیکھا۔میرا مومو اُس کے حضور سجدہ ریز ہوا۔

''ارے میں اور یہاں۔''

☆☆☆

باب نمبر:۲۴ مسجد سعد بن ابی وقاص

- تاریخی شواہد سعد بن ابی وقاصؓ کی یہاں آمد کو ثابت کرتے ہیں۔
- مزاروں پر کرنسی نوٹ وارنے والا کام یہاں بھی ہوتا ہے۔
- آج کا گونگ چو یورپی اتحادیوں کا کپتان تھا۔

''الفاظ کب ہیں میرے پاس جو میں تیرے حضور پیش کرسکوں۔'' احسان کی سرشاری میں بھیگتی جارہی تھی۔ خود سے بولتی جارہی تھی۔

جب دفعتاً عورتوں، مردوں اور بچوں کا ایک ریلا آیا۔ ماشاءاللہ کوئی تیس 30 کے قریب افراد پر مشتمل لوگ اونچے لمبے جن کی سیندوری رنگتیں قابل رشک تھیں۔ پھولی پھولی گالوں والے پیارے پیارے بچے۔ یہ اندر مزار سے آئے تھے۔ اُن کے دو بڑوں نے سٹرابیری دہی والے ڈبے کھولے۔ ایک اور بڑے کارٹن سے مٹن پائیز نکالیں۔

ایک طائرانہ سی نظر گردوپیش پر ڈالی۔ جتنے لوگ وہاں موجود تھے ان میں تقسیم کرنی شروع کردیں۔ ہمیں بھی یہ سوغات نصیب ہوئی۔ میٹھا دہی ذائقے سے بھرا ہوا۔ سرخ خستہ بڑی بڑی چھ پائیز اور اتنے ہی دہی کے ڈبے۔ پائیز جن کے بارے اس بلند قامت خوش شکل مرد جس کے اگلے دو دانت سونے کے تھے نے ہنستے ہوئے میری طرف دیکھتے ہوئے ایک تفاخر سے کہا تھا۔

''یہ حلال گوشت کی ہیں جو میں نے خود بنائی ہیں۔ میں بہت اچھا شیف ہوں۔''

پوری بتیسی کھول کر میں نے اُسے داد دی تھی اور ساتھ ہی سامنے بکھرے آسمان کو دیکھا تھا۔ یہ آسمان تو گویا جیسے میرا دارو تھا۔ جسے دیکھتے ہی نشیلی ہو جانا تو شرط تھی۔ تو اس

وقت بھی اسے تکتے ہوئے خود سے کہا۔

''تو اے اللہ میں تیری کون کون سی نعمتوں کا شکر ادا کروں۔''

اور جب اِس شکر گزاری میں میری داخلی کیفیات احسان مندی اور تشکر میں نہا رہی تھیں۔عمران اِن لوگوں سے مصروف گفتگو تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے بتایا کہ یہ لوگ قریبی جزیرے شمائن shamian سے آئے ہیں۔ یہ دریائے پرل کے دہانے پر ایک بہت خوبصورت کالونی ہے جو دراصل کبھی برطانیہ اور فرانس کے زیر تھی۔انیسویں صدی میں بنائے ہوئے یورپی تاجر اقوام اور جاپان کے عالیشان ولاز اور مینشن آج بھی اس علاقے کا حسن ہیں جو اب حکومت اور مقامی لوگوں کی ملکیتیں ہیں۔

نور بخری کا کہنا تھا کہ آپ کو یہ جزیرہ ضرور دیکھنا چاہیے۔

سچی بات ہے میرا تو جی للچانے لگا تھا۔سری لنکا میں نگمبو کو دیکھا تھا۔نو یرا علیہ کی سیر کی تھی۔اِن یورپی لوگوں نے کس قدر دل کش اور شاندار نمونے وہاں تعمیر کیے تھے۔

بہت پیارے لوگ تھے۔عورتیں بھی حسن اخلاق کی دولت سے مالا مال تھیں۔

عائشہ مامیتی نور بخری کی بہن تھی جب کہ ملائکہ بیوی تھی۔کزن کا نام زینب تھا۔

میں نے ہنس کر پوچھا۔

''یہ نام ہماری تو جان ہیں پر یہاں تو سنا ہے ایسے ناموں پر پابندی لگ گئی ہے۔''

''ادھر ایسا کچھ نہیں ہے۔ہاں سنکیانگ میں البتہ سننے میں آیا ہے۔ویسے یہ مغرب بھی دو دھاری تلوار کا کردار ادا کرتا ہے۔چین کے ساتھ کاروباری قربتیں عروج پر، مگر جڑیں کھودنے میں بھی بڑا تگڑا۔اندر خانے اور اوپر خانے دونوں محاذوں پر۔''

''اور چین؟''

بڑے ڈپلومیٹک اور پراسرار سے انداز میں میرا سوال تھا۔

’’وہ ابھی ایک دھاری تلوار ہے۔سپر پاور بننے کے بعد جوہر کھلیں گے۔‘‘

سبھوں سے خوب خوب جھپیاں ڈالیں۔ترک سلجوق نسل سے تعلق تھا۔دراصل بنیادی طور پر ہم مانچورین لوگوں کی اولاد ہیں۔سنکیانگ کو کبھی مانچوریا کہا جاتا تھا۔آج کے ترک لوگ انہی لوگوں کی آل اولادیں ہیں جنہوں نے کہیں نویں صدی میں اسلام قبول کیا تھا۔

شمائن میں ہم بھائیوں کا ریسٹورنٹ ہے۔دراصل جب گونگ چو اتحادیوں کے قبضے میں تھا تب ایک برٹش ولیم راجر کا یہاں خاصا بڑا بزنس تھا۔میرے دادا اس فیملی کے شیف تھے۔یہ لاولد جوڑا تھا۔میرے دادا کی اچھی عادات اور خدمت گزاری انہیں بہت پسند تھی۔میرے والد کو انہوں نے گود لے لیا تھا۔جب وہ جانے لگے تو گھر اور ریسٹورنٹ انہیں دیتے گئے۔اسی ریسٹورنٹ کو انہوں نے بہت شاندار طریقے سے بڑا کیا۔میرے بھائیوں کا کاروبار بھی اسی شعبے سے ہے۔گونگ چو میں بھی ہمارے دو ریسٹورنٹ ہیں۔

چین کی اِس حیرت انگیز ترقی اور ہوئی Hui مسلمانوں بارے جاننے کے لیے میں نے بات کی۔

’’ارے بھئی چینیوں کی اس ترقی کے پیچھے بہت پرآشوب تاریخ ہے۔چینی قوم کی عظمت کو سلام جس نے بھوک ننگ، جبر ظلم سب کے کڑے وار سہے۔

چینی عوام کی تحریک آزادی جو ٹکڑوں کی صورت شروع ہوئی تھی۔اس میں ہوئی Hui قبیلے کے مسلمان فوجی دستوں نے جو کردار ادا کیا وہ تاریخ میں ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

دلیران گانسو Gansu Braves کے نام سے مشہور یہ فوجی دستے جن کا تعلق صوبہ گانسو سے تھا۔دس ہزار جیالے اور جنگ جو مسلمانوں کے دستوں پر

مشتمل تھا۔انہوں نے بہت سے محاذوں پر آٹھ ملکی اتحاد جس میں برطانیہ،امریکہ،فرانس،روس،جرمنی،اٹلی،اسٹریا،ہنگری اور جاپان شامل تھے کو شکست دی۔اس وقت چین پر ملکہ شی کی حکمرانی تھی۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ملکہ شی بھی انہی کی پناہ میں آ گئی ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ بے شمار مقامات پر یہ لوگ بہت بے جگری سے لڑے۔تاہم اسلحے کی کمی اور کچھ درمیان کے لوگوں کی غداری کی وجہ سے شکست کھا گئے۔اب جو اتحادیوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا وہ ایک لمبی داستان ہے۔عورتوں کی بے حرمتی کے بے شمار المناک واقعات رونما ہوئے۔

جب میں اُن کی باتیں سننے میں محو تھی۔عمران نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ فاتحہ پڑھ آیئے۔ظہر کا وقت بھی قریب ہے۔''

اب معذرت کرنا اور اٹھنا ضروری تھا۔

پھر ہم دونوں ماں بیٹی گلابی پینٹ سے سجے خوبصورت محرابی دروازوں سے گزر کر مزار مبارک کی طرف گئیں۔کمرہ چھوٹا سا تھا۔ہاں البتہ تعویز بڑا لمبا چوڑا جو آف وائٹ شنگھائی سائن سے ڈھنپا ہوا تھا۔اردگرد کھڑا خاندان سلام و درود پڑھنے میں دل و جان سے مگن تھا۔درود کا کچھ حصہ چینی زبان میں تھا۔عورتوں کے ہاتھوں میں ایک یوآن نوٹوں کی گڈیاں تھیں جنہیں وہ مزار پر لٹانے میں مصروف تھیں۔میرے اور سعدیہ پر بھی نوٹوں کی بارش ہوئی۔

واہ بے اختیار ہی ہنسی ہونٹوں پر آ گئی تھی۔محبت کا یہ اپنا اپنا ساجڑ کا برّصغیری انداز۔

ظہر کا وقت قریب تھا۔مسجد جانے کا سوچا۔سبحان اللہ۔راستہ خوبصورت سبزے سے گھرا ہوا ایک موہ لینے والے تاثر کا حامل تھا۔بانس کے پکے ہوئے قدآور درختوں کے جھنڈوں نے کچھ یاد دلایا۔مسجد تک جانے کے لئے آرام دہ سیڑھیوں کا ایک لمبا چوڑا اسلسلہ

اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتا تھا۔قدآور دروازوں کا حُسن ،انہیں انفرادیت دے رہا تھا۔انہی شاندار دروازوں سے اندر تاحد نظر بچھے نیلے قالینوں کے منظر دل لبھانے والے تھے۔دیواریں عربی کتبوں سے بھری ہوئیں۔غربی برآمدہ بھی اپنی پچھلی اوراگلی محرابوں کے ساتھ خوبصورت نظر آتا تھا۔

مسجد کی چھت اپنے غیر معمولی اچھوتے پن سے فی الفور توجہ کھینچتی تھی۔نیلی اور سبز ٹائلیں بہت دل کش لگتی تھیں۔یہ اظہار ہے اُس گرم جوشی اور محبت کا جو گونگ چونے مسلمانوں کی اس عبادت گاہ کو دی۔اندر ایک تختی بھی دیکھی "Jiao chang xiyu" مطلب عمران نے بتایا۔

''اسلام مکہ سے آتا ہے۔''

کندہ کاری کا یہ تحفہ 1901 میں کن Qin کے شاہی گھرانے کے ایک شہنشاہ نے دیا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ میرا دل چین کے ان تمام شہنشاہوں کی اعلیٰ ظرفی کا احسان مند تھا کہ جنہوں نے جب جب یہ کبھی آگ میں جلی ،کبھی زلزلوں اور کبھی سیلابوں کی بھینٹ چڑھی انہوں نے اِسے از سرنو زندگی دی۔آج یہ اسی وسعت قلبی کی عکاس ہے۔

پتہ چلا تھا کہ اندر خواتین کا الگ سے حصّہ ہے۔آرام دہ کرسیاں بوڑھی عورتوں کے لئے تھیں۔پہلے نماز پڑھی۔شیلفوں میں سجے قرآن پاک کے نسخے تھے۔پھولا پھرولی کی۔پھر ایک منتخب آیات کا نسخہ تھاما۔سورہ توبہ پڑھی۔سورہ یٰسین کو دہرایا۔

اب ذرا اپنے گرد وپیش بیٹھی خواتین کو نظروں میں جانچا۔قریب ترین والی آبنوسی رنگت پر بنفشی ساڑھی پہنے گود میں چھ ماہ کا بچہ لئے زیرلب کچھ پڑھ رہی تھی۔مگر نگاہیں چہار جانب رقصاں تھیں۔بات کی تو جانا ہانگ کانگ سے آئی ہے۔یوں تعلق انڈیا کے شہر پٹنہ سے تھا۔گود کی بچی کچھ مضطرب سی تھی۔قالین پر لوٹنیاں لیتی پھرتی تھی۔

آناًفاناًبچی نے منہ بھر کر اُلٹی کر دی۔ایسی اوندھی عورت کہ پاس کوئی ٹشو یا رومال تک نہ تھا۔فوراً بیگ سے چھوٹا تولیہ نکالا۔سعدیہ اُسے گیلا کر کے لائی۔قالین کو صاف کیا۔ماں اور بچی کو باتھ روم میں لے جا کر صفائی ستھرائی کروائی۔بچی کو تیز بخار تھا۔

میرے جیسی نے کہا۔''تو آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ارے پھپھیا ساس آئی ہوئی ہے انڈیا سے۔برصغیر کی عورت پھٹ پڑی تھی۔ انہیں ادھر آنے کا بہت شوق تھا۔اب اس دودھ پیتی کو کیسے چھوڑ آتی؟''

پھوپھی ساس سے بھی علیک سلیک ہوئی۔ایک کونے میں بیٹھی اپنا پنج سورہ پڑھ رہی تھی۔شامت اعمال سے ہندوستان کے حالات بارے پوچھ بیٹھی۔وہ تو گویا آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھی تھی پھٹ پڑی۔

''ارے بھائی تمہیں ہم سے کیا لینا دینا۔بڑی تڑپ تھی نا تمہیں پاکستان بنانے کی۔لولوٹ لو مزے۔ہماری خیر خواہی تم لوگوں نے خاک کرنی ہے؟تم لوگوں سے تو اپنا آپ نہیں سنبھل رہا۔چلو ساتھ ہوتے تو ہماری طاقت کا ان بدبختوں کو بھی کچھ احساس ہوتا۔اب تو یہ من مانیاں کرتے پھر رہے ہیں۔''

دل گرفتہ سی اٹھ کھڑی ہوئی۔رخ پھیرا تو ایک حجاب میں لپٹی نوجوان لڑکی نے نگاہیں چار ہوتے ہی مسکراہٹیں چہرے پر بکھیریں۔یہ نتاشا تھی کوئٹہ بلوچستان سے۔ چندو chengdu شہر کی Sichuan Normal University کی طالبہ تھی۔چینی زبان میں ماسٹرز کر رہی تھی۔سکالرشپ پر ڈائریکٹ منتخب ہو کر آئی تھی۔یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ کوئی پچاس کے قریب پاکستانی سٹوڈنٹ ہیں۔ہندوستانی بھی ہیں۔

اِس سوال کے جواب نے بھی عجیب سی طمانیت دی کہ عام چینی خواہ وہ طالب علم ہوں یا شہری سب پاکستان سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ اگر کبھی انڈین اور پاکستانی طلبہ کے

درمیان کوئی متنازعہ مسئلہ کھڑا ہو جائے تو اکثریت ہمیشہ پاکستانی طلبہ کو سپورٹ کرتی ہے۔

ملائشیا کا ایک پورا ٹولا جس کی اکثریت نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں پر مشتمل تھی اچانک برسنے والی بارش کی طرح نمودار ہوا تھا۔لڑکیوں کی اکثریت حجاب اور عباؤں میں لپٹی ہوئی تھی۔جنہیں دیکھتے ہی میں محبت و بھائی چارے کے شدید قسم کے جذباتی احساسات کے ساتھ آگے بڑھی۔انگریزی انہیں آتی تھی مگر ایسا سرد رویہ۔ سچی بات ہے ایک جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔ ہکا بکا ہونے والی تو بات تھی۔دنیا میں کہیں بھی بالعموم ملت اسلامیہ سے جڑے ہونے کا سن کر جو رونق چہروں پر پھیلتی،آنکھوں میں چمکتی اور لبوں کو مُسکاتی ہے وہ یہاں سرے سے ہی مفقود تھی۔ایک دو نہیں کمبخت مارے سبھوں نے اسی سردمہری کا اظہار کیا تھا۔شرمندہ سی ہو کر میں نے خود کو لتاڑا۔

’’چلو تم بھی ذرا لگام ڈالو اپنی اس اسلامی چاہت و محبت کے اظہار کو۔‘‘

معلوم ہوا تھا کہ مسجد کی عقبی سمت ریڑھیوں پر انجیر،سیاہ کشمش اور خوبانیاں بک رہی ہیں۔’’دیکھتے ہیں‘‘ والا سفری تجسس کشاں کشاں وہاں لے گیا۔ یہاں تو بہار آئی پڑی تھی۔ یہ کاشغری، یارقندی اور قازق لوگ تھے۔کچھ ریڑھیاں مقامی لوگوں کی بھی تھیں۔ کمال کی ذائقے سے بھری خوبانیاں تھیں،سیاہ کشمش،اخروٹ بادام سب چیزیں خریدیں۔

واپس مسجد میں آئے۔ابھی قبرستان دیکھنا باقی تھا۔تاہم تھوڑی دیر مسجد کے اسی کشادہ صحن میں بینچوں پر بیٹھ کر اِن خریدی گئی سوغاتوں سے منہ ماری کو دل چاہنے لگا تھا۔اور جب ایسا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ فی پیکٹ بیس 20 یوآن کو پاکستانی روپے سے ضرب اس کے مہنگا یا سستا ہونے کے حسابی چکروں میں تھے۔

دفعتاً میری نظریں مسجد کے مینار پر پڑیں۔میں تو دیکھتی رہ گئی تھی۔ یہ کسیِ حسین نازنین کی صندلی پیشانی پر جگمگاتے جھومر کی طرح لشکارے مارتا تھا۔جس کے بالا خانے

سے فلاح کے لیئے آؤ کا وہ سرمدی نغمہ جسے اذان کہتے ہیں ابھی تھوڑی دیر قبل جسے سنتے ہوئے میرے وجود میں ارتعاش کی برقی لہریں سی دوڑی تھیں اپنایت کا سریلا پیغام میرے وجود نے سنا تھا۔

اب جب میں جذبات کی ایک نئی گھمن گھیری میں اُلجھی اِس کے روایتی اور اسلامی طرزِ تعمیر کے حسین سنگم کو محبوبانہ نظروں سے دیکھے چلی جارہی تھی۔ مجھے آسمان کے قدموں کو چھوتا یہ سفید براق گویا اُن قدیم کاروانوں کے ہدی خوانوں کی کہانیاں سُنا تا محسوس ہوا تھا جو جزیرہ نمائے عرب کے صحراؤں سے اِس شہراہ ریشم پر گامزن ہوئے تھے۔ جو اپنے ساتھ نہ صرف اشیائے تجارت لائے بلکہ ایک نئے فلسفہ حیات کا خوبصورت تحفہ بھی اُن کی دین تھی۔ جانے کتنی دیر اِس محبوب دنیا میں کھوئی رہتی جب عمران کی آواز سے چونکی۔ وہ کسی سے تعارف کروار ہا تھا۔

درمیانی عمر کی طرف بڑھتا ہوا یہ پاکستانی محمد بخش جس کی زندگی کا ایک حصّہ چین کے اِس بے حد اہم تجارتی شہر کی صحرانوردی میں گزرا تھا۔ قیمتی موتیوں اور پتھروں کا بیوپاری جسے چودہ ملین آبادی والے اس شہر کے چپے چپے کا علم تھا۔

''کچھ شہر بارے بتائیے۔''

میرے کہنے پر گویا ہوئے۔

یہ آج یا چالیس (40) سال میں ترقی کرنے والا شہر نہیں بلکہ زمانوں سے چین کا ایک اہم کاروباری مرکز رہا ہے۔ تاریخی طور پر بھی تیسری صدی عیسوی سے بیرونی دنیا کے اثر ونفوذ کو کھینچ کر یہاں لانے میں کلیدی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ یہ چین کی واحد پہلی بندرگاہ ہے جہاں یورپی اقوام کا باقاعدہ آنا جانا لگا رہتا تھا۔

بیسویں صدی کے اوائل کی دوسری اور تیسری دہائیوں میں تو باقاعدہ پروگرام اور

جامع منصوبہ بندی کے تحت اِسے ماڈرن شہر کی صورت دی گئی۔ وسیع وعریض گلیاں، جدید سیوریج سسٹم، دکانوں کے ساتھ راہداریاں، جگہ جگہ پارک، سیلاب سے بچاؤ کے لیے بند تعمیر ہوئے۔ اِس کے یورپی سرپرست اِسے کینٹن canton کہتے تھے۔ علم کا مرکز، سیاست کا گڑھ، چینی انقلاب کو پروان چڑھانے والا شہر۔

محمد بخش نے شہر کی اہم جگہوں کی وضاحت بھی کی کہ ہمارے لیے اِس مختصر وقت میں کن کن کو دیکھنا بہتر رہے گا۔

یہاں دیکھنے والی آخری چیز بس اب قبرستان تھا۔ اٹھے کہ اسے دیکھیں اور آگے بڑھیں۔ سچی بات ہے قبرستان کیا تھا؟ یہ وسیع وعریض ٹکڑے پر مشتمل سبز پودوں اور جھاڑیوں میں گھرا واقعی حیران کن منظر پیش کرتا تھا۔ اس میں مہکتا باغ کیا تھا؟ جیسے حسن اور خوشبوئیں اکٹھی ہوکر خوشیاں منا رہی ہوں کہ ہم بہت مقدس اور اہم ہستیوں کا لطیف سا بار اپنے اوپر اٹھا کر بہت مسرور ہیں۔ اُن کی زندگیاں اوپر والے کی محبت اور اس کی مخلوق کی خدمت میں گزری تھیں۔

اس ماحول میں ڈاکٹر عمر یاد آئے۔ جن جذبات کا اظہار انہوں نے کیا تھا۔ میں وہی کیفیت اِس وقت اپنے اوپر طاری ہوتے محسوس کرتی تھی۔ دعائیں پڑھیں۔ دعائیں مانگیں۔ اور دھیمے سے کہا۔

’’میں کب اِس قابل تھی کہ چین کے اِس ثقافتی ورثے کے تحفظ کی اِس خوبصورت اکائی کو دیکھتی جو دراصل میرا بھی عظیم سرمایہ ہے۔‘‘

کھانے کی ذرا طلب نہیں تھی۔ بھائی چارے کی محبت میں لتھڑی چکن پائیز دہی کے دو ڈبوں اور خیر سے ڈرائی فروٹ کے پھکوں نے ذرا بھی گنجائش نہیں رہنے دی تھی۔ پائیز تو خیر سے ڈنر کے لیے بھی بچ گئی تھیں۔ چائے یا کافی کا ایک کپ اور فقیروں کا

شاندار ڈنر۔ سبحان اللہ۔ اب شہر میں گھومنا تھا اور کسی ہوٹل کو بھی دیکھنا تھا۔

میری تجویز پر کہ ہم کسی بھی بس میں سوار ہو جائیں۔ گھومیں پھریں۔ شام ڈھلے ٹیکسی والے سے کسی ہوٹل میں لے جانے کا کہیں۔

عمران ہنسا اور بولا۔ ''آپ اِسے اتنا آسان سمجھتی ہیں۔ یہ بہت بڑا شہر ہے۔''

اس بات پر تھوڑا غصہ تو آیا دل نے کہا۔

''لو یہ تو میری عمر بھر کی سیاحتی مہارت کو چیلنج کرنے والی بات ہوگئی ہے۔ ایسے میں چپ تو نہیں رہوں گی۔ رشتہ گو نازک ہے مگر اب پرانا بھی ہو گیا ہے۔ خیر ہے۔''

''ارے بیبا کیا ماسکو سے بھی بڑا ہے۔ روم، میڈرڈ یا استنبول بہت سارے نام گنوا دیئے۔ میرا تو طریقہ کار ہی یہی ہوتا تھا۔ ماسکو مشکل ترین شہر تھا کہ روسی نہیں آتی تھی اور وہ لوگ انگریزی نہیں بولتے تھے۔ میرے خیال میں شہر سے واقف ہونے کا بہترین طریقہ یہی ہے۔ پاس نقشہ ہو۔ ہوٹل کا کارڈ سنبھالا ہوا ہو۔ بس تو پھر ڈر کس بات کا۔

خودستائی ہرگز نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ جب میں ماسکو سے واپس آ رہی تھی اس کی میٹرو سے میری شناسائی کا کچھ یہ حال تھا کہ میں ایک عام روسی شہری سے زیادہ ماسکو سے واقف ہو گئی تھی۔ اور یہاں تو مقام شکر ہے کہ تم چینی تھوڑی بہت بول لیتے ہو۔''

تاہم دونوں میاں بیوی نے اِس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

ہائے دل مسوس کر رہ گئی۔ ہوتی نہ میری کوئی سہیلی ساتھ اور ہوتیں ہم دونوں۔ کیا مزے آنے تھے۔

بہرحال ٹیکسی میں گھومتے پھرے۔ کیا شہر تھا۔ عمارتوں پارکوں سے سجا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ ہم نے رات تو یہاں گزارنی ہی ہے۔ ہوٹل بھی کوئی ڈھونڈنا ہے تو کیوں نہ Shamian چلے جائیں۔ کل اُن لوگوں سے ملیں۔ رات کی فلائٹ سے واپسی

ہے۔بہتیرا وقت ہے۔مزہ آئے گا۔

اور جب اِس تجویز کا ذکر دونوں سے کیا تو شکر ہے کہ تجویز انہیں بھی اچھی لگی۔

عمران نے نور بحزی کو فون کیا اور کسی مناسب سے ہوٹل کا پتہ پوچھا۔

نور بحزی نے بتایا تھا Swan فائیو کیا سکس سٹار سے بھی آگے کا ہوٹل ہے۔مگر Aiqun Hotel بھی ٹھیک ہے۔بکنگ کے لیے کہہ دیتا ہوں۔

تعاون بڑا بھرپور تھا کہ کمرے کا کرایہ بہت مناسب تھا۔ہوٹل آنے کے لیے دونوں طریقے سمجھا دیئے کہ میٹرو سے بھی آسکتے ہیں۔فیری سے بھی۔میٹرو اسٹیشن اور فیری گھاٹ دونوں جگہوں سے ٹیکسی مل سکتی ہے۔

یہاں میں نے زبان کھولنے اور فیری کے لیے اپنی خواہش ظاہر کرنے سے گریز کیا۔اب سچی بات ہے فیری میں سوار پانیوں پر تیرتے ایک اور نئے جہاں کو دیکھنا تو بڑا پر لطف تجربہ تھا۔چلو چھوڑو جوڑی اگر اِن منظروں سے محظوظ ہونا نہیں چاہتی تو پھر بھئی اُن کی مرضی۔

بس میں نے تو ذرا اوپر والے کو رجھانا تھا۔ظاہر ہے دھرتی کے منظروں کا حسن دیکھ کر بے اختیار ہی اس پر پیار آنا شروع ہو جاتا ہے۔صدقے قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔اور بھئی کیسے نہ چاہے گا کہ اِس مہم جوئی کا تو کہیں گمان بھی نہ تھا۔اس کی محبت ہی ہے نا کہ وہ یکا یک نئے دروازے کھول رہا ہے۔پر پھر دل کو تسلی دی۔جزیرے پر جتنا جی چاہے واری صدقے ہو جانا کسی نے روکنا ہے تمہیں۔

☆☆☆

باب نمبر:۲۵ دیکھنا دریائے پرل کے قیمتی موتی شمائن کو

- o جزیرہ آنکھیں پھاڑتا اور زبان گنگ کرتا ہے۔
- o یورپی اتحادیوں کی پھوٹ چین کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچا گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور بھی بڑا من موجی قسم کا تھا۔ دکھانے کی حامی ہی نہیں بھری بلکہ کچھ علم میں بھی اضافہ کرنے لگا۔

جزیرے پر انگلینڈ اور فرانس مسلط تھے۔ جزیرے کی تاریخ تو ویسے بہت ہی پرانی ہے۔ سونگ اور لیانگ بادشاہوں سے اپنا ناطہ جوڑتی ہے۔

اب جب وہ جوش خطابت میں بول رہا تھا۔ میری نظریں باہر کے منظروں میں اُلجھ گئی تھیں۔ شام کی سنہری کرنوں میں چمکتا ہرا کچور سبزہ۔ سہ چہار منزلہ کلاسیکل طرز تعمیر کی حامل عمارتیں جن کے ماتھوں پر برطانوی طرز تعمیر کے مخصوص رنگ کی گہری چھاپ تھی۔ شفاف سڑکیں جن پر گھومتے پھرتے بچے، جوان اور بوڑھے جیسے اِن منظروں میں مزید رعنائیاں بھر رہے تھے۔ کسی گلی کے موڑ پر مجسمے اِس کا حسن بڑھاتے تھے۔ پرسکون ماحول میں رچی میٹھی سی خنکی بھلی لگتی تھی۔

کیسی لٹیری قومیں تھیں۔ کہاں سے آئیں اور کیسے قابض ہوگئیں؟ تاہم ایک بات کچھ بنا بھی گئیں۔

میٹرو اسٹیشن کی وسعتیں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ گو اس میں آرٹ اور کلچر کے وہ رنگ نہیں تھے جن کے لیے ماسکو کے میٹرو اسٹیشن دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ مگر اس کا پھیلاؤ اور جدتیں اپنے حسابوں دونوں ہی بے مثال تھیں۔ سیڑھیاں زینے در زینے چڑھتی

چلی جاتی تھیں۔اب ہانپنے والی بات ہی تھی۔باہر منظروں کے نئے رنگ دیکھنے کو ملے۔اوپر والے کی اعلیٰ اور ارفع تخلیق بھاگی پھرتی تھی۔اور ہیڈ برج اور فلائی اور سڑکوں کا جال سا دائیں بائیں آگے پیچھے سے ایک دوسرے کو یوں کاٹ رہا تھا کہ بندہ کا ماتھا گھومنے والی بات تھی۔

عمران نے ٹیکسی کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔پھر موبائل پر رابطہ ہوا۔تھوڑی دیر میں ہم ٹیکسی میں ایک نئے جہان رنگ و بو کی طرف جا رہے تھے۔شکر ہے عمران نے میرے دل کی بات جان لی تھی کہ شام کا حسن جزیرے پر ٹوٹ کر برس رہا ہے۔ٹیکسی ڈرائیور کو انگریزی بھی آتی ہے۔ہمارے لیے ضروری ہے کہ سیدھے ہوٹل جانے کی بجائے ایک چکر جزیرے کا بیٹھے بیٹھے لگ جائے۔

جزیرہ کیا تھا؟اگر میں حسن کے قصیدے پڑھنے لگوں۔اگر میں ارضی تشبیہات کے ڈھیر لگا دوں۔اگر میں استعاروں کی زبان بولنے لگ جاؤں، مجھے یقین ہے کہ اس کے حسن و جمال کی وضاحت میں جملوں کی قطاریں لگ جائیں گی اور حق خدمت پھر بھی ادا نہ ہوگا۔

حسن تعمیر میں اتنی انفرادیت تھی کہ اگر نظروں سے ابھی گوتھک طرز کا چرچ گزرا ہے تو چند ہی لمحوں بعد کسی برٹش کلاسیکل عمارت نے جکڑ لیا ہے۔اِن عمارتوں کا ایک سلسلہ چمکتے ہرے کھجور درختوں کے پس منظر میں لشکارے سے مارتا نظر آتا ہے۔کہیں باروق سٹائل اور کہیں وکٹوریہ طرز کی کھڑکیاں بتاتی تھیں کہ مکین کتنے صاحب ذوق لوگ تھے۔

سڑکوں کے دائیں بائیں پھولوں کے لمبے لمبے قطعے تھے۔گو خوش رنگ پھولوں نے ابھی انہیں خوش نظر نہیں بنایا تھا مگر بہار کے جوبن پر ان کا جوبن بھی تو قابل دید ہی ہوتا ہوگا۔

اب ایسے میں جنوب کی زرخیز زمینوں کے زرخیز شاعر کیوں نہ یاد آتے۔ وہ آئے اور اس کے ساتھ تھانگ Tang سلطنت یاد آئی تھی۔ چین کے سب سے بڑے شاہی گھرانوں میں سے ایک تھانگ Tang خاندان (907 - 618)، کو چینی شاعری کے سنہری دور کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ سوئے ہو Cui Hu (846 - 772) اپنے عہد کا ایسا ہی بے مثال شاعر تھا۔ جس نے شاعری میں بہت سے نئے اضافے اور نئی خوبصورتیاں پیدا کیں۔

سوئے ہو Cui Hu کی ایک من موہنی سی نظم تو ذرا دیکھیئے۔

گذشتہ سال اسی دن اسی گھر میں
ایک خوبصورت چہرے نے وفور شوق سے کچھ پوچھا تھا
کچھ ایسا لگا تھا
جیسے آڑو کے گلابی گلابی شگوفے
اس کے چہرے کے سنگ سنگ کھلے ہوں
بے خبر ہوں
آج وہ گلابی چہرہ جانے کہاں چلا گیا ہے
صبح کی عطر بیز ہواؤں میں
ابھی تک وہ گلابی شگوفے توانائیوں سے مسکراتے ہیں

چھوٹا سا جزیرہ جو برٹش اور فرنچ حصّوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک پل کا نام برٹش برج اور دوسرے کونے والے کا نام فرنچ برج۔

اف حسن و جمالِ فطرت کے جیسے دریا سے بہہ رہے تھے۔ اب ایسے میں کیسے نہ زبان سے نکلتا۔

''جزیرے پر تو جنت کا گمان گزرتا ہے۔''

شیو چھوان ڈرائیور نے ہنس کر کہا۔

''واقعی ۔ پر اِسے بنانے والے نرے دوزخی تھے۔چین کوئی کل کی سپر پاور بننے والی طاقت تھوڑی ہے۔یہ ماضی کی بھی سپر پاور تھی۔

ایک چکر لگانے کے بعد دوسرے چکر کا میں نے کہا۔مجھے جیسے تھوڑا سا اندازہ ہوگیا تھا کہ ڈرائیور کو چینی تاریخ سے خاصی آگاہی ہے۔اور اُسے بولنے اور خودنمائی کا بھی شوق ہے۔اس چکر میں نئے رنگ سامنے آرہے تھے۔

جا بجا دھرے مختلف کرداروں کے عکاس ڈھیروں ڈھیر مجسمے اس کی شان بڑھاتے تھے۔ بچے ، بوڑھے،عورتیں ،مرد،لڑکیاں ،لڑکے سب کہیں کوئی سائیکل پر چڑھا ،کوئی پیدل چہلیں کرتے پھرتے تھے۔ہوٹل وسط میں تھا۔ دو چکر لگانے کے بعد اُترے۔قریب ہی کافی بار اور ریسٹورنٹ بھی نظر آئے تھے۔گاڑی سے اُترتے ہی میں نے ڈرائیور سے کہا۔

''میں تمہاری مشکور ہوں گی اگر تم میرے ساتھ کافی پیو اور تھوڑی باتیں کرو۔ مجھے جیسے محسوس ہوا ہے تم کافی پڑھے لکھے ہو اور تاریخی شعور بھی رکھتے ہو۔''

سعدیہ ہنسی اور عمران کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کھینچتے ہوئے بولی۔

''آؤ چلیں ۔میری ماں کا تو وہ حال ہے جتھے ویکھاں تواپرات ،اوتھے گاواں ساری رات ۔ہم آرام کرتے ہیں۔ پھر نکلیں گے۔''

شکر کا بڑا لمبا سانس میں نے بھرا تھا۔

کافی کے مگ ہاتھوں میں تھام کر میں نے پوچھا تھا۔

''ہاں تو اب بتاؤ کہ یہ چین کیسے ان یورپی طاقتوں کے چنگل میں پھنسا۔''

''آپ کا ہندوستان بھی تو اِن کے قبضے میں تھا۔ وہ کب آزاد ہوا؟''

ہندوستان پر برطانیہ قابض تھا۔ 1947 میں اسے آزادی ملی تھی۔

دراصل جب مسلم ہندوستان دوسری بڑی معاشی قوت بن کر ابھرا تھا اس وقت چین بھی دنیا میں بڑا نمایاں تھا۔ مگر دونوں نے نئے عالمی رجحانات کو نہ سمجھا۔ ایک پر برطانیہ قابض ہوا اور دوسرے کو بھی اسی برطانیہ نے ہندوستان سے افیون کی سپلائی کر کے افیمی بنا دیا۔

1839 کا زمانہ تھا جب چین اور برطانیہ دونوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ علم سائنس اور ٹیکنالوجی جیت گئی۔ اور چین غلام بن گیا۔ ہانگ کانگ ان کے حوالے ہی نہیں کیا بلکہ ساتھ بھاری جرمانہ بھی ادا کیا۔ تاجروں کو چین میں بغیر کسی روک ٹوک کے داخلے کی اجازت مل گئی۔ یہاں بدقسمتی یہ بھی رہی کہ مغربی طاقتیں تو رہیں ایک طرف پڑوسی ہی نہیں مان تھے۔ جاپان نے بھی چڑھائی کر دی۔ فرانسیسی بھی بھاگتے آئے۔ جرمنی کیوں پیچھے رہتا؟ بے شمار جزائر ان عیار قوموں نے ہتھیا لیے۔ تو یہ گونگ چو بھی یورپی طاقتوں کا کینٹن Canton تھا۔ یہ جزیرہ اُن کے امیر ترین لوگوں کی رہائش گاہ بنی جسے آپ ابھی جنت کہہ رہی تھیں۔

میں مسکرائی تھی۔

کیسا ذہین آدمی تھا۔ منہ سے نکلی بات کو پلٹا کر میرے منہ پر مارا تھا۔

چین پر اس وقت ملکہ شی حکمران تھی۔ مغربی طاقتیں بھی مقابلے پر آ کھڑی ہوئیں۔ آٹھ کا اتحاد خیر سے جن میں برطانیہ، امریکہ، روس، فرانس، جرمنی، اٹلی، اسٹریا، ہنگری اور جاپان تھے۔ اور جو چند باقی رہ گئے تھے۔ وہ بھی چھوٹے موٹے فوجی دستے بھیج کر مال غنیمت کے حصّہ دار بن گئے۔ یہ ہالینڈ، بیلجیم اور اسپین تھے۔ اب نہ اتفاق

، نہ جدید اسلحہ۔شکست تو ہونی تھی۔ وہ ہوئی۔ مغربی فوجیوں کے لیے اب لوٹ مار کے راستے کھل گئے تھے۔شکست نے انہیں ظلم وستم جن میں خواتین کی بے حرمتی بھی شامل تھی کا بازار گرم کرنے کا پروانہ دے دیا تھا۔اور مشنریوں نے بھی کچھ لحاظ نہ کیا۔

چینی دارلحکومت تب یہ پیکنگ تھا کے امریکی سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری بارے کہا جاتا ہے کہ جب وہ 1901 میں امریکہ جانے لگا تو اس کا سامان ریل کے کئی ڈبوں میں بک کیا گیا تھا۔ یہ چینی آرٹ کا وہ سامان تھا جو اس نے امریکی فوجیوں سے اونے پونے خریدا تھا۔ ماشاءاللہ سے عظیم ملک کی عظیم فوج نے شاہی محلات اور امراء کے گھروں میں بہتیرا اودھم مچایا تھا۔چوروں کے تھان اور لاٹھیوں کے گز۔ یہ سب بیجنگ کے شاہی محلات اور اُمرا کے گھروں سے لوٹا گیا تھا۔

یہ وہ دن تھے جب چین کے مختلف علاقوں بمعہ پایہ ءتخت کے جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا راج تھا۔امریکی اور برطانوی فوجی مفتوحہ علاقوں سے لوٹ مار کا جو سامان اکٹھا کرتے اسی دن شام کو نیلامی کر دی جاتی۔ برطانوی سفارت خانے کے باہر ہر ہفتہ کھلے عام نیلامی ہوتی۔سفارت کاروں کی بیویاں بہت چاؤ سے اس کی خریداری کرتیں۔خریداری میں پیش پیش کون لوگ ہوتے؟ بڑے بڑے لوگ امریکی سفیر کلاوڈ میکونل اور ''لندن دی ٹائمز'' کا نامہ نگار جارج ارنسٹ مورسین تو بڑے نمایاں ہیں۔ یہ سامان آج بھی برطانیہ اور امریکی لارڈز کے گھروں اور عجائب خانوں میں موجود ہے۔

مشنریوں کی لوٹ مارا اور کرتوتوں بارے شہرہ آفاق مصنف مارک ٹوئن نے بڑے کھلے لفظوں میں To The Person Sitting in darkness میں لکھا اور انہیں خوب خوب رگیدا۔

ملکہ شی نے عوام کا نہیں اپنے اقتدار کا سوچا اور معاہدہ کرلیا۔تاوان جنگ دینا پڑا

اور 1940 تک یہ دیا جاتا رہا۔

واہ موجیں تھیں ان اتحادیوں کی سر کڑھی میں اور پاؤں کڑاھی میں ۔ بیجنگ سے شنگھائی تک فوجی اڈے بنانے کی اجازت بھی حاصل کرلی۔ دراصل چین تو مغربی طاقتوں کی نوآبادی بن گیا تھا۔

مگر وہ جو کہتے ہیں کہ لالچ ہوس اور مال سمیٹنے کی بنیاد پر جو کٹھ ہوتے ہیں پائیداری اُن میں نہیں ہوتی۔ اتحادی آپس میں ہی لڑنے لگے تھے۔ یہ بھی اوپر والے کی عنایت تھی کہ ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ اگر کہیں یہ اتحاد رہ جاتا تو پھر چین کے اسی طرح ٹکڑے ہونے تھے جیسے مشرقِ وسطیٰ کے ہوئے۔ یہ لڑ پڑے اور پہلی جنگ عظیم اِس کی کوکھ سے نکلی۔ پھر دوم نے برطانیہ کی سُپر چودھراہٹ کا سورج غروب کردیا۔ امریکہ کا طلوع ہوا۔ ساتھ سویت یونین بھی آ کھڑی ہوئی۔

ایک تو چینی عوام ملکہ شی سے ناکوں ناک نالاں اس پر طرّہ نئی نسل کو پختہ یقین کہ ڈاکٹر سن یت سین جیسے انقلابی رہنما کی تنظیم کومنتانگ کے ہاتھ مظبوط کرنے میں ہی چین کی نجات ہے۔ ایسا ہی ہوا۔ بادشاہت کا خاتمہ اور عوامی جمہوریہ چین کا نیا وجود ہوا۔ مگر جنرل یوان کی ہوس نے قومی اسمبلی اور آئین کے پرخچے اڑا کر اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ مگر ہوا یہ کہ دیگر جرنیلوں نے یوان کے اِس قدم کو پسند نہ کیا۔ بغاوتوں، مزاحمتوں، انتشار اور بدامنی کا سامنا ایک بار پھر بیچارے چینی عوام کر رہے تھے۔ وار لارڈز مختلف حصّوں پر قابض ہوگئے۔ ملک دو مکتبہ فکر کے نرغے میں آ گیا۔ سفید اور سرخ، قوم پرست اور کیمونسٹ۔ ڈاکٹر سن یات کی بیماری اور وفات نے موقع فراہم کردیا۔ چیانگ کائی شیک مقامی وار لارڈ اپنی طاقتور فوج کے ساتھ شمالی چین پر قابض ہوگیا۔

بیچارے چینی عوام جو کیمونسٹ راج چاہتے تھے۔ ماؤ اور چواین لائی جیسے لیڈر بھی

میدان میں اترے ہوئے تھے۔لانگ مارچ جیسی تاریخی سرگرمی اسی دور کی پیداوار ہے۔پڑوسیوں کی افراتفری اور بدامنی نے جاپانیوں کو بھی شہہ دی۔وہ بھی چین پر قابض ہونے آدوڑے۔1945 میں امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم گرا کراُن کے ولولوں کو توڑ دیااور ساتھ ہی چین کی بھی جان چھٹ گئی۔مگر چین میں ابھی بھی خانہ جنگی تھی۔1949 میں کیمونسٹ فوج نے جنرل کائی شیک کو شکست دی اور ماؤزے تنگ کی زیر قیادت عوامی جمہوریہ چین کی حکومت بنی۔

خیال تھا کہ اب لوگوں کو سکھ کا سانس ملے گا۔مگرنئی کیمونسٹ حکومت نے سوویت یونین کے طورطریقوں اور پالیسیوں کو اپنا کر بہت سارے تجربات کیے جن میں کچھ کامیاب اور بیشتر ناکام ہوئے۔ملک میں بھوک ننگ اور افلاس کا دوردورہ رہا۔حتیٰ کہ ماؤ کے مرنے کے بعد ڈنگ شیاؤ ینگ نے ملک کو صحیح راستے پر گامزن کیا۔چین نے باہر کی دنیا پر دروازے کھولے۔سائنس،ٹیکنالوجی،ہنر اور تحقیق کو اپنا کر اپنی معیشت کو طاقتور بنایا۔اور آج کی کیا بات۔وہ تو آپ کے سامنے ہے۔

☆☆☆

باب نمبر:۲۶ چینی تاریخ کی پہلی انقلابی، عظیم فیمنسٹ شاعرہ چھوے چن

- چھوے چن کو سمجھنے میں نسرین چاؤ یوآن نے بہت مدد دی۔
- شاہی طاقتوں کے سامنے اس نے کس جی داری سے سر کٹوایا۔
- وہ چین کی جون آف آرک ہے۔

اگر کہیں آنے سے قبل تھوڑا سا یہ جان لیتی کہ چینی شاعر خزاں سے زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں۔ان کے ہاں یہ صرف خوبصورتی اور اداسی کی نمائندہ نہیں بلکہ یہ چینی معاشرے کی بہت سی تہذیبی و تمدّنی پرتوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے تو یقیناً میں بہار کی بجائے خزاں میں یہاں آنے کو ترجیح دیتی۔

دن ابر آلود سا تھا۔بیجنگ کی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے نوخیز گلابی اور سفید شگوفوں نے متوجہ کیا۔مگر جانے کیوں اُس جیالی چینی فیمنسٹ تحریک کی بانی اور انقلابی شاعرہ چھوے چن کے المیہ اشعار ہونٹوں پر تھرکنے لگے تھے۔

خزاں کی ہوائیں
خزاں کی بارشیں
انسان کو احساس زیاں سے مار دیتی ہیں

عمران نے مجھے بیجنگ کی Foreign Languages University کے مین گیٹ پر اتار دیا تھا۔یہ میرا یہاں کا دوسرا چکر تھا۔ اردو ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ چاؤ یوآن Zhou Yuan جس کا دوسرا نام نسرین ہے سے چھوے بارے جاننے اور اس پر لکھی گئی کتابیں دیکھنے آئی تھی۔

تو نسرین اور میں اس کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے تھے۔اور چھوئے چن بھی ایک صدی پہلے وقت کی ٹنل سے نکل کر ہمارے سامنے آ بیٹھی تھی۔

نسرین نے پوچھا تھا۔ The Woman Knight of Mirror Lake کیسی لگی۔ چھوئے کی زندگی پر یہ فلم ہانگ کانگ نے 2011 میں بنائی تھی۔نسرین نے مجھے فون پر اسے دیکھنے کا کہا تھا۔اس کے استفسار پر میرا جواب تھا۔

''یہ حقیقت، فکشن، تھرل، ایکشن اور صدی قبل کی چینی تہذیبی زندگی کے ساتھ ساتھ ایک خاتون کی جرأت اور دلیری کی بہترین عکاس فلم ہے۔

آخر چین نے اسے اپنی جون آف آرک ایسے تو نہیں کہا تھا۔''

نسرین نے چھوئے کی کتاب زندگی کا سب سے پہلے وہ باب کھولا تھا جو بڑا دردناک، بڑا المناک اور بڑا حیرت انگیز بھی تھا۔

یہ اس کے آبائی گاؤں شے نی آن Shanyin کا پھانسی گھاٹ میدان تھا۔15 جولائی 1907 کا قدرے گرم دن۔دہشت وخوف کے سائے آنکھوں میں لیے چہروں پر رنج والم کے اثرات بکھیرے گراونڈ میں مقامی لوگوں کا ہجوم تھا۔اکتیس افراد پر مشتمل شاہی فوج کا دستہ تھا۔مقامی پولیس کے سپاہی تھے۔

سارا مجمع سوالیہ نشان بنا اُسے دیکھتا تھا۔کس شان سے کھڑی تھی وہ۔لگتا تھا بہت اہتمام سے تیار ہو کر مقتل گاہ آئی تھی۔سفید قمیض، سیاہ جیکٹ، پینٹ اور چمڑے کے جوتے۔

اس کی ٹانگوں کو آہنی کرسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ہاتھوں کو پشت پر کسا گیا۔

فرد جرم عائد ہوئی تھی۔اعتراضات کی ایک لام ڈور تھی۔اس نے مجمع کو دیکھا۔تفتیشی افسر کو دیکھا اور بولی۔

خزاں کی ہوائیں

خزاں کی بارشیں

انسان کو احساس زیاں سے مار دیتی ہیں

بس کچھ ایسے ہی لگا تھا کہ جیسے ایکا ایکی برق سی کوند جائے۔ اس کا سرتن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ اکتیس سالہ دل کش چھوئے چن مٹی کے فرش پر دو حصّوں میں کٹی پڑی تھی۔

نسرین کی اردو بہت رواں اور لہجے کا اتار چڑھاؤ کمال کا تھا۔ تھوڑی دیر ہم دونوں سوگواری کی سی کیفیت میں رہیں۔

اس کی تمنا تھی۔ اس کی شاعری میں اس خواہش کا اظہار تھا کہ اس کا نام تاریخ کی کتابوں میں درج ہو۔ دور دیسوں کے لوگ اس کے بارے جانیں۔ خواہش تو پوری ہوئی۔ دنیا کی کتابوں میں نام کی گونج چاروں کھونٹ گونجی۔ اب ایسے ہی تو مجھ جیسی ایک سیاح یہاں نہیں آئی تھی اس کے بارے جاننے اور اس پر لکھی ہوئی کتابیں دیکھنے اور پڑھنے کی خواہش اور کشش ہی تو گھسیٹ لائی تھی۔

نسرین کی آواز جذبات کی پھوار میں بھیگی ہوئی تھی۔

اس کے اندر ایک متحرک روح تھی۔ عورتوں کے مساوی حقوق کی علمبردار، اپنے وقت کی ایک بیدار مغز انقلابی شاعرہ، ناول نگار، مضمون نگار۔

جب مزاحمت اور بغاوت ناکام ہوگئی۔ اس نے شہید ہو جانا پسند کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ جان بچانے کے لیے روپوش ہوتی۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں موت کو جی داری سے گلے لگانے والی نے خود کو چین کی فیمنسٹ تحریک کی بانی اور انقلابی خاتون ہونے کا تاج اپنے سر پر سجا لیا تھا۔

پیدائش 8 نومبر 1875 میں ہوئی اور صرف اکتیس سال کی عمر میں 15 جولائی 1907 میں دنیا سے چلی بھی گئی۔

چین کے مشرقی صوبے جے جینگ Zhejiang کے ایک شہر 'شی آمن' میں اپنے بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کے ساتھ اپنے آباواجداد کے محل نما گھر میں پلی بڑھی۔ 'شی آمن' میں دادا باپ اعلی حکومتی عہدے دران تھے۔ یہ صوبہ عورتوں کی تعلیم کے لیے خاصی شہرت کا حامل تھا۔ ماں کا تعلق بھی بہت پڑھے لکھے اور امیر گھر سے تھا۔ ادب اور سیاست دونوں کا گھر میں چرچا رہتا تھا۔

اس کا بچپن ہر لحاظ سے شاندار آسائشوں سے بھرا ہوا تھا۔شاہانہ انداز اور رکھ رکھاؤ والا والد کا عالیشان گھر جو آباؤاجداد کی بھی امارت کا گواہ تھا۔

روایتی انداز میں ہی ابتدائی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ایک کھاتے پیتے امیر گھر کی بیٹی جس نے سکول میں پڑھا۔گھڑسواری کی اور شراب نوشی سے بھی شغل کیا۔اُس وقت کے چینی سماج میں یہ مشاغل صرف لڑکوں کے لیے ہی مخصوص تھے۔نو جوان چینی عورتوں کی طرح اس تکلیف کو بھی سہا کہ جب پاؤں کو سخت کپڑوں میں باندھنا پڑتا تھا کہ وہ چھوٹے رہیں۔

چھ سال کی عمر میں رواج کے مطابق اس کی ماں نے اس کے پیر کپڑے کی پٹیوں میں جکڑنے شروع کیئے تو وہ چلاّ اُٹھی۔قینچی سے انہیں کاٹنے لگی۔

ماں نے گُھرکا۔''ارے میری بچی مت کرو ایسا مجھے تمھارے پاؤں لوٹس جیسے بنانے ہیں۔گنواروں جیسے نہیں۔''

''نہیں ماں جھوٹ مت بولو اس نے غصّے سے کہا! ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ پاؤں کی ہڈیاں ٹیڑھی میڑھی ہو جائیں اور عورت بھاگ نہ سکے''۔

ماں تو دنگ رہ گئی۔اس تکلیف دہ عمل پر اسے اپنا واویلا مچانا ہمیشہ اچھا لگتا۔اس تشدد پر وہ ہمیشہ سراپا احتجاج رہی۔شاعری میں،تقریروں میں اور اپنے منشور میں بھی۔ ذرا شاعری میں ایک جھلک دیکھیئے۔

اپنے پیروں کو آزاد کرتے ہوئے
میں ہزاروں سالوں کا زہر صاف کرتی ہوں۔
جوش وجذبے سے بھرے دل سے
عورتوں کی روح بیدار کرتی ہوں۔

شاعری تو ابھی لڑکی ہی تھی جب شروع کردی تھی۔ لکھنے سے اُسے عشق تھا۔ شاعری اور مطالعے کی رسیا تھی۔ اپنی زندگی کے اِس حصّے میں اس نے پھولوں، موسموں، کی باتیں کیں۔ تاریخی جگہوں، جیالی عورتوں ان کے حوصلے، جرأت اور جذبوں پر مبنی کارناموں پر لکھا۔

لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ اس کی خواہشات کا ٹکراؤ چین کی اُن روایات سے ہوا تھا جو معاشرے میں بہت گہری تھیں۔ جو عورت کے گھر میں رہنے پر ایمان رکھتی تھیں۔ اور وہ عورت کو مرد کے شانہ بشانہ کھڑی ہونے اور کام کرتے دیکھنے کی متمنی تھی۔

شادی اکیس سال کی عمر میں ہوئی۔ اس وقت کے چینی رسم ورواج کے مطابق یہ لیٹ شادی کی عمر تھی۔ چھوئے چن کے والد نے جس لڑکے کو چُنا۔ وہ Hunan صوبے کے ایک امیر تاجر کا چھوٹا بیٹا وانگ ٹنگ چن Wang ting Chin تھا۔

اب یہ مقدر کی بات تھی کہ اس جیسی حسّاس، دلیر، شاعرانہ مزاج لڑکی کو جو ساتھی نصیب ہوا وہ اس کے خوابوں اور خواہشوں کے قطعی برعکس تھا۔ اُسے تو اپنے آپ اور اپنے مشاغل سے ہی فرصت نہ تھی کہ ذرا آنکھ کھول کر لٹر لگنے والی کو بھی دیکھتا۔ دو بچے بھی ہوگئے مگر وہ ذہنی رفاقت نہ پیدا ہوسکی جو ہونی چاہیے تھی۔ وہ اذیت کی جس بھٹی میں جلتی اس کا تحریری اظہار بھی کرتی۔ چھوئے اپنے شوہر سے دن بدن دور ہوتی جارہی تھی۔

اسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ وانگ Wang اُسے پرکاہ برابر اہمیت نہیں دیتا

تھا۔اس کا اعتماد، اس کی اپنی شاعری کو منوانے کی تڑپ اور جذبہ اس کے متعصّبانہ رویوں کا شکار ہو گئے تھے۔ سسرالی دباؤ اس کی صلاحیتوں کو کچلنے کے درپے تھا۔اس کا ایک ہی حل اس کو سمجھ آتا تھا کہ وہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصّہ پڑھنے لکھنے میں گزارے۔ اور وہ ایسا ہی کر رہی تھی۔

یہ چھنگ Qing بادشاہت کا زمانہ تھا۔ جب اس کے شوہر کا تبادلہ بیجنگ کے لیے ہو گیا۔1903 میں نوجوان جوڑا اپنے دو بچوں کے ساتھ بیجنگ شفٹ ہوا۔

شاہی دارالخلافہ میں آ کر اُسے محسوس ہوا کہ شہر کی زندگی زیادہ فعال ہے۔اس کی ہم خیال عورتوں سے دوستی اور خیالات کے تبادلوں نے اُسے مائل کیا کہ وہ سیاسی معاملات میں دلچسپی لے۔اس نے پاؤں کھولے۔ کثرت سے شراب نوشی کی ۔لباس کی تبدیلی اور تلواری کھیل میں حصّہ بھی لینا شروع کر دیا۔

کہیں ہواؤں میں، فضاؤں میں تبدیلی اور انقلاب کی خواہش رقصاں تھی جسے وہ غیر محسوس طریقے سے محسوس کرتی تھی اور سونگھتی تھی۔

یہ 1904 تھا جب اس نے اپنی زندگی کو سمیٹنے اور اُسے کسی بڑے مقصد کے لیے وقف کرنے کا ارادہ کیا۔اس ارادے میں شادی کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ بھی اس وقت حتمی طور پر ہو گیا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی تعطیلات گزارنے کسی دوسرے شہر کے قحبہ خانے جا رہا ہے۔

اس نے خود سے کہا، ''کتنا برداشت کیا ہے میں نے ان ناشائستہ رویوں کے مالک شخص کو جو ذوقِ لطیف سے عاری، پڑھنے سے فراری اور شعر و شاعری اور تحریر کی اہمیت سے انکاری ہے۔ یہ دن اسے اپنے خاندان کے ساتھ گزارنے چاہیں تھے مگر وہ طوائفوں کے ساتھ گزارنے چلا گیا ہے۔''

بس تو طے ہو گیا۔ زیورات بیچے، بچوں کو الوداع کہا، شوہر کو چھوڑا، جاپان کا ٹکٹ خریدا اور اجنبی سر زمین پر جا اتری۔ ٹوکیو میں اُس کا جاپان کا چینیوں کے لیئے بنائے گئے ادارے میں داخلہ ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی جاپان نے چین کی نسبت مغربی اثرات تیزی سے اپنانے شروع کر دیئے تھے۔ یہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے بہت سی خفیہ سوسائٹیز میں شمولیت کی جن کا مقصد موجودہ چینی حکومت کو ختم کر دینا تھا۔

وہ اپنی رائے اور خیالات میں بڑی واضح تھی کہ مرد عورت جب تک برابر نہیں سمجھے جائیں گے۔ تب تک قوم اور ملک ترقی نہیں کریں گے۔ اس نے مارشل آرٹس سیکھا اور مردانہ لباس پہننا شروع کیا۔ ہاتھ میں تلوار تھام کر خود کو Jin Xiong سمجھا جس کا مطلب یہی تھا۔ مردوں کے ساتھ مقابلہ۔

میرا جسم بے شک
مرد کی طاقت کے معیار کا نہیں ہو سکتا
لیکن میرا دماغ
مرد سے زیادہ طاقتور ہے
دوسرے لوگوں کے اثر و رسوخ سے کبھی متاثر مت ہو
سفلہ پن کس طرح میری شناخت کا باعث بن سکتا ہے
مایوسیوں میں ہیرو ہی تکالیف برداشت کرتے ہیں
اس وسیع و عریض سماج میں مجھے کہاں سے ایک سچا دوست مل سکتا ہے

یہاں جلد ہی وہ چینی کمیونٹی میں مقبول ہو گئی۔ چینی طلبہ کی لیڈر کا کردار بھی ادا کرنا شروع کر دیا۔ یہیں اپنی تعلیم اور قیام کے دوران اس کی شاعری نے لوگوں کی توجہ کھینچی۔ اس کی یہ طبع آزمائی Man Jiang Hong کے انداز میں ہوئی۔

Man Jiang Hong دراصل چینی غنائی شاعری کا ایک سیٹ اپ ہے۔ لوگ اس کی کھلی ڈھلی آزاد اور بے باک سوچ وفکر سے آگاہ ہوئے ۔وہ یہ بھی جانے کہ وہ عورتوں کی ذاتی اور سیاسی زندگی مردوں کے ہم پلہ چاہتی ہے۔

اس نے کہا۔

اگرچہ میں مرد پیدا نہیں ہوئی
مگر میری مرضی ان سے زیادہ طاقت ور ہے

ایک اور نمونہ دیکھیے۔

خزاں اپنے نشان چھوڑ رہی ہے
جہنم جیسی تنہائی نا قابل برداشت ہوگئی ہے
ان سالوں نے مجھے اپنے گھر کے لیے بے تاب کر دیا ہے
یہ تو ان کی (مردوں) ظالمانہ چال ہے کہ ہم عورتوں کو نسوانیت میں قید کریں
ہم جیت نہیں سکتیں
قابلیت ولیاقت کے باوجود
مرد ہی اعلی ترین عہدے سنبھالتے ہیں
لیکن ہمارے دل عہدے دار مردوں سے زیادہ خالص ہیں
میرا اندر اس زیادتی پر آگ کی طرح جلتا ہے
عیار مرد مجھے جاننے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں
دلیری اس نوع کے عوارض کو کب جانتی ہے
ایسے گلے سڑے معاشرے میں دوست ملنے کا
تصور بھی میرے آنسو لے آتا ہے

دسمبر 1905 کا ذکر ہے۔ وہ ابھی جاپان میں ہی تھی جب اس نے چینی لوگوں کے مجمع میں ایک شعلہ بار تقریر کی۔ اس نے زور دیا کہ یہی وہ وقت ہے کہ جب چینیوں کو اپنے مادرِ وطن لوٹ جانا چاہیے۔ اس تقریب میں لوشیون Lu Xun بھی تھی جو آنے والے وقتوں میں چین کی بہت بڑی لکھاری بنی۔

کہیں بعد میں اس تقریب کا احوال لکھتے ہوئے لوشیون Lu Xun نے لکھا تھا کہ اس نے اپنا چاقو اپنے سامنے رکھے میز پر گراتے ہوئے اپنی اس نظم کو بھی پڑھا جو ان ہی دنوں لکھی گئی تھی۔

چاند اور سورج میں روشنی نہیں
زمین تاریک ہے
ہماری عورتوں کی دنیا کی غرقابی بہت گہری ہے
اسے اوپر اٹھانے میں ہماری کون مدد کرے گا
سمندر پار کے اِس ٹرپ کے لیے زیورات بیچ دیئے
خاندان سے ناطہ ٹوٹ گیا ہے
مادرِ وطن سے جدا ہو گئی ہوں
ایک ہزار سال کے زہر کی صفائی کے لیے
میں نے اپنے پیروں کو آزاد کر دیا ہے
میں عورتوں میں بیداری کی روح جگاتی ہوں
سینکڑوں پھول کھل اٹھتے ہیں
افسوس یہ نازک سارومال
آدھا خون سے آلودہ ہے

اور آدھا آنسوؤں سے گیلا ہے

پھر وہ وقت آ گیا جب ان انقلابی خیالات نے عملی صورت اختیار کر لی تھی۔

جاپان میں پڑھنے والے چینی طلبہ متحرک ہو گئے تھے۔

یہ نظم انہی دنوں کی ہے۔

مجھے یہ مت کہو کہ عورتیں
ہیرو بننے کے قابل نہیں
میں نے تنہا مشرقی سمندر کا گھوڑے پر سفر کیا
میرے شاعرانہ خیالات کی وسعت اور پھیلاؤ مستقل ہے
جیسے جنت اور سمندر کے درمیان کوئی سفر کرتا ہو
میں نے تمہارے تین جزیروں کے بارے تصور کیا
سب پتھر جو چاند کی روشنی میں جگمگاتے ہیں
میں کانسی کے اونٹوں بارے سوچتے ہوئے فکر مند ہوں
چین کے محافظ کانٹوں میں اُلجھ گئے ہیں
شرمندہ ہوں کہ میں نے کچھ نہیں کیا
میرے نام پر تو ایک بھی فتح نہیں
میں تو صرف اپنے جنگی گھوڑے کو پسینہ پسینہ کرنا چاہتی ہوں
اپنی مادر وطن پر دکھ و غم کرتے ہوئے
جو میرے دل کو تکلیف دیتی ہے۔ پس مجھے بتاؤ
میں یہ دن کیسے یہاں گزار سکتی ہوں
ایک مہمان جو تمہاری بہار کی ہواؤں سے لطف اٹھائے

یہ 1906 کے دن تھے جب اُس نے 2000 طلبہ کے ساتھ نئے جوش و جذبے کے احساسات سے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ یہاں شنگھائی کی شوشی خوا Xu Zihua جیسی شاعرہ بھی آ شامل ہوئی تھی۔

اس کی سرگرمیوں کا مرکز اب چھنگ Qing سلطنت کے مخالف دھڑوں سے ملنا اور عورتوں میں شعور اور آگاہی بیدار کرنے کا م تھا۔

1907 میں اس نے پہلے فیمنسٹ میگزین کے اجرا میں ذرا سا بھی وقت ضائع نہیں کیا۔ یہ چین میں اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا۔اس کام میں اس کا بہترین معاون اس کا دست راست اس کا کزن شوشی لن Xu Xilin تھا۔مگر ابھی بس دو شمارے ہی نکلے تھے کہ اس پر پابندی لگ گئی۔

وہ اپنے اہداف، اپنے منشور بارے بڑی واضح تھی۔عورتوں کی تعلیم، انہیں برابری کی سطح پر لانا، معاشی آزادی، شادی کا حق اور پسند، چین کی 200 ملین عورتوں کو باعزت ان کے حقوق دینا اور لوہے کے جوتے پہنانے والی غیر معمولی قبیح رسم کا خاتمہ جیسی اصلاحات کا اعلان تھا۔اس کا کہنا تھا کہ مرد غالب معاشرے میں عورتوں کے بہتر مستقبل کے لیے ایک نئی ماڈرن گورنمنٹ Qing بادشاہت کی جگہ لینی ضروری ہے۔

مگر اس کی خواہش کے راستے میں بہت روڑے تھے کہ عورتیں پڑھی لکھی نہ تھیں اور اِس کی بات کو اس طرح نہیں سمجھتی تھیں جیسے وہ سمجھانا چاہتی تھی۔اب تقاریر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔وہ بہت اچھی مقررتھی۔بات کو دلیل سے کرتی تھی۔

اپنے اِس دائرہ کار کو مزید وسیع کرنے کے سلسلے میں اس نے ینگ شی yangtze ڈیلٹا کا چکر لگایا۔بے شمار انقلابی لوگوں سے ملی اور جانی کہ انقلاب کے لیے کن کن حربوں کی ضرورت ہے۔معلومات اور بم بنانے کا طریقہ سیکھا۔Yu Fei کی قبر پر

حاضری دی۔ Yu Fei بارھویں صدی کا وہ شہید تھا جو شمالی حملہ آوروں سے چین کا دفاع کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔

گرمیوں میں اس نے Datong اکیڈیمی کی پرنسپل شپ سنبھال لی جو کہ بظاہر ترقی پسندوں کا سکول تھا مگر دراصل انقلابی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔اس کا کزن شوشی لن Xu Xilin اس ادارے کا ڈائریکٹر تھا اور انقلابی سرگرمیوں کا بھی سرخیل تھا۔ چند دن پہلے اُسے حکومت نے گرفتار کیا تھا اور تحقیقات کے نتیجے میں پھانسی دے دی گئی تھی۔

اس کی اِس جدوجہد میں جن ناموں نے اس کی جی جان سے معاونت کی اِن میں اس کی دو دوستوں کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ شوشوخا و شے ینگ Xu Zihua اور Wu Zhiying تھیں۔ دونوں کے بارے کہا جاتا ہے کہ وہ قسم والی بہنیں تھیں۔ جیسے ہمارے ہاں ڈوپٹہ بدل، پگڑی بدل والی یاری دوستیاں بے حد گہری اور مشکل میں ساتھ نبا ہنے والی ہوتی ہیں۔ ایسی ہی یہ بھی تھیں۔ شوشی لن کی موت کے بعد دونوں نے اُسے خبردار کیا تھا کہ بھاگ جاؤ۔ ہٹ لسٹ پر آگئی ہو۔ مگر اس نے کسی کی نہیں سُنی۔

اب چھوئے بارے بھی حکومتی ارکان کو بہت ساری باتوں کا پتہ چل گیا تھا۔ شاہی عملے، سپاہیوں اور فوجی دستوں نے Shaoxing پر ہلا بول دیا تھا۔

یہ جولائی کے دن تھے۔ اپنے جرم کا اعتراف کرنے کی بجائے وہ ڈٹی رہی۔ اس نے ہر طرح کے الزامات ماننے سے انکار کر دیا۔ اور پھر وہ دن آ گیا۔

15 جولائی کا المناک دن جب اسے پھانسی میدان میں حاضر ہونا تھا۔ کِس جی داری سے وہ تیار ہوئی۔ اس نے سفید قمیض پہنی۔ سادہ سیاہ جیکٹ اور پینٹ اور چمڑے کے جوتے اور سوئے مقتل چلی۔

اس کے ہاتھوں کو پشت کی جانب باندھا گیا اور ٹانگوں کو آہنی کرسی کے ساتھ۔

اور پھر برق سی کوندی اوراس کا خوبصورت سرتن سے جدا ہو گیا۔

نسرین خاموش ہوگئی تھی۔ میں نے لمبی آہ بھری تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا جیسے کمرے میں حزن ویاس میں ڈوبی ایک آواز رقصاں ہے۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا

وہ شان سلامت رہتی ہے

اِس جان کی تو کوئی بات نہیں

یہ جان تو آنی جانی ہے

اور جب اس کا خوبصورت جسم اور سر کٹے پڑے تھے۔ دونوں حلفیہ بہنوں نے فوراً ویسٹ لیک میں دفنانے کا انتظام کرلیا کہ چھوئے کی یہی خواہش تھی کہ اُسے گذشتہ صدیوں کے ہیروز کے نزدیک دفنایا جائے۔

اس کام میں چھوئے کا بھائی بھی معاون رہا۔ لاش کو سمیٹنے اور اُسے دفنانے اور مقبرے کی حفاظت کرنے میں اس نے تیزی اور ہمت دونوں دکھائیں۔

مگر انتظامیہ قبر کو مسمار کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔

اس کے خیر خواہوں ،اس کے چاہنے والوں سب کو شکایت تھی کہ آخر اُسے کیا ضرورت تھی خود کو ان کے حوالے کرنے کی۔

اس پر بہت کچھ لکھا گیا۔اس کی زندگی کے ہر ہر پہلو پر لکھا گیا۔ اِس سلسلے میں مجھے ہاورڈ یونیورسٹی کے خوئے ینگ Huying کی تحریروں نے بہت متاثر کیا ہے۔ وہ Burning Autumn میں لکھتا ہے کہ چھوئے نے اپنی زندگی ایک عظیم مقصد کے لیے قربان کی۔ایک ایسے وقت میں جب گردوپیش کی دنیا بھی ظلم ، جبر واستحصال کے خلاف قربانیاں دے رہی تھی کہ ایک بہتر اور پرامن دنیا لوگوں کو دے سکیں۔

چھوئے کی اس نظم نے بھگو دیا ہے جو اس نے اپنے شوہر کے لیے لکھی تھی ۔ جو یہ بتاتی ہے کہ وہ صرف انقلابی فائر برانڈ ہی نہیں تھی بلکہ جذبات واحساسات رکھنے والی ایک انسان بھی تھی ۔ جس نے محبت اوراس کی تلخیوں اور شیرینیوں کو محسوس کیا ۔ اسوقت بھی جب وہ بڑے مقصد کے لیے کام کر رہی تھی اور اس پر یقین رکھتی تھی کہ وہ راستی پر ہے ۔ اپنے شوہر کے لیے لکھی ہوئی اس نظم ذرا پڑھیئے ۔

خزاں کس لیے اداس ہے
کوئی تحریک نہیں دے رہی ہے
میرے دل میں مچلتے جذبات کا ہجوم
غائب نہیں ہوسکتا
اس مخصوص صورت حال سے بچنا کتنا محال تھا
ہماری محبت ایک مستقل عذاب میں بدل گئی تھی
جس میں واپسی کے سوا کوئی راستہ نہ تھا ۔
میں تمہاری شکر گزار ہوں ۔
پلٹ کر اس دن کو دیکھنا بڑا دکھ بھرا ہے
جب ہم جدا ہوئے تھے
میرے اس گونگے دل سے ابھی تک
ازدواجی زندگی کی تلخیاں اور شیرینیاں نہیں نکل سکیں
اگر زندگی میں کہیں حقیقتاً افسوس ہے
اُسے ہوا اور بارش کی افسردہ آوازوں سے بچنا چاہیے

ہم دونوں بہت دیر تک عجیب سے یاس بھرے دکھ میں ڈوبی رہیں ۔ کیسی عجیب سی

بات تھی کہ دو مختلف خطوں کی عورتیں جو زبان، مذہب، کلچر اور تمدنی حوالوں سے مختلف تھیں ایک جیسے جذبات کی یلغار میں تھیں۔ پھر جیسے وہ چونک کر اپنی اِس کیفیت سے باہر آئی اور مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

تاہم یہ تو کہنا پڑے گا کہ ثقافتی انقلاب نے چینی عورت سے متعلق امپریلزم اور فیوڈلزم معاشروں کی سوچوں کے تابوتوں میں آخری کیلیں ٹھونک دی تھیں۔ دراصل خانگی و خارجی جنگوں، کیمونسٹ تحریکوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں چینی عورتوں میں بھی آگہی اور شعور بیدار کرنا شروع کر دیا تھا۔ وگرنہ تو چینی عورت کی صدیوں پرانی روایاتی تصویر نزاکت، چھوئی موئی اور بڑی فرمابردار قسم کے پیکر کی عکاس تھی۔ چینی سوسائٹی میں جو محاورہ سب سے زیادہ زبان زد عام تھا وہ یہی تھا کہ علم کے بغیر ہی ایک عورت قابل تعریف ہے۔ قانون قدرت کا ڈھکوسلا بھی ہماری قدیم روایت کا حصّہ تھا جس کے مطابق عورت کا مرد کے تابع رہنا ضروری تھا۔ اب ذرا سوچ دیکھو۔ شادی سے قبل بیٹی کی صورت باپ کی وفادار ہو، شادی کے بعد شوہر اور اس کے مرنے کے بعد بیٹے کی۔

اف خدایا میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ نری پاکستانی سوچ۔

بس اس سوچ سے نکالنے میں پہلا بڑا کردار سن یات سن Sun yat Sen جیسے انقلابی لیڈر کا تھا۔ پھر سلسلہ چل نکلا۔

Wu Shuging جیسی انقلابی خاتون، Qiu Jin جیسی شاعرہ اور فیمینسٹ Hua Mulan جیسی بے شمار عورتیں اٹھیں۔ جنہوں نے سر کٹوائے، جیلیں بھگتیں لیکن اپنے مقصد پر ڈٹی رہیں۔

چین نے اُسے اپنی جون آف آرک ایسے تو نہیں کہا۔

☆☆☆

باب نمبر:۲۷ پرانے بیجنگ کے گلی کوچوں کا حُسن

- بیجنگ کا قدیمی حصّہ ہر بار پیاز کی طرح نئی پرتیں کھولتا ہے۔
- چینی گلی کوچوں کے نام کمبخت مارے زبان پر چڑھنے کا نام نہ لیں۔
- ان چہکتی مہکتی گلیوں کا اپنا رنگ، اپنا حسن ہے۔

کچھ کھو گیا تھا۔ کیا؟ کہوں گی بہت کچھ۔ شاید وہ وقت، وہ حسن، وہ روایات جو بہت قدیم شہروں کے اندر اس کے قدیمی حصّے کا ہار سنگار ہوا کرتی تھیں۔ اس کی خوبصورتی تھی۔ اس کا حسن تھی۔ جدت اور ماڈرن ازم کے ہتھوڑے اگر بے رحمی سے چل پڑیں اور کچھ بڑوں کو انھیں مٹانے کا جنون سوار ہو جائے تو پھر شہر کا بیش قیمت سرمایہ داؤ پر لگ جاتا ہے۔

میرے لاہور کے ساتھ ایسا ہی تو ہوا تھا۔ اور اس وقت جب میں بیجنگ کے تھین آن من سکوائر سے ملتے ہوئے اس Dongxijiaomin کے لمبے ترین ہوٹانگز میں داخل ہوئی ہوں۔ تو وہ سارے منظر جو کتابوں میں کہیں محفوظ تھے۔ اور جو میں نے ڈاکٹر تھنگ کی جانب سے ملنے والی کتابوں سے پڑھے تھے۔ اچھلتے کودتے سامنے آ گئے ہیں۔ ان سے بہت سے ملتے جلتے دیس میں بھی تھے۔ کچھ ابھی زندہ ہیں اور کچھ کتابوں میں زندہ تھے۔ بہت سارے کھو گئے ہیں۔ اس وقت یہ سب میرے ساتھ چل رہے تھے۔

''یہ کمبخت ماری تاریخ کب جان چھوڑتی ہے؟ اسے تو عادت ہے اپنی خودنمائی کی۔ خواہ مخواہ ہی بیچ میں اپنی پردانی جتانے لگ پڑتی ہے۔''

میں اب ہوشیار ہوگئی ہوں۔ کہہ لیجیئے بیٹی کو قائل اور مطمین کرنے کے حربوں

میں۔تنگ شیاؤ کے ساتھ اور سہارے نے آسانیاں تو بہت پیدا کر دی تھیں۔تھوڑا سا خوف جو اس بڑھاپے کی دین ہے ایسے مواقع پر پھدک کر باہر آجاتا ہے۔ڈھیٹ ہڈی اُسے کب خاطر میں لاتی ہے۔

بیجنگ کا یہ قدیمی حصّہ اتنی پرتوں میں گندھا ہوا ہے کہ ہر بار لچھے دار پراٹھے کی طرح اِس کی کوئی نہ کوئی پرت سامنے آکر حیرت زدہ کر جاتی ہے۔گذشتہ راتوں اور پھر دن میں یہاں آنے کے باوجود اس وقت منظروں کا ایک نہ رکنے والا بہاؤ مجھے اپنے ساتھ ساتھ یوں بہائے لیے جا رہا تھا کہ اس میں نئے رنگوں کی اتنی بہتات تھی کہ مجھے لگتا تھا جیسے میں یہ سب پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔قبل مسیح سے ہی شہر تو حفاظتی دیواروں میں قید ہوتے تھے۔ہاں ہر عہد کی، ہر خطّے کی پرانی دنیا کا یہی کلچر تھا۔تاہم اب ماڈرن دنیا اسے اِس پرانے جامے سے آزاد کر دینے کی خواہش مند ہوتی ہے۔تو یہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا۔سکینڈ رنگ روڈ بن رہی تھی۔ بیچ میں یہ پھڈا ڈالے بیٹھی تھی۔بس ایک ٹوٹا یادگار کے طور پر رہنے دیا گیا ہے۔باقی کا صفایا ہو گیا۔

ایسا ہی کچھ بیجنگ کے عام شہریوں کے گھروں جنہیں ہوٹانگز Hotongs کہا جاتا ہے کے ساتھ ہوا کہ 2008 کے اولمپکس میں بہت سے علاقے اِس کی بھینٹ چڑھ گئے۔شہر ممنوعہ اور تھین آن من سکوائر شہر کی مرکزی جگہیں کل بھی تھیں اور آج بھی ہیں بادشاہوں کے محلات کے آس پاس ہی درباریوں کی شاہوں سے ذرا کم تر درجے کی محل باڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ درباری امراء اور وزرا جو آج کی ماڈرن زبان میں ارسٹو کریٹک کلاس یعنی اشرافیہ کہلاتی ہے۔جن کے گھر وسعت اور تعمیر کے اعتبار سے اب کلاسیک میں شمار ہوتے ہیں۔جنہیں ان کے پرانے منہ متھوں کے ساتھ ان کے اندر خانے ماڈرن اور جدّت کے رنگوں سے سجا کر بڑے بڑے ہوٹلوں اور کاروباری مراکز میں بدل دیئے گئے

ہیں۔قدرے فاصلے پر کاریگروں، دست کاروں کے گھر تھے۔ جو سادہ اور چھوٹے تھے۔ یہی ہوٹانگز ہیں۔

قدیم بیجنگ کا حسن صرف اس کے دروازوں کا ہی مرہون نہیں اس کے ساتھ کتنے اور عناصر شامل ہیں۔گو چلتے ہوئے اب میں نے تاریخ کو آواز دی تھی۔'' کچھ بتاؤ مجھے۔''

'' ارے بھئی تم مرکزی جگہ پر کھڑی ہو۔ قدیم ترین حصے کی پہلی شاخ Shichahaiاور بیل ڈرم ٹاور جسے تم دیکھتی آرہی ہو ہے اور دوسری Qianmen اور Dashilar سٹریٹ ہے۔'' تو سب سے پہلے قدیم گلی میں داخل ہوتے ہیں بھئی نام کتنا مشکل تھا۔ایک تو چینی گلی کوچوں کے نام بھی ان کے اپنے ناموں کی طرح مشکل ترین ہیں۔کمبخت مارے زبان پر چڑھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔نخرے دکھاتے ہیں۔لو ذرا آپ بھی دیکھ لیں NanLuoguxiang Gang and druan Yandaixie ،Jinyu Street،Guozijian Street،Lane Streetیقین آ گیا نہ آپ کو۔پھر وہاں تمبا کو پوچ سٹریٹ تھی اور بھی ایسے ہی مشکل ترین نام والیاں بہتیری تھیں۔

میں نے کہا۔'' بھئی سلامت رہو۔پھلو پھولو۔ بیجنگ کے وجود کا گہنا ہو۔''

اب جب سائیکل رکشاؤں کی سہولت میسر ہو تو مجھے کیا کتے نے کاٹا تھا کہ میں غریب ٹانگوں کا بھرتہ بناتی۔ڈرائیور نے کمال مہارت سے اوپر چڑھا لیا۔''ہائے'' دل سے ہوک نکلی تھی۔کوئی یاد آیا تھا۔بھلا کون؟ میرا پور بو پاکستان۔اس سواری کے وہاں ڈھاکہ میں جی بھر کر مزے ضرور لوٹے تھے۔تاہم ایک خلش بھی تنگ کرتی تھی کہ یہ بیسویں صدی ہے جہاں انسان کو انسان کھینچ رہا تھا۔ دل اکثر مضطرب ہوتا۔اُن کی ابھری ہوئی ہڈیاں پسلیاں بنیان میں سے جھانکتے ہوئے مجھے اپنے مجرم ہونے کا خوفناک احساس دلاتیں۔

مگر یہاں ایسے کسی دکھ بھرے احساس کا رتی برابر شائبہ تک نہ تھا۔ اُچک کر مزے سے بیٹھی تھی اور بے حد مسرور انداز سے اپنے اردگرد دیکھا تھا۔ نوجوان صحت مند لڑکا جس سے میں نے کہا تھا کہ مجھے اس نے ہر ہر گلی کی سیر کروانی ہے۔ شکر ہے انگریزی سمجھتا بھی تھا اور کچھ کچھ بولنے کا بھی گزارہ تھا۔ میری مسرور آنکھوں نے آسمان کو دیکھا۔ نکھرا ہوا آسمان جس کی چھتر چھاؤں میں لپٹی دھرتی کا یہ ٹکڑا جو سنہری دھوپ میں ہنس رہا تھا۔

واہ میرے مولا واہ میرے سائیں تیری دنیا کے رنگ کیا ہی حسین و جمیل ہیں؟ گلیاں تھیں کہیں کھلی کھلی، کہیں تنگ اور کہیں تنگی کا وہ عالم کہ پکار کر کہتی ہوں۔ راہ فرار نہیں۔ بس آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے۔ منہ متھوں کا ذکر کیا کہ کہیں تو بس جیسے سیمنٹ گھلے پانیوں کے رنگ کے عکاس ہوں۔ کہیں سرخ، کہیں پیلے سے مار دھاڑ کرتے ہوں۔ چوبی دروازے کہیں چمکتے دمکتے، کہیں مفلوک الحال، کہیں سبزے کی بہار، کہیں چھدرے چھدرے درختوں کی بہتات۔ کہیں ہریالی پھولوں بیلوں کی رونقیں، کہیں خشک سالی کے منظر، کہیں بچے کھیلتے، کہیں بڑوں کے جتھے باتیں کرتے اور میز کے گرد بیٹھے شطرنج ٹائپ کسی کھیل سے شغل کرتے۔

کہیں ہنستے مسکراتے دانت نکالتے ملکی و غیر ملکی مرد وزن۔ کہیں پیدل چلتے اور کہیں میرے طرح کے گھوڑوں پر چڑھے۔ کتے بلیاں بھی انہی گلیوں میں بھاگتے پھر رہے تھے۔ رکشہ سواری آتی تو رک کر منہ اٹھا کر اُسے دیکھتے جیسے کہتے ہوں۔ جم جم آؤ جی صدقے آؤ۔ دور دیسوں سے ہمیں دیکھنے ملنے آئے ہو۔ کہیں آرٹ کے شاہکار نظر آتے۔ یہیں ہوٹل بھی بنے ہوئے ہیں۔ یہیں قہوہ خانے بھی ہیں۔ ڈرائیور بتا بھی رہا تھا۔ رک رک کر دکھا بھی رہا تھا۔ مجھے تحریک ہو رہی تھی رکوں کچھ کھاؤں پیوں اور اپنی ہر نوالے بسم اللہ کہنے والے چھچھورے اور لالچی سے رانجھے کو راضی کروں۔ مگر کیا کھاؤں گی؟ سوال کھڑا پوچھتا تھا۔

چلو بے ضرر سی کافی کا کپ تو ہوگا ہی۔

اب ٹو بیکو پوچ سٹریٹ اور اس کے ہوٹونگز دیکھنا کونسا کم خوبصورت تجربہ تھا۔ بیجنگ کے قدیم ترین ہوٹانگز یہی تو ہیں۔ وہیں Dashibei کے بغل میں۔ اس کی دکانیں دیکھنا، ان میں جانا اور رنگا رنگ چیزوں سے دل کو خوش کرنا۔ کس قدر دلچسپ شغل تھا۔ برونز کے پائپ اتنے خوبصورت اور اتنی اقسام کے تھے کہ میں دوکان کے چھوٹے سے تھڑے پر بیٹھ کر سوچتی رہی کہ اگر میں اس کا ایک آدھ دانہ خریدوں تو میرے ملنے والوں میں سے کونسا ایسا سموکر ہے جو اِس تحفے کا صحیح معنوں میں مستحق ہوگا۔ اتنے خوبصورت سبز Jade کے ٹکڑے تھے کہ پتھروں، موتیوں اور جیولری سے ساری زندگی کوئی دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود بھی میری اُن پر سے نظریں ہٹتی نہ تھیں۔

ہاں البتہ چینی دستکاری کی بے شمار چیزیں تھیں۔ تبّت کی سوغاتیں۔ اندرون منگولیا کی چیزیں سستی بھی اور مہنگی بھی۔ جنہیں دیکھ دیکھ کر بندے کا دل ہی نہیں بھرتا تھا۔ یہاں ہندوستانی کپڑا بھی مل رہا تھا۔ کاش بریزے یا گل احمد کی بھی کوئی چیز نظر آتی۔ تب میرا من کیسے ناچتا؟ کھانے پینے کی دکانیں اور ریسٹورنٹ بھی تھے۔ بیٹھنے کے انتظامات بھی بہترین۔ بس مسئلہ تو چیزوں کا تھا۔ کونسی ہیں، کونسی کھانی چاہیے۔ ہائے کاش دہی بھلے، سموسے چاٹ کی ریڑھیاں ہوتیں۔ کھوکھے ہوتے۔ کہیں خوبصورت لڑکیوں کی تیز رفتاریوں کو گھورتے، کہیں یہ دیکھتے کہ پورا یورپی کلچر پروان چڑھا ہوا ہے۔ بس چوما چاٹی کے منظر نہیں تھے۔ باقی بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومنے پھرنے والے منظروں کی بہتیری بہتات تھی۔

اور یہی وہ گلیاں ہیں جو جتنی قدیم ہیں اُتنی ہی اُن کی تاریخ طویل اور لُطف و دلچسپی سے بھری ہوئی ہے۔ بیجنگ میں پہلی بار تو گلیاں یوآن Yuan کے شاہی دور میں ظاہر

ہوئیں۔1206 سے 1368 کے درمیان۔ یہاں اس ڈرامہ کا ذکر کرنا عین مناسب ہوگا جسے میں نے عمران کی فرمائش پر دیکھا تھا۔Scholar Zhang Boits the Sea ڈرامے میں ملازمہ کہتی ہے۔''تم نے مجھے اگر تلاش کرنا ہے تو زونتر نام کی گلی میں آجانا۔'' میں وہیں رہتی ہوں مل جاوں گی تمہیں۔تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اوراس سے ملحقہ گلیاں یوآن دور میں موجود تھیں۔ پہلا منظر تو وہی تھا کہ مرکزی دروازے سے اونٹوں کے کاروان آنکھوں کے سامنے آموجود ہوئے۔اب رک گئی ہوں۔تصور کی دُنیا کی ساری فضا اُن کی سریلی گھنٹیوں سے جیسے نغمہ بارسی تھی۔ملحقہ بغلی گلیوں کے سلسلے جو کہیں آگے جا کر بند ہوتے اور کہیں آگے بڑھتے نئے دروازے اور نئے منظر کھولتے تھے۔انہیں بھی چلتے چلتے رُک کر دیکھتی چلی جاتی تھی۔

تحریریں یاد آرہی ہیں جو اِن دنوں پرانے بیجنگ بارے پڑھ رہی ہوں۔ یہ گلیاں پھیری والوں کی صداؤں سے بھری پری،اُن کے ٹھیلے ریڑھے اُن پر سجی اشیا جیلی ٹوفواور سیر شدہ سویا بین دودھ کے مختلف النوع اسنکیس سے لدی پھندی ہوتیں۔باسیوں کے کانوں میں ان آوازوں کا گُھسنا گویا ان کے چہروں کو گل رنگ سا بنا دیتا تھا۔بے اختیار ہی وہ گلی میں نکل پڑتے۔اِن چہکتی مہکتی گلیوں میں گھروں کے اندر کشادہ صحن اور احاطے جن میں زندگی کا ایک اپنا ہی رنگ ہوتا تھا۔یہیں کہیں بازار کے کسی گوشے میں مسخروں نے اپنی دنیا آباد کررکھی ہوتی تھی۔جگت بازی اور حاضر جوابی کے مقابلے،لوگوں کے دل کھول کر ہنسنے اور قہقہے لگانے کے انداز بھی کتنے عوامی سے ہوتے۔ بیجنگ کے انہی بازاروں میں میوزیکل کہانی کی روایت کا بھی کیا حسین سلسلہ تھا۔ڈرم بجتا۔ایک تار والے موسیقی کے آلات بجائے جاتے۔

یہ سب کتنی خوبصورت تصویریں تھیں۔زندگی کی ضرورت اور جذبوں سے بھرپور

جنہیں اگر جوڑ دیا جائے تو تصویری شاہکار بن جائے۔ بصری صورت میں دیکھا جائے اور صوتی صورت میں سنا جائے تو ایک ایسے نغمے کی صورت فضا میں بکھر جائے کہ جس کے ہر سر میں سے تڑپتا اور پھڑکتا ماضی نکلے۔ وہ ماضی جو وقت کی دھول میں کہیں کھو گیا ہے۔ تو اب میں یہاں اس گھر کے دروازے پر کھڑی سوچ رہی ہوں ان گلیوں کی دنیا کا حسن، ان میں رچا بسا اپنایت کا رنگ اور ماحول بھی کیا چیز تھا۔ ان کے نام بھی کیسے کیسے شاعرانہ تھے کہ بے اختیار ہی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ کہنا بھی لازم ہو جاتا ہے۔ کہ لوگ کتنے تخلیقی ذہن کے مالک تھے؟ ذرا سُنیے اور سر دھُنیے۔ خوبانی کے پھولوں کا دن، پھول کی ٹہنی اور چاندرات۔ کچھ نام ایسے بھی سننے کو ملے۔ جو روزمرہ زندگی کے عکاس تھے۔ مثلاً دیکھیے۔ چائے کی پتی والی گلی، ایلکوحل ایلی، ایگ پلانٹ ایلی وغیرہ وغیرہ۔ اس کا ایک اور دلچسپ ترین پہلو یہ بھی ہے کہ بزرگوں کی یادداشتوں کے مطابق مختلف گلیوں کی وجہ شہرت ان کی مختلف اور مخصوص خوشبو اور مہک تھی۔ مثلاً اناج والی گلی، بند گوبھی کی خوشبو والی گلی مشہور تھیں۔ Sedan chair ایلی میں خمیر اُٹھے سویا بین دودھ کی خوشبو کی مہکار رچی ہوئی ہوتی تھی۔ یار لوگ مرتے تھے۔ ''پروردگار ان کی مہکار کیسے کیسے تڑپاتی تھی۔

مجھے بہت کچھ یاد آیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ گلیوں کی یہ صفت کوئی بیجنگ میں نرالی نہیں۔ دنیا کا ہر قدیم ترین شہر اسی احساس کا امین ہے۔ کیا لاہور، کیا روم، کیا ایتھنز اور کیا بغداد، کیا دمشق سبھی ایسے ہی لطیف اور خوبصورت جذبوں سے مالا مال تھے۔ شام کے عظیم شاعر نے تو پرانے دمشق کی گلیوں کو جس انداز میں سراہا ہے اس کی تو مثال نہیں۔

دمشق کے گھر تعمیر کے کسی آسمانی صحیفے سے کم نہیں
ہمارے گھروں کے ڈیزائن
ہماری جذباتی وابستگیوں کی بنیادوں پر ہیں

ہر گھر دوسرے سے جڑا ہوا
ہر بالکونی دوسری کی طرف بڑھتی ہوئی
دمشق کے گھر پیار ومحبت کے مظہر ہیں
وہ ہر صبح ایک دوسرے کو خوش آمدید کہتے ہیں
اور راتوں کو راز داری سے ملاقاتیں کرتے ہیں

ان گلیوں کے ایک اور من موہنے سے منظر کی جھلک دیکھو۔خوانچہ فروشوں کی صداؤں کا حسن اور رومانیت ہے۔میرے لیئے یہ منظر بھی بڑا اپنا اپنا سا تھا۔کس طرح یہ لوگ کہیں اپنی آواز کا جادو جگاتے ،کہیں مزاحیہ رنگ میں لمبے لمبے جملے بولتے ،کہیں وہ کسی آلے،کبھی کسی موسیقی کے آلات پر فروخت کرنے والے مال پر کہیں شاعرانہ مصرعے،آواز کے اونچے اور پست لہجے،کہیں دور سے آتی آوازیں اور کہیں نزدیک سے صحنوں برآمدوں میں بیٹھے لوگوں اور بچوں کو متوجہ کرتیں۔یہ صدائیں ایک موثر متوازن اور دیرپا تاثر کی حامل تھیں۔ اوقات مختلف ہوتے۔ چیزیں مختلف ہوتیں۔صبحیں ڈیپ فرائیڈ ڈواسٹکس dough sticks اور تل کے بیجوں سے سجے کیک کے لیے ہوتیں۔شام میں پھلوں کے لیئے صدائیں لگتیں اور رات کو نوڈلز، بھاپ میں دم شدہ بند اور wonton سوپ کے لیے سُر والی اور بے سری آوازوں کی بارش سی ہوتی۔Wonton سوپ بارے تسنیم نے مجھے بتایا تھا۔خالص چینی سوپ چکن یا پورک کے بڑے بڑے ٹکڑوں میں مختلف سبزیاں ڈال کر بنایا جانے والا جسے ادرک لہسن اور سبزیوں کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔وہ گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے آوازیں لگانے کی بجائے ڈرم یا ڈھول کو ہاتھ یا چھڑی سے بجاتے یہ گویا اعلان ہوتا کہ سوپ والا آ گیا ہے۔ہائے ایسے ہی منظر میرے لاہور کے تھے۔میرے بچپن کے تھے۔

☆☆☆

باب نمبر:۲۸ ماؤ پر ایک حیرت انگیز کتاب

- آج کا چین ایک لمبے اور تکلیف دہ سفر سے گزر رہا ہے۔
- گریٹ لیپ فارورڈ ماؤ کے تخیلات پر مبنی نہایت بودا اور سطحی درجے کا پروجیکٹ تھا۔
- جنسی لحاظ سے ماؤ مریضانہ شخصیت کا مالک تھا۔

بالعموم گھر رشتے داروں کے ہوں یا گہری دوستوں کے۔ میرے لیئے صرف چند گھنٹے ہی وہاں گزارنے راحت ومسرت کا باعث ہوتے ہیں۔ زیادہ دیر رُکنا عذاب بن جاتا ہے۔ اگر مجھے کچھ حاصل وصول ہونے کی توقع نہ ہو۔ اور یہ حاصل وصول ہے کیا؟ کسی صاحبِ علم شخصیت کی قربت کہ اس سے علم میں اضافے اور ذہن کے روشن ہونے کا امکان ہو یا پھر کسی موضوع پر لکھنے کے لیئے مواد درکار ہو اور اس کے پانے کے بھی آثار ہوں۔ بیجنگ کے ڈی آر سی (ڈپلومیٹک ریذیڈنسی کمپاونڈ) میں تسنیم کا گھر میرے لیئے اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اور میرا دل وہاں فرحت اور آسودگی محسوس کرنے لگا تھا کچھ ویسی ہی جو مجھے اپنے گھر میں محسوس ہوتی تھی۔ گھرانہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ دو بچے اور میاں بیوی۔ سب کے سب محبت اور اپنایت میں گندھے ہوئے۔

تکلفات والے سارے لازمے میں نے اُٹھا کر طاقچے پر رکھ دیئے تھے۔ شام میں جب ڈاکٹر ارشد قیولہ لینے کے بعد فریش ہوجاتا۔ میرا اکثر اُوپر جانا لازمی ہوتا۔ وہ تو چائنہ پر پورا انسائیکلو پیڈیا تھا۔ علم، ادب، تاریخ اور معاشی ترقی کے اُن سب مشکل مرحلوں سے آگاہ جو اس ملک کی قیادت کو پیش آئے۔ جنہیں انہوں نے اور قوم نے جھیلا۔ وہ اُن

خوابوں سے بھی آگاہ تھا جو قیادت نے اپنی قوم کو دکھائے اور جن کی تعبیروں کے لیئے انہوں نے قربانیاں دیں اور جن کے شریں ثمرات سے اب چینی قوم مستفیذ ہو رہی ہے۔

ظاہر ہے جب جب ہماری نشست جمتی۔کبھی کبھی بات پاکستان سے بھی شروع ہوجاتی۔اس دن بھی ایسے ہی ہوا۔میں تو ویسے ہی ہر وقت تتے توے پر بیٹھی رہتی تھی۔ پھٹ پڑی تھی۔کرپشن کرپشن سُنتے سُنتے کان پک گئے ہیں۔نیا پاکستان بنانے والوں نے تو لگتا ہے کوئی اور سبق پڑھا ہی نہیں۔بس اسی کا ڈھنڈورا پیٹے جاتے ہیں۔

''ارشد تمہیں یاد ہوگا چند ماہ پہلے ہمارے وزیر اعظم کا دورۂ چین بھی اسی تذکرے کے گرد گھوما اور اس کا چرچا بھی خوب رہا۔یہاں اُن کی کرپشن کے خلاف کی گئی حسرت آمیز تقریر بھی ہائی لائٹ ہوئی۔قطع نظر اس کے کہ وہ تقریر صیحح تھی یا غلط۔برسر موقع تھی یا نہیں۔ اہم چیز یہ ہے کہ کیا واقعی حقیقت میں ایسا ہی ہے جیسا کہ وزیر اعظم نے فرمایا تھا''ارشد کے لیئے میری اس طرح کی دل سوز قسم کی جذباتی باتیں سُننا معمول کا چلن تھیں۔میرے اس سوال پر اس نے آہستگی سے کہا۔ہے۔

There is more to it than meets the eye. کے مصداق دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کیا چین کی تمام تر ترقی صرف کرپشن کے خلاف جنگ کی مرہون منت ہے یا اس کے کچھ اور بھی پہلو ہیں۔ہم آج کے چین کو دیکھ کر آہیں بھرتے اور اُن کی ترقی پہ رشک کرتے ہیں مگر چین 1949ء سے لے کر آج تک ایک لمبے اور نہایت تکلیف دہ سفر سے گزرا ہے۔انگریزی محاورہ وہ اُٹھا۔لاؤنج میں کتابوں کے شیلف سے ایک کتاب نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا''پہلے اسے پڑھیں۔پھر بات کریں گے۔''

یہ ماؤزے تنگ کے ذاتی معالج ڈاکٹر Li Zhisui کی کتاب The Private life of Chairman mao تھی۔دو دن اُسے پڑھتی

رہی۔ سچی بات ہے میرے تو چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر لی Li کو ماؤ کے ذاتی معالج کی حیثیت سے قریباً 26 سال اقتدار اور اقتدار کی غلام گردشوں میں ہونے والے تمام معمولات کو بے حد قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ 1976ء میں ماؤ کی وفات کے بعد کچھ عرصہ سزا کے طور پر اُن کو مشقتی کیمپ میں بھی کام کرنا پڑا۔ یہاں سے اُن کی جان تب چھوٹی جب ڈینگ یاؤ پنگ کی اقتدار پر مکمل گرفت ہوگئی۔ ڈاکٹر Li کو نشے کی حد تک روزنامچہ لکھنے کی عادت تھی۔ انھوں نے ان تمام ماہ و سال کے بارے جو انھوں نے ماؤ کے معالج کی حیثیت سے گزارے اس روزنامچے میں محفوظ کیے۔ بعد میں ڈاکٹر لی لگ بھگ 1988ء میں امریکہ منتقل ہو گئے۔ جہاں اُنھوں نے اپنی یاداشتوں کو ایک کتاب کی صورت میں شائع کرایا۔ ''ڈاکٹر صاحب، مجھے لگتا ہے کہ اگر ہمارے محترم وزیر اعظم اِس کتاب سے کچھ راہنمائی لے لیتے تو شاید ان کی تقریر مختلف ہوتی۔''

ڈاکٹر ارشد کھلکھلا کر ہنسے۔

''ہمارے حکمرانوں کو کتاب سے کوئی دلچسپی ہو تو پڑھیں گے۔ آکسفورڈ کے پڑھے لکھے وزیر اعظم کا جنرل نالج حد درجہ قابل رحم ہے۔ ایسی ایسی بونگیاں چھوڑتا ہے کہ افسوس ہوتا ہے۔ ویسے یہ صورت کچھ ہمارے حکمرانوں کے ساتھ ہی نہیں امریکہ جیسے ملک کے حکمران بھی کبھی کبھی ایسی ہی احمقانہ یا وہ گوئیوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔'' میں بھی اول درجے کی احمق اور جذباتی عورت ہوں۔ کتاب نے ماؤ کے اُس تراشیدہ بت کو جو میرے تصور نے زمانوں سے گھڑ رکھا تھا میں دڑاریں ڈال دی تھیں۔ مضطرب ہو گئی تھی۔ سچی بات ہے مجھ سے وہ سب حماقتیں ہضم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ جو ماؤ سے سرزد ہوئیں۔ ایک بار پڑھنے کے بعد اُسے دوبارہ پڑھا تھا۔ اور اب بیٹھی ڈاکٹر ارشد سے تبادلہ خیال کر رہی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چیئر مین ماؤ ایک نہایت کرشماتی اور سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی قیادت میں چینی کیمونسٹ پارٹی نے چیانگ کائی شیک کی حکومت کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی۔ جس کے نتیجے میں 1949ء کو چین میں کیمونسٹ حکومت قائم ہوئی۔ ماؤ نے کیمونسٹ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے چیئر مین کا عہدہ سنبھال لیا۔ 1949ء سے 1976ء میں ماؤ کی وفات تک اُنھوں نے چین اور کیمونسٹ پارٹی پر اپنے اقتدار کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی اور نہ ہی کسی ایک کو آگے آنے کا موقع دیا۔

''یہ سب باتیں اپنی جگہ اہم مگر میں کیا کروں۔''

میری جذباتیت پر انہوں نے رسان سے کہا۔'' انسان خواہ عام ہو یا عظیم ہو۔ خوبیوں خامیوں کا مرقع ہے۔ بس تناسب کا فرق ہوتا ہے۔ اب چواین لائی اور ماؤ کا تقابلی جائزہ لیں تو شخصی اور انتظامی خوبیوں میں اس کا پلڑا بھاری ہے۔ تاہم ماؤ کے کارنامے اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ دراصل ماؤ بنیادی طور پر دیہی چین کے خوش حال کسان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ گھر والے انہیں حساب کتاب میں مکمل دسترس والے مضامین میں طاق کرنا اور اپنے فارم ہاؤس پر کام کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر لڑکا تو مارکسزم اور لینن ازم کا پرستار بن چکا تھا۔ اُسے تو لونگ مارچ جیسا عظیم اور تاریخ میں مثال بن جانے والی جدوجہد کی سربراہی کرنا تھی۔ چینی کیمونسٹ پارٹی کی قیادت کا بوجھ اٹھا کر اِس آزاد ہونے والے ملک کی باگ ڈور سنبھالنی تھی۔ اور اس نے ایسا کیا۔

کیمونسٹ Ideology اور Intellectual Capacity کے لحاظ سے وہ کافی مضبوط تھے۔ لیکن مکمل اقتدار کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے لگ جاتا ہے۔ تنقید کو گوارا نہیں کرتا۔ یہی صورت ماؤ کے ساتھ ہوئی۔ صورتحال مزید ابتر ہو جاتی ہے جب آپ تمام تر اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کر لیتے ہیں۔ چونکہ ماؤ اب بلا

شرکت غیرے چین کے مطلق العنان حکمران تھے۔ اُن کو بھی اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔سال 1957ء روس میں کیمونسٹ کانفرس کے اختتام پہ ماؤ نے اعلان کیا کہ وہ Great Leap Foward کے نام سے ایک مہم کا آغاز کررہے ہیں۔اس کے نتیجے میں چین میں سٹیل کی پیداوار 15 سال کے عرصے میں برطانیہ کے مقابلے پر دوگنی اور زرعی پیداوار چوگنی ہوجائے گی۔ یہ ایک نہایت بودی اور سطحی درجہ کی سکیم تھی جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ تمام تر ماؤ کے تخیلات پر مبنی تھی۔اور بس یہاں میری جذباتیت نے مجھے سان پر چڑھا دیا تھا۔آخر اس کے اتنے دانا ساتھی چواین لائی،Zhou Enlai جیسے کتنے ہی تھے۔کوئی اتنا جی دار اور جیالا نہ تھا جو اعتراض کرتا کہ ایسا مت کرو۔ یہ تباہی کی طرف جانے والا راستہ ہے۔

ارشد نے گہری مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور کہا۔

’’مخالفت تو ہوئی۔سمجھدار لوگوں نے کھلم کھلا کہا۔ احتجاج اور ردّعمل کی ایک صورت مزاحمتی شاعری کی صورت میں بھی سامنے آئی۔ چونکہ اقتدار پر گرفت بہت سخت تھی۔ دماغ میں خناس بھی بھر گیا تھا۔تو ان تمام لوگوں جنہوں نے اس بودی اور بے ہنگم مہم کی مخالفت کی اُنہیں غدّار کہنے میں پل نہیں لگا۔اُن پہ کرپشن کے الزامات لگائے گئے ۔اُن کو بیرونی طاقتوں کا ایجنٹ ٹھہرایا گیا۔اُن سب کو اذیت ناک قید کی سزائیں دی گئیں۔

اس تمام مشق کا مقصد یہ تھا کہ ماؤ اپنے مخالفین کو اپنے سامنے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ ان کو دوسروں کے سامنے عبرت کی مثال بنانا چاہتے تھے۔ اِس میں وہ کامیاب ہوئے۔ میں سُن رہی تھی مگر وہ لمحے بھی میرے سامنے تھے۔ جب میں یہ سب پڑھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے کتاب میں نے بند کردی اور خود سے کہا تھا بس ایسے ہی اور یہ سب تماشے میرے ملک میں بھی ہوتے رہے ہیں اور ابھی بھی ہو رہے ہیں۔ میرے ملک کے بھی

کرشماتی شخصیت کے مالک لیڈر نے یہی کیا تھا۔ راتوں رات اپنے ایک حکم سے تیزی سے صنعتی ترقی کی طرف گامزن ملک کو قومیانے کی پالیسی پر چڑھا کر اس کی صنعتوں کا بیڑہ غرق کر دیا۔ ملک ساٹھ کی دہائی میں عروج کے جو پوڈے چڑھا تھا وہ آنے والی دہائیوں میں سب اُتر کر نیچے زمین پر آ گیا۔

جب تمام مخالفین کا بندوبست ہو گیا تو بڑی دھوم دھام سے گریٹ لیپ فارورڈ کا آغاز ہوا۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پورے چین میں دیسی بھٹیاں لگائی گئیں اور کیمونسٹ پارٹی کے عہدے داران نے عام چینیوں کے روزمرہ استعمال کے برتن اور اُن کے گھر میں موجود لکڑی کی ہر شے اُن بھٹیوں میں جلا کر راکھ کروادی۔ اب ان عام دیسی بھٹیوں میں اعلیٰ درجے کی سٹیل تو کیا بنی تھی اُلٹا عام چینیوں کے گھروں میں برتن بھی نہ رہے۔ زرعی اصلاحات کا بھی حال کچھ ایسا ہی ہوا۔ جب سارے چین کو سٹیل پیدا کرنے پہ لگا دیا تو اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسان کھیتوں سے فصل تک نہ سمیٹ سکے۔ اور ساری کی ساری فصلیں ضائع ہو گئیں۔

1961ء تک چین شدید قحط کا شکار ہو گیا۔ اس تمام تر عرصہ میں چیئرمین ماؤ کو سب اچھا ہے کا ڈرامہ بھرپور طریقے سے دکھایا گیا۔ اِس میں بدترین کردار لین پیاؤ اور جیانگ چھینگ کا تھا۔ جنہوں نے ماؤ کو خدا اور دیوتا کا روپ دے کر اپنے مقاصد پورے کیے۔ پارکنسن کی بیماری بھی ساتھ چمٹی ہوئی تھی جس نے خوشامدیوں پر اعتماد بڑھا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک کو اپنی جان عزیز تھی۔ جب صورتحال اس قدر سنگین ہو گئی کہ بیجنگ کے شہریوں نے بھوک کی وجہ سے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا تو ماؤ کو احساس ہوا کہ کہ اُن کی بے سوچی سمجھی اور بیہودہ مہم نے ایک عام چینی پہ کیا ظلم ڈھایا۔ تب اُنھوں نے خود باہر نکل کے مخالف صوبوں کے دورے کیے تو اندازہ ہو گیا کہ کس وسیع پیمانے پر تباہی ہوئی ہے۔ ہونا تو

یہ چاہیے تھا کہ چیئر مین اپنی غلطی تسلیم کرتے اور اہل لوگوں کو آگے لاتے تا کہ حالات کچھ بہتر ہوتے۔مگر یہ اقتدار اور اس کا نشہ ایسی ظالم چیز ہے کہ انسان ہر حد پار کر جاتا ہے۔اب ماؤ کے اشارے پہ ایک اور مہم شروع کی گئی۔ بے خبر چینی عوام کو ایک نئی گولی یہ دی گئی کہ سکیم تو بہت اعلی تھی اور چیئر مین کی نیت بھی لیکن کمیونسٹ پارٹی کے عہدیداروں کی کرپشن کی وجہ سے یہ ناکام ہوگئی۔ یہ تمام کرپٹ عہدیداران اِس ناکامی کے ذمہ دار ہیں۔ایک دفعہ پھر سے وہی ڈرامہ دہرایا گیا۔فرق صرف یہ تھا کہ تب سکیم کے مخالفوں کی سرکوبی کی گئی۔اب یہ تلوار اُن پہ چلی جنھوں نے اِس سکیم کی کامیابی کے لیے انتھک محنت کی۔اب اگر بیج ہی خراب ہے تو فصل نہ ہونے پر بے چارے کسان کا کیا دوش؟

اِس دفعہ اِس مہم کو ماؤ کی بیگم چیانگ چھانگ Jiang Qing نے لیڈ کیا اور پارٹی عہدیداروں کی بلی چڑھانے کے لیے طلباء کو استعمال کیا گیا۔ثقافتی انقلاب(Cultural Revolution) کے نام پہ طلباء نے وہ تباہی مچائی کہ خدا کی پناہ۔کس بے دردی سے 50,50 سال کی عمر کے لوگوں کو کل کے لونڈوں نے سڑکوں پہ گھسیٹا۔انہیں مارا پیٹا۔ان کی تذلیل کی۔ یہ ایک الگ المناک داستان ہے۔اور نعرہ کیا تھا؟ کرپشن کے خلاف جنگ۔ کیمونسٹ پارٹی کے عہدیدار کرپٹ تھے۔اُن کو سزا دینا لازم۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا وہی ڈھاک کے تین پات۔ جب اہل افراد کو کھڈے لائن لگا دیا جائے اور کرپشن کی تلوار ہر ایک کے سر پر ٹانگ دی جائے تو کسی نے کام خاک کرنا ہے۔مختصراً یہ کہ چین کے حالات دگرگوں تھے۔ جب تک اقتدار چیرمین ماؤ کے اختیار میں رہا یہ ایسے ہی رہے۔پھر جب چیرمین کا 1976ء میں انتقال ہوگیا۔ایک نئی قیادت کو اُبھرنے کا موقع ملا تو چین کا صحیح سمت میں سفر شروع ہوا۔

ازدواجی زندگی میں چار بیویاں تو ریکارڈ پر ہیں۔دو تو مر گئیں۔ایک کو طلاق دے

دی۔چوتھی جو فلم اور آرٹ سے متعلق تھی۔ 1976 تک چلی ۔امور مملکت میں چار کے ٹولے کا ایک اہم رکن تھی ۔ یہ چار کا ٹولہ کون لوگ تھے؟ کیمونسٹ پارٹی کے بڑے اور سرکردہ لوگ چھانگ چھون چھیاؤ Zhang Chunqiao، وانگ ہونگ ون Wang Hongwen، یاؤون یوآن Yao Wenyuan اور چوتھی ماؤ کی بیوی لیڈنگ لیڈی۔ ثقافتی انقلاب کی سرگرمیوں میں بھی چیانگ چھانگ Jiang Qing کی مرکزی حیثیت تھی۔ چاروں خبیث، شیطانی خصلتوں کے مالک، اقتدار عہدوں کے بھوکے انسانوں اور انسانیت کے قاتل ہی سمجھے جاتے تھے۔

ان کے علاوہ بے شمار کیا لاتعداد عورتیں اور لڑکیاں جو ایک عظیم انقلابی لیڈر کے طور پر اُس کی پوجا کرتی تھیں۔ اُسے اوتار کا درجہ دیتی تھیں۔ اس کی ہوس کا شکار ہوئیں۔ کہہ لیجیے جنسی لحاظ سے شخصیت مریضانہ تھی۔ جنسی خواہش کا ہر وقت اسیر رہتا تھا۔ لڑکے بھی استعمال میں تھے۔ یہ دور بھی چینی تاریخ کا بھیانک دور تھا۔ ذاتی زندگی بارے بھی بہت باتیں تھیں۔ بدنی صفائی میں بڑی چور شخصیت تھی۔ نہانے سے چڑتا۔ لباس تبدیل کرنے اور دانتوں کی صفائی کے سلسلے میں لاپرواہی بہت تھی۔ شخصیت میں تضادات تھے۔ جوتے اور کپڑوں میں پیوند لگتے مگر جوتے انتہائی قیمتی ہوتے۔ گو پرانے جوتوں میں آرام محسوس ہوتا اور نئے تنگ کرتے۔ حتیٰ کہ ملازم یا ساتھی انہیں پہن کر کھلا نہ کر دیتے۔ کپڑوں کی رفو گری میں بھی جو کپڑا استعمال کیا جاتا وہ شنگھائی سے اعلیٰ اور بہترین ٹکڑوں کی صورت میں آتا۔ ایک ایسے وقت میں جب چین میں رہائش بہت بڑا مسئلہ تھا کہ بڑے بڑے خاندان ایک کمرے میں رہنے پر مجبور تھے۔ ماؤ کی رہائش سپر کلاس ہوتی۔ لائف سٹائل، بود و باش اور کھانا پینا سب بہت امیرانہ تھے۔ ارشد سے میں نے اس کی ذات کے اِن دونوں پہلوؤں کا موزانہ لینن کی ذات سے کرتے ہوئے کہا۔ لینن اس کا لیڈر تھا۔ ساری زندگی

کرپسکایا جیسی بیوی کے ساتھ گزانے والا جو اس کی رگ رگ سے واقف اور حد درجہ مزاج آشنا تھی۔ لینن نے بڑے بڑے خواب دیکھے تھے مگر اس کی ذہنی سوچ، کام کا طریق کار اور اس کی ادائیگی سبھی سائنسی انداز کے تابع تھے۔ روس میں قحط سالی کے دنوں میں جب کارکنوں کو کھانا راشن پر ملتا تھا۔ ملک بھر سے لینن کو گوشت، پھلوں، سبزیوں اور بیکری کی اشیاء تحائف کی صورت آتی تھیں جنہیں وہ ہمیشہ فوراً اسپتالوں اور بچوں کے اسکولوں میں بجھوا دیتا۔

ایک دن اس کی بہن ماریا ایلینچنا Ilyinichna نے کہا۔

''ولوڈایا تم کچھ اپنے لیے بھی رکھ لیا کرو۔ تم بھوک سے کمزور ہوتے جا رہے ہو۔ انقلاب کی کامیابی کو تمہاری صحت کی ضرورت ہے۔'' ''میں کچھ نہیں کھا سکتا۔ مجھے علم ہے کہ میرے کارکن اور میرے لوگ اور بچے بھوکے ہیں۔'' ''بہتر ہوگا کہ آپ چواین لائی سے اس کا مقابلہ کریں۔'' ڈاکٹر ارشد بولے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں اپنی پوری قوم کو یہ کتاب پڑھواؤں اور اُن کو بتاؤں کہ ملکوں کی سیاسیات، اقتصادیات اور معیشت کے مسائل اتنے سادہ نہیں ہوتے جتنے ہمارے لیڈر ہم کو بتاتے ہیں۔ بجائے ہر وقت کرپشن کی ڈگڈگی بجانے کے اور اپنی تمام تر ناکامی کا ملبہ میڈیا یا اِدھر اُدھر ڈالنے کے اگر ہماری حکومت مسائل کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی کوشش کرے۔ پھر اُن کے حل کے لیے اہل افراد کو ذمہ داریاں سونپے۔ اُن کو کام کرنے کی آزادی دے۔ تب تو ہمارے حالات سدھرنے کی کوئی اُمید ہوسکتی ہے۔ وگرنہ اُلٹے سیدھے راگ آلاپنے سے نہ تو کبھی مسائل حل ہوئے ہیں اور نہ کبھی ہونگے۔ بھلے ہی آپ
500 لوگوں کو چھوڑ پانچ لاکھ لوگوں کو پھانسی لگا دیجیے۔

☆☆☆

باب نمبر:۲۹ آنا چی سے ملاقات

- ماضی کا چینی معاشرہ جاہل عورت کو آئیڈیل خیال کرتا تھا۔
- مردوں میں ماضی والی مروت ولحاظ اب مفقود ہو گیا ہے۔
- خانگی، خارجی جنگوں، کیمونسٹ تحریکوں نے عورتوں میں شعور وآگہی پیدا کی۔
- ثقافتی انقلاب چینی تاریخ کا المناک باب ہے۔

میں دبے پاؤں نکل آئی تھی۔ سعدیہ گروسری کے لیے گئی ہوئی تھی۔ بچے اسکول اور نسرین کچن میں۔ سچی بات ہے میں RQC کے اِس سنسان سے علاقے کے واحد سٹور کی خاتون سے باتیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ انگریزی میں بڑی رواں تھی اور خوش مزاج بھی تھی۔ مجھے تو وہ چالیس کی بھی نہیں لگتی تھی پر جب اس نے پچاس پچپن کے اردگرد کا بتایا تو ہنستے ہوئے میں نے اپنی زبان میں کہا۔

''ہیں یہ تو ورے کھانی (یعنی سال کھانی)'' ہے۔ بہن بھائی بھی کوئی دس گیارہ تھے۔

''باپ رے باپ۔ اتنے ڈھیر سارے بچے یہ کیسے ہو گئے؟ ایک بچہ ایک خاندان بیچارے چینی بچے تو بہن بھائی کو ترستے ہیں۔''

یہ پابندیوں سے پہلے کی بات ہے اور ہاں میرے تو اپنے پانچ ہیں۔''

خاتون مجھے بہت دلچسپ نظر آئی تھی۔ آج موقع غنیمت تھا چلو کچھ گپ شپ تو رہے گی۔

مگر جب میں خراماں خراماں اس کے سٹور میں داخل ہوئی۔ نٹز کا پیکٹ خریدا اور سٹول پر بیٹھتے ہوئے اُسے کہا۔

''اناچی Annchi مجھے کچھ احوال سناؤ۔''

''ڈیئر مگر یہ تو میرا ڈیوٹی ٹائم ہے اور میں تم سے گپ شپ نہیں کر سکتی۔''

اس کے احساس ذمہ داری نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ میں نے تھوڑا سا مدافعانہ انداز اپنانا ضروری سمجھا۔

''اناچی میں کب تمہاری ذمہ داری میں رکاوٹ بنوں گی؟ دیکھو نا اس وقت ایک بھی گاہک نہیں۔ مجھ سے باتیں کرو۔ جب کوئی آئے تو اُسے اٹینڈ کر لینا۔''

''نہیں۔ رات کو نو بجے میرے آف ہونے کے بعد کا وقت ٹھیک رہے گا۔ جب گاہک نہیں ہوتے تو چیزوں کی سیٹنگ، ریکوں کی صفائی، حساب کتاب دیکھنا ایسے بہت سے کام میری ذمہ داری ہیں۔''

''اُف قومیں ایسے ہی نہیں بنتی ہیں۔ چالیس سال میں دنیا کی سپر پاور بننے والی قوم سیڑھی کے آخری پوڈے پر کھڑی بس اسی انتظار میں کہ کب اس نے یہ آخری پوڈا بھی چھلانگ مار کر چڑھ جانا ہے۔

سارا دن بس انہی سوچوں میں گزرا۔ ہمارے اوپر یہ عنایت کیوں نہ ہوئی۔ ہم پٹڑی پر چڑھے تو تھے تو پھر اُتار کیوں دیئے گئے؟ ایسے ہی دُکھ بھرے سوال ایسے ہی دُکھ بھرے جواب مضطرب کرتے ملک کے پستی میں گرتے احوال اور ایسے ہی شکوے کہ آخر اچھے لیڈر دینے میں ہمارے لیئے کنجوسی کیوں؟

نو بجے میں دوبارہ اناچی کے پاس تھی۔ اور ہم باتیں کر رہے تھے۔ میں اس کی انگریزی پر حیران تھی۔ پتہ چلا تھا کہ اس نے کچھ وقت لندن اپنے بھائی کے پاس گزارا تھا۔

''تبھی'' اندر بولا تھا۔

تم نے بتایا تھا تم لکھاری ہو۔ کہانیاں لکھتی ہو۔ چی نے میری آنکھوں میں جھانکا تھا۔

ہماری ساری زندگی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر قدم پر ایک نئی کہانی۔ پہلی کہانی تو یہی غربت کی ہے۔ سوچ بھی نہیں سکو گی کہ ہم لوگ کتنے غریب تھے؟ میرے خیال میں ہم کہنا کچھ موزوں نہ ہوگا۔ چینیوں کی اکثریت اس غربت کا شکار تھی۔ جہاں گھر کے مردوں اور لڑکوں کے تن پر صرف نیوی بلو رنگا ماؤ سوٹ ہی مقدر ہوگیا ہو۔ میری پیدائش 1958 کی ہے۔ ہوش سنبھالنے اور بالغ ہونے تک بس یہی ایک منظر تھا۔

بیگم اختر ریاض الدین کا ماسکو کا سفر نامہ یاد آیا تھا۔ 1960 کا زمانہ وہ شاپنگ کے لیے بازار گئیں۔ ان کے پاؤں میں پہنی خوبصورت سینڈل دیکھ کر عام روسی عورتوں کی آنکھوں میں حسرت جیسے جذبات اُچھلے کودے۔ اور ہونٹوں سے اس کا اظہار بھی کھل کر ہوا۔ درمیانی عمر کی ایک عورت نے پر امید لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ بس اگلے پانچ سالہ منصوبے میں ہمیں بھی ایسے جوتے نصیب ہوں گے۔''

''انا چی یہ رنگا رنگ ملبوسات کی بہاریں کب زندگی میں شامل ہوئیں؟''

''ارے ڈارلنگ اتنی جلدی تم مجھے یہاں تک لانا چاہتی ہو۔ نہیں بھئی۔ دکھوں کی پوری پوٹلی بنی پڑی ہے۔ کبھی کبھی تو کھلتی ہے۔ اب کھلی ہے تو دیکھو تو سہی کہ بیچ میں سے نکلتا کیا کیا ہے؟ ایک غربت اس پر ڈھیر سارے بچے۔ ہم نو بھائی بہن تھے۔ دادا دادی بھی زندہ تھے۔ گویا تیرہ افراد تو پکے پکے۔ پھر کبھی پھوپھیاں، کبھی چچا لوگ بھی آ دھمکتے۔ مگر اس وقت کے ماحول میں خاندانی افراد کے درمیان محبت تھی۔ نوالے بانٹ کر کھانے کی ریت تھی۔

ساٹھ کی دہائی کا زمانہ معاشی مشکلات سے بھرا ہوا دور تھا۔ ماہانہ مقررہ مقدار میں اناج ملتا تھا۔ ہماری اماں دلیے میں شکرقندی ڈالتی تھیں۔ اوپر سے ابّا کے رشتہ دار بھی آجاتے تھے۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ انہیں کھانا کھلائے بغیر جانے دیا جاتا۔ اکثر رات کو مکئی کھا کر پیٹ بھر لیا جاتا۔ میرے والد گھر کے ہر کام میں والدہ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ کھانے پینے کے معاملہ سے لے کر لانڈری تک میں۔

''یہ ہوئی نا بات۔ میرے دل نے کہا تھا۔ جب رفاقت میں احساس اور خیال کی شرینی گھل جائے تب پہاڑ بھی کاٹنے پڑیں تو عورت گھبراتی نہیں۔''

مجھے یاد ہے ہماری بہن کی شادی جس طرح ہوئی۔ وہ بھی ہمیں زمانوں یاد رہی تب ہم لوگ ہیبی Hebi ضلع کے چھوٹے سے قصبے میں رہتے تھے۔ میری بہن سکول ٹیچر تھی۔ اس کے ساتھی کو وہ اچھی لگنے لگی۔ شادی کے لیے اس نے جب پروپوز کیا تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ تو بہت غریب ہے۔ ہم سب مارکسٹ تھے۔ ماؤ سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتے تھے۔ لینن سے محبت کرتے تھے۔ مارکسزم لٹریچر پڑھتے تھے۔ چین کی ترقی کے خواب دیکھتے تھے۔ میری بہن نے کہا تو کیا ہوا۔ غریب تو ہم سب ہیں۔ یوں میری بہن کی شادی گھر میں بنے کیک، مونگ پھلی اور سورج مکھی کے بھنے ہوئے بیجوں اور چائے کے ساتھ ہوئی۔ ہم لوگوں نے اس دن تیل کے چراغ جلا کر گھر روشن کیا اور اپنی بہن کی خوشیوں میں شریک ہوئے۔

The Analects of confucius عظیم چینی فلاسفر کی کتاب بچپن میں ہم سب بہن بھائیوں نے پڑھی۔ ہمارے گھر میں اسے مذہبی کتاب کا درجہ حاصل تھا۔ اخلاقیات پر توجہ اور اسے تربیت کا بنیادی جز سمجھا جاتا تھا۔ بچے زیادہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ انہیں پیدا کر کے گلیوں، بازاروں میں رلنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ سحرخیزی

ہماری ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی۔ دادا دادی کو گھر میں احترام دینا اوران کا خیال رکھنا بہت اہم تھا۔ مجھے یاد ہے میری دادی شور بہت مچاتی تھیں۔ ذرا سی بات پر اُن کا چلانا شروع ہوجاتا۔اس کے باوجود ہماری امّاں انہیں کبھی نہ ٹوکتیں۔ یہ اور بات ہے کہ xunzi جو کہ ایک طرح مکمل کتاب خیال کی جاتی ہے ہمیشہ ان کے سرہانے رہتی تھی۔

ہماری زندگیوں میں ان کہانیوں کی بھی بہت اہمیت ہے جو ہم اپنے ابا اور اماں سے سنا کرتے تھے۔ ایسے وہ سب دن جب سرخ فوج کو گومنگ دانگ پارٹی کے مقابلے پر پسپائی اختیار کرنی پڑتی۔ ابّا کے آنسو اور اماں کے دلاسے۔ اور پھر جس دن سُرخ فوج کامیاب ہوتی۔ ابّا گھر میں اِس خوشی کو مناتے۔ یہ بے شک شکر قندی کے قتلوں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہوتی۔

ڈنگ چھیاؤ پھنگ Deng-Xiao Ping کے دور میں جب اوپن ڈور پالیسی کا آغاز ہوا۔ تبدیلی کی ہوائیں چلنی شروع ہوگئی تھیں۔ ظاہر ہے اقتصادی ترقی کے پہیے زیادہ متحرک ہوئے غیر ملکیوں کی آمد شروع ہوئی۔ ایک خوش رنگ زندگی کے خواب تو نوجوان نسل دیکھ رہی تھی۔ روزمرہ کی زندگی میں دھیرے دھیرے رنگ گھلنے لگے تھے۔

آج آپ کہاں کھڑی ہیں؟ کیا نئے جوڑوں میں محبت اور تعاون کی وہی فضا محسوس کرتی ہیں جو آپ کے وقتوں میں تھی۔"

یقیناً نہیں۔ آج کی عورت زیادہ طاقتور ہے۔ خود کو منوا چکی ہے۔ مشکل کام سے گھبراتی نہیں۔ تاہم مردوں میں بھی وہ لحاظ اور مروت مفقود ہوگئی ہے۔ جو ہم اپنے بچپن میں دیکھا کرتے تھے۔ بس میں عورت کو سیٹ دینا۔ ڈیوٹی پر بھاری کاموں میں اس کی مدد کرنا۔

کاموں میں اپنے مرد تو ایک طرف دوسرے بھی مدد کردیا کرتے تھے۔ مگر آج کے مردوں کا کہنا ہے کہ عورت جب اس نوع کے بہت سے مساوی حقوق مانگی ہے تو پھر مدد

اور رعایت کس بات کی؟ بھگتو اب۔ ہاں مرد گھروں میں ہاتھ بٹا دیتا ہے۔ مگر طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے۔ نو جوان نسل ذمہ داریوں سے گھبراتی بھی ہے۔

بچہ شہری زندگی میں تو ایک ہی ہے۔ دو کی اب اجازت ملی ہے۔ اور اگر کوئی تین یا چار کرنا چاہتا ہے تو اُسے شہر کو چھوڑنا پڑے گا۔ دیہی علاقوں میں ہی تین بچے ممکن ہیں۔ ہاں اب حساب کتاب نے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ بڈھے بہت زیادہ ہیں۔ ان کے مرنے کھپنے کے بعد درمیانے لوگ ان کی جگہ لیں گے تو اگلی نسل کی کمی خلا پیدا کر دے گی۔ اور یہ صورت سنگین ہوگی۔ آئندہ ایک دو سال میں تین چار کی اجازت کے ساتھ سہولتوں کی پیشکش ہوگی دیکھ لینا۔ مگر نو جوان نسل اب ذمہ داریوں سے گھبرانے لگی ہے۔ اکثر نو جوان تو شادی سے بھاگنے لگے ہیں۔ کون ذمہ داریوں کے جھنجٹ میں پڑے۔

اب میں تمہارے اس سوال پر آتی ہوں جو تم نے آغاز میں مجھ سے کیا تھا۔ کپڑوں کے بارے۔

''ارے بس ہم لوگ تو وہی Cheongsams یعنی وہ لمبا گون سا پہنتے تھے۔ کبھی اس کی اوپر کھلی سی سکرٹ نما کرتی اور نیچے لمبا سا ذرا کھلا سا پاجامہ ٹائپ ہوتا۔ دو ٹانگوں والا نہیں ایک ٹانگ والا۔ ہاں البتہ میرے بھائیوں نے ماؤ جیسے ڈیزائن کے سوٹ پہننے شروع کر دیئے تھے۔

ثقافتی انقلاب چینی تاریخ کا بہت المناک باب ہے۔ یہ میرے خاندان کے لیے بہت مصائب لے کر آیا۔ میرے شوہر پر بغاوت اور غداری کے الزام لگے۔ یہ کیسا دور تھا۔ کسی نے اپنی کسی پرانی دشمنی پر یہ جھوٹا الزام لگا دیا۔ اب نہ کوئی تحقیق، نہ کوئی جانچ پڑتال۔ بس اُسے پکڑا اور تھانے کچہریوں میں رول دیا۔

ہمارے ایک پرانے دشمن کی جھوٹی رپوٹ پر کس ظالمانہ انداز میں میرے شوہر کو

عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔ پارٹی کا وفادار رکن ہوتے ہوئے بھی اس پر گھٹیا الزام لگے۔ جیل میں پھینک دیا۔

بڑا کرب پھیل گیا تھا اس کے چہرے پر۔ جب وہ کہیں ماضی کی تلخیوں میں گم تھی۔

پھر جیسے وہ چونک کر اپنی اس کیفیت سے باہر آئی اور مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

تاہم یہ تو کہنا پڑے گا کہ ثقافتی انقلاب نے چینی عورت سے متعلق اپیریلزم اور فیوڈلزم معاشروں کی سوچوں کے تابوتوں میں آخری کیلیں ٹھونک دی تھیں۔ دراصل خانگی اور خارجی جنگوں، کیمونسٹ تحریکوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں چینی عورتوں میں بھی آگہی اور شعور بیدار کرنا شروع کر دیا تھا وگرنہ تو چینی عورت کی صدیوں پرانی روایاتی تصویر نزاکت، چھوٹی موئی اور بڑی فرماں بردار قسم کے پیکر کی عکاس تھی۔ چین کی شاہانہ کلاس میں جو محاورہ سب سے زیادہ زد عام تھا وہ یہی تھا کہ علم کے بغیر ہی ایک عورت قابل تعریف ہے۔ قانون قدرت کا بھی ڈھوسکہ ہماری قدیم روایت کا حصّہ تھا جس کے مطابق عورت کا مرد کے تابع رہنا ضروری تھا۔ اب ذرا سوچ دیکھو۔ شادی سے قبل بیٹی کی صورت باپ کی وفادار ہو، شادی کے بعد شوہر اور اس کے مرنے بعد بیٹے کی۔

اف خدایا میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ نری پاکستانی سوچ۔

بس اس سوچ سے نکلنے میں پہلا بڑا کردار سن یات سن Sun yat Sen جیسے انقلابی لیڈر کا تھا۔ پھر سلسلہ چل نکلا۔

Wu Shuging جیسی انقلابی خاتون Qiu Jin جیسی شاعرہ اور فیمنسٹ Hua Mulan جیسی بے شمار عورتیں اٹھیں۔ جنہوں نے سر کٹوائے، جیلیں بھگتیں لیکن اپنے مقصد پر ڈٹی رہیں۔

اس کی نظر گھڑی پر پڑی دیکھو وقت کتنا ہو گیا ہے۔

لو میں تمہیں Qui Jin کی ایک نظم سناتی ہوں اور پھر ہم ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔

سورج اور چاند میں روشنی باقی نہیں رہی
زمین تاریک ہوگئی ہے
ہماری عورتوں کی دنیا کہیں بہت گہری ڈوب گئی ہے۔
ہماری مدد کون کرسکتا ہے
زیورات بیچ کر سمندروں پار جانے والے ٹرپ کی ادائیگی ہوئی
خاندان سے ناطہ توڑ کر
اپنی سرزمین کو چھوڑ کر
اپنے قدموں کو آزاد کرتے ہوئے
میں ہزاروں سال کی زہر کو صاف کرتی ہوں
جب جو شیلے گرم دلوں میں نسوانی روح یا جذبے بیدار ہوتے ہیں
افسوس یہ نازک سا کپڑا سر پر پڑا ہے
آدھا خون سے داغ دار اور آدھا آنسوؤں سے

☆☆☆

باب نمبر:۳۰ چین کے مستی شاعر اوران کی انقلابی شاعری

- بہترین انقلابی شاعروں کی ایک نسل ثقافتی انقلاب کی راکھ سے پیدا ہوئی تھی۔
- ماؤ نے حکماً کہا کہ ہر قسم کا آرٹ اور ادب صرف کیمونزم نظریات کے تابع ہوگا۔
- انقلابی تحریک نے لکھاریوں، دانشوروں، فنکاروں کو انتقام کی سولی پر چڑھایا۔

اب خلش تو تھی نا۔ڈاکٹر ارشد نے اس باب کو کھولنے کی کوشش ہی نہ کی جو The Private Life of chairman Mao پر بات چیت کے دوران ماؤ کے ثقافتی انقلاب پر عوامی ردّعمل جیسے سوال کے نتیجے میں سامنے آ گیا تھا۔یقیناً ڈاکٹر صاحب کو موضوع سے ہٹ جانے کا خدشہ تھا۔اسی لیے انہوں نے دو تین مختصر سے جملوں میں اعتراضی موضوع کا مکھو ٹھپ دیا۔پر میرے اندر تو بے چینی اور اضطراب کا بیج بویا گیا تھا نا۔ بیجنگ سے جانے میں دن بھی تھوڑے رہ گئے تھے تو پھر اس پر گفتگو ضروری تھی۔اب جب نشست جم گئی۔انہوں نے موضوع پر بات کرنے کی بجائے کہا۔

’’آنے سے پہلے اگر آپ کچھ مشورہ کر لیتیں تو میرے خیال میں یہ آپ کے لیے زیادہ فائدہ مند ہوتا۔‘‘

ڈاکٹر ارشد کی اس بات پر میں نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔میری حیرت کو انہوں نے سمجھا اور بولے۔

''دراصل یہاں ہر سال اپریل میں شاعری کا مہینہ منایا جاتا ہے۔گذشتہ سال اِس مہینے کا اختتامی شاعر گولوشنگ Guo Lusheng تھا۔کیا شاعری تھی اس کی۔مستی شاعری کا سرخیل وہی تو تھا۔ویسے مجھے چینی لوگوں کی یہ ریت اچھی لگی ہے کہ وہ اس کی زندگی میں ہی اُسے بھرپور خراج دینے لگے ہیں۔

مجھے افسوس نہیں ارشد کی اس بات پر دکھ اور غصّہ دونوں آئے۔چونکہ دونوں گھروں میں بہت قربت تھی۔اس لیے بیچ سے لحاظ اور احتیاط والا خانہ خالی ہوگیا تھا۔

''شاباش ہے تم پر ارشد۔یہاں کونسی نواسے نواسی کے بیاہ کی تاریخ رکھی ہوئی تھی کہ میرا مارچ میں آنا لازم تھا۔عمران اور سعدیہ (داماد اور بیٹی) فیملی کے ساتھ تم لوگوں کا گوڑھا یارانہ ہی نہیں ایک طرح دانت کاٹی روٹی والی بات ہے۔اور تمہیں یہ بھی پتہ تھا کہ آنے والی کچھ لکھنے لکھانے کی بھی دلدادہ ہے۔اب بتاؤ تمہارا کہنا ضروری نہیں تھا کہ بڑی بی سے کہو ذرا ٹھہر کر آجائے۔

اب میرا بھی بھلا ہوجاتا کہ ماسکو میں ملنے والی اُس ہندوستانی خاتون کی اِس بات کی بھی پرکھ ہوجاتی کہ جس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا تھا۔

''باپ رے باپ اپریل کے اختتام سے مئی، جون تک چین میں تو ہر سو پھولوں کی چادریں ہی بچھ جاتی ہیں۔''

سچی بات ہے بڑے ہی بیبے اور پیارے لوگ تھے۔میری فضول قسم کی لتاڑ اور ڈپٹ کا ذرا بُرا نہیں مانے۔الٹا اعتراف کیا کہ ہاں واقعی غلطی ہوئی۔

تو اب آمدم برسر مطلب پہلا سوال مستی شاعروں سے کیا مراد ہے؟ اور احتجاج کس انداز سے شروع ہوئے؟

ڈاکٹر ارشد نے چائے کا کپ اٹھایا۔چھوٹا سا گھونٹ لیا اور بولے۔

''احتجاجی تحریکوں کا سلسلہ گریٹ لیپ فارورڈ سے ہی اندر خانے شروع ہوگیا تھا۔احتجاج اور ردّعمل کئی صورتوں میں ظاہر ہوا۔اس مزاحمت کا پہلا ہتھیار مزاحمتی شاعری تھی۔بیسویں صدی کے بہت سے سوچ اور دانش رکھنے والے شاعر جوان دنوں کہیں کونے کھدروں میں پڑے تھے۔1960-70 کی دہائیوں میں اس تنقیدی مزاحمتی شاعری کے ساتھ بیدار ہوئے جو ماؤ کے نظریات کی مخالف تھی اور جوان کی زندگیوں کی قیمت پر وجود میں آئی تھی۔

یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بہترین اور ہردل عزیز شاعروں کی ایک نسل ثقافتی انقلاب کی راکھ سے پیدا ہوگئی تھی۔جنہیں مسٹی Misty شاعروں کا نام دیا گیا۔چینی زبان میں اسے مونگ لانگ شیرن Mong long Shiren کہا گیا۔اس نام کو دینے کا مقصد بھی تھا کہ کہیں بھی حکومتی سطح پر ان کے کام کا اعتراف نہ کیا جاسکے۔لیکن اس سے کیا فرق پڑا؟

اس نئی اور وکھری ٹائپ شاعری کی اہم خوبی ہی یہی تھی کہ یہ حقائق پر مبنی ریلزم (Realism) کی بنیاد پر اٹھی تھی۔اس کا آغاز معروضی حقائق سے ہوتا ہوا شخصی اور انفرادی احساسات تک جاتا تھا۔یہ خاموش ردّعمل کی بجائے زندہ اور متحرک تخلیق کی نمائندہ ٹھہری تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ مرکزی دھارے میں شامل ہوگئی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ میں ذرا تھوڑا روایتی چینی شاعری کا پس منظر بھی واضح کردوں۔'' ڈاکٹر ارشد نے گفتگو کی روانی کو چھوٹی سی بریک لگائی۔

''قدیم چینی سلطنتوں کی سلسلہ وار تاریخ میں جو چیز بہت نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے وہ شاعروں کی طاقت کے ساتھ ان کے دلی تعلق،قربت اور مفادات پر مبنی شاعری تھی۔جسے ہم ذاتیات کا نام دے سکتے ہیں۔یہ قرابت داری کے زمرے میں آسکتی

ہے۔انگریزی کا لفظ Proximity بھی موزوں ہے۔ بہت سے شاعر حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھے۔

یہ روایتی ،سیاسی،شاعرانہ تفسیری ٹائپ وراثت آگے بھی منتقل ہوئی کہ ماؤ سیاست دان بھی تھا اور شاعر بھی۔ گریٹ لیپ فارورڈ کے مصائب وآلام، کیمونسٹ پارٹی اور ثقافتی انقلاب کے دوران جب ماؤ نے کلچرل آرمی جیسے گروپ کی تشکیل چاہی اور ادب، آرٹ کو آرٹ برائے ادب اور آرٹ کے مخصوص نظریات کے فروغ کے لیے استعمال کرنا چاہا اور حکماً کہا گیا کہ ہر قسم کا آرٹ اور ادب صرف اور صرف سیاسی ہوگا۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

زمین سورج کا تعاقب کرتی ہے۔

چاند زمین کے پیچھے ہے۔

تیل ہمارے قدموں کا تعاقب کرتا ہے۔

اور

ہم ہمیشہ کیمونسٹ پارٹی کے پیچھے چلیں گے۔

بہت سے شاعروں نے پرانی روش کو اپنایا۔ کچھ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ہاں سوچ اور دانش رکھنے والے طبقے کی یکجائی نے طلبہ کے اندر بھی نئی اور باغیانہ سوچ کو جنم دیا۔ مزاحمت کی راہ ہموار کی۔ یوں یہ کارواں سا بن گیا۔ اِن میں چند بڑے نام جو مجھے یاد ہیں بتائے دیتا ہوں۔

خاطونگ He Dong، شوٹنگ Shu Ting ، گوچونگ Gu cheng ، بی ٹاؤ Bei Dao ، چھانگ چھن Zhang Zhen، خا چن Ha Jin ،چاؤ پنگ Chou Ping،

منگ کھا Mng kha ، تو آؤ، تو آؤ Duo Duo

یا نگ لیان Yang Lian جیسے بے شمار لوگ تھے۔ جنہوں نے اذیتیں سہیں، جیلیں بھگتیں۔ چند ایک کو 1989 تھین آن من سکوائر کی احتجاجیوں میں ہراول دستے کے لوگوں میں سمجھا گیا۔

بی ٹاؤ Bei Dao جیسا بے مثل شاعر جو چین میں بھی نہیں تھا اگلے بیس (20) سالوں کے لیے بین کر دیا گیا۔ اگر چہ تھین آن من سکوائر میں وہ بینروں پر لکھا گیا اور نعروں میں بھی شدت سے گونجا تھا۔ چینی نژاد امریکی شاعر جو شاعری کے ساتھ ایک بہترین کہانی کار، مضمون نگار کے طور پر بھی اپنا آپ منوا چکا ہے۔ وہ کئی بار نوبل ایورڈ کے لیے بھی نامزد ہوا۔ کبھی وہ چائنہ کے ثقافتی انقلاب میں ریڈ گارڈ تھا مگر پھر لوگوں کے دکھوں اور مصائب نے اُسے باغی بنا دیا۔ اس کی ایک نظم ''وقت کا پھول سنو'' مجھے بہت پسند ہے یہ۔

شیشے میں ہمیشہ یہی لمحہ ہوتا ہے
یہی لمحہ جو تخلیق کے دروازے کی طرف راہنمائی کرتا ہے
وہ دروازہ جو سمندر کی طرف کھلتا ہے

دراصل میں نے بی ٹاؤ Bei Dao کو بھی کافی پڑھا ہے۔ مسٹی شاعر کم و بیش سبھی بے مثال تھے۔ تاہم اس وقت موضوع سخن زیادہ گولُو شنگ Guo Lushing ہی ہے۔

گولُو شنگ Guo Lusheng اسی نئی نسل اور ان ہی مسٹی شاعروں کا سرخیل تھا۔ اس کا قلمی نام شی چھر Shi Zhi رکھا۔ آغاز میں اس کی شاعری کمال کی تھی۔ کلچرل انقلاب کے بعد اس نے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا۔

1968 میں جب اس نے Ocean Trilogy مکمل کی ۔ اس وقت ثقافتی

انقلاب ابھی شیر خوارگی میں تھا۔ثقافتی انقلاب کے آغاز میں وہ بہت پر جوش تھا۔اسے لگتا تھا جیسے یہ انقلاب بہت بڑی تبدیلی کا باعث ہوگا۔مگر پھر وہ مایوس ہوا کہ انقلابی تحریک تو خود لکھاریوں ،دانشوروں کے پیچھے پڑ گئی۔وہ زیرِ زمین دنیا بھر کے لکھاریوں سے جڑ گیا۔ اس نے اپنے لوگوں کو مغربی سیاست،فلاسفی اوراس کے اثرات سے روشناس کروایا۔

اگرچہ گولوشنگ Guo Lusheng کی نظمیں بغاوت کی واضح عکاس تھیں۔ اس کے مداح اس کی شاعری ہاتھ در ہاتھ تقسیم کرتے تھے۔مگر گو Guo نے اپنی دماغی صلاحیتوں کو چینی روایتی شاعری میں جس سچائی اور خلوص سے شامل کیا اور شاعروں کی نئی نسل کو اپنے خیالات و جذبات کے دلفریب اظہار کا سلیقہ سکھایا وہ قابلِ تعریف ہے۔

تاہم 1971 میں جب ماؤ نے لوگوں سے اپنا سب کچھ دان کر دینے کو کہا۔یہ وہ وقت تھا جب گو Guo سے برداشت نہ ہوا۔اس نے مصلحتوں اور زیرِ زمین والے سب ذریعے پھاڑے اور کھل کر میدان میں اُترا اور لوگوں کو آواز بلند کرنے کے لیے کہا۔

ذرا اُس کی اس نظم کو دیکھیئے۔

جب مکڑیاں میرا اسٹورا پنے جالوں میں چھپا چکی ہیں
جب دھویں کے کمزور مرغولے غربت کے دکھوں میں ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں
اور میں مایوسیوں کی راکھ کو بجھا رہا ہوں
جو خوبصورت برف کے گالوں سے ابھر رہی ہیں
میں مستقبل کے بارے پرامید ہوں

مختصراً زندگی کا احوال کچھ یوں ہے۔

باپ سرخ فوج میں تھا۔بہت سے فوجیوں کی بیویوں کی طرح گو Guo کی ماں بھی آرمی کے ساتھ ہی رہتی تھی۔مارچ 1948 کی ایک سرد ترین دن وہ سڑک کے

کنارے پیدا ہوا۔لوشنگ Lusheng کا مطلب یہی ہے سڑک پر پیدا ہونے والا۔

شاعری کا آغاز بہت کم عمری میں ہوگیا تھا۔دوستوں کے بدترین سلوک نے بہت مایوس کیا۔اس نے خود کو بند کرلیا۔چیِن سموکر بنا۔اسی دوران اس کے باپ نے دیکھا کہ اس نے ایک آدمی کی تصویر بنائی ہے۔جس کی گردن میں ایک لمبا چاقو ہے۔اُسے شک ہوا کہ شاید وہ خودکشی کرنے جارہا ہے۔

کیونکہ اس کے بہت سارے دوست ایسا کرچکے تھے۔1973 میں اُسے مینٹل اسپتال داخل کروادیا گیا۔جہاں شیزوفرینیا کی تشخیص ہوئی۔

میرے خیال میں گولوشنگ عظیم شاعر ہے۔یہ وہی شاعر تھا جس نے مسٹی شاعروں کو متاثر کیا۔شہرت کی بلندیوں تک پہنچا۔یہی وہ شاعر تھا جسے دوسال قبل اس کے مداحوں نے ہمیشہ کی طرح اپریل کے مہینے میں اُس کا جنم دن بھرپور طریقے سے منایا تھا۔اور جسے میں نے اول سے آخر تک سُنا اور متاثر ہوا۔

''مستقبل کے بارے پرامید رہو'' میں ذرا دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔

میں دور بہتی لہروں کی طرف اشارہ کرتا ہوں
میں وہ سمندر بننا چاہتا ہوں جو اپنے آپ میں سورج کو سموئے
جو صبح کے گرم جوش قلم کو تھامے
اور بچوں کے سے انداز میں لکھے
اور مستقبل کے بارے پُر امید ہو

وہ خود کو سمندر میں صرف ایک قطرے سے تشبیہ دیتا تھا۔مگر آج وہ ایک وثرنری شاعر کے طور پر جانا اور سمجھا جاتا ہے۔

اب ایک دلچسپ سا ادبی جھگڑہ جو پچھلے دنوں میں سوشل میڈیا پر لوگوں کی توجہ کا

مرکز رہا۔ ذرا آپ بھی سُنیں اور لطف اٹھائیں۔

یوئے شیاؤ خوآ Yu Xiuhua آج کی نوجوان شاعرہ جو دماغی بیماری کی وجہ سے بولنے اور چلنے پھرنے میں دشواری محسوس کرتی ہے۔ مگر کیا کمال کی شاعرہ ہے۔ نئی نسل کی ترجمان، بے باک جس نے کوئی دو ہزار سے زیادہ نظمیں لکھیں۔ 2014 میں اس کی ایک نظم I crossed half of china to sleep with you نے بڑا ادھم مچایا تھا۔ کچھ ماہ پہلے کسی بک لانچنگ تقریب میں گو Guo نے موجودہ چینی شاعری پر کچھ نکتہ چینی کی تھی۔ یوئے Yu نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سوشل میڈیا پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ اس کی زندگی کافی پینے، کتابیں پڑھنے، گپ شپ کرنے اور موج میلہ کرنے میں ہی گزرتی ہے۔

جب گو نے کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شاعر انسانیت بارے نہ سوچے۔ یا وہ اپنی قوم کے مستقبل پر غور وخوض نہ کرے۔''

یہ کیسے ممکن ہے کہ دیہی علاقے سے تعلق رکھنے والا ایک شاعر دیہاتی زندگی کی تکالیف اور مصائب کا ذکر نہ کرے اور ان کے لیے خوشحالی کے خواب نہ دیکھے۔ یہ باتیں کیسے بھول سکتے ہیں۔

ایسے وقت میں جب سوچوں پر پہرے لگانے کی کاوشیں ہوں۔ یہ چپقلش اچھی چلی۔ اور لوگوں نے اس میں بھرپور طریقے سے حصّہ لیا۔

☆☆☆

باب نمبر:۳۱ مسٹی شاعروں کا ایک اور اہم شاعر گوچنگ۔

- تشبیہوں اور استعاروں کے سہارے وہ حکومتی ارکان پر لعن طعن کی بارش کرتا۔
- جدّت طراز تھا۔شاعری میں نئے نئے تجربات اسی سے وابستہ ہیں۔
- اکثر بڑے شاعروں کی طرح اس میں بھی کچھ عجیب عادتیں تھیں۔

گوچنگ Gu cheng دوسرا بڑا ماڈرن نامور شاعر ہے جس نے ناول نگاری اور مضمون نگاری میں بڑا نام پیدا کیا۔مسٹی شاعروں میں وہ بہت خصوصی اہمیت کا حامل شاعر سمجھا جاتا ہے جسے کئی بار نوبل انعام کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔

1956 کی پیدائش اور وہ بھی بیجنگ میں۔یہ زمانہ کیمونسٹ پارٹی کے نت نئے تجربات کا زمانہ تھا۔وفاداریوں کے ماپنے کے پیمانے بڑے نرالے سے تھے۔سزائیں، پکڑ دھکڑ،جیلیں،سختیاں اور پھانسیاں سبھوں کا بڑا رولا رپا تھا۔

یہی کچھ اِس نوجوان شاعر کے ساتھ ہوا تھا۔اس کا باپ گوگونگ Gu Gong پارٹی کا بہت بڑا اور نمایاں لیڈر تھا۔سرخ فوج میں خدمات کے لیے مشہور تھا۔شاعری بھی خوبصورت کرتا تھا۔اُسے اپنے خاندان کے ساتھ ثقافتی انقلاب کے ان الٹے سیدھے سیدھے منصوبوں کی تکمیل کے لیے ایک طرح Shandong کے دیہی علاقوں میں سوروں کی گلہ بانی کے لیے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔تب گو Gu صرف بارہ سال کا تھا۔

یہاں اس کے اردگرد سادگی تھی۔فطرت کا حسن تھا۔مخلص اور سیدھے سادھے لوگ تھے۔زندگی مشکل تھی مگر پرسکون تھی۔اور یہی وہ وقت تھا جب اس کے اندر شاعر

جا گا۔اس دور کی اس کی شاعری کسی استاد، کسی رہنما کے بغیر تھی۔فطرت نے اس کی تربیت کی۔

بیجنگ واپسی تو کوئی 1974 میں ہوئی۔ہنر تو کوئی پاس نہ تھا۔پہلے پہل بڑھی کا کام کیا۔اینٹیں ڈھونے، سیمنٹ کی تگاریاں اٹھانے اور ہر طرح کی محنت مزدوری کرنے والا شاعر دھیرے دھیرے انڈسٹریل پینٹر بن گیا۔

اخبار بیچنے کا کام بھی شروع کردیا۔یہیں وہ رسالہ ''آج'' کے ساتھ وابستہ ہوا۔یہی وہ رسالہ تھا جس میں اس کی شاعری، اس کے مضامین باقاعدگی سے چھپنے شروع ہوئے۔اس کے پڑھنے والے سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں اُسے پڑھنے لگے تھے۔یہی وہ قاری تھے جنھوں نے اُسے ایک سیلیبرٹی بنا دیا اور پھر ایک دن وہ میگزین ایڈیٹر بھی بن گیا۔

ایسے میں بھلا احسان دانش یاد نہ آتے۔وہ آئے اور بے طرح یاد آئے۔

وہ جدّت طراز تھا۔شاعری میں نئے نئے تجربات اسی سے وابستہ ہیں۔یوں بھی مسٹی شاعروں نے حکومتی پارٹی اور ان کی پالیسیوں سے راہ فرار اختیار کر لی تھی۔گو Gu بھی اسی قبیلے میں شامل تھا۔چینی زبان کو مالا مال کرنے میں اس کے ان ہی مختلف نوع تجربات کا کمال ہے جن کا اظہار اس کے ہاں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کی شاعری ایک تو حقیقت پسندانہ تھی۔مثبت ردّعمل سے متحرک ردّعمل کی طرف سفر کرتی تھی۔دوسطروں کی نظمیں جنہیں اس نے ''A generation'' کا نام دیا۔اس کا وہ شہرہ آفاق کارنامہ ہے جس نے اُسے اپنے ہم عصروں میں نہ صرف ممتاز کیا بلکہ چینی ادب میں بھی ایک نئی جدت کا اضافہ کیا۔

دیکھیئے وہ کیسے طنز کے نشتر چلا رہا ہے۔تشبیہات اور استعاروں کے سہارے وہ

حکومتی ارکان پر لعن طعن کے تبرّ ے بھیجتا ہے۔اندھی آنکھیں اور تاریک راتیں۔اسی طرح ''بعض اوقات'' میں شمال سے مراد اس کی پایہ تخت بیجنگ سے ہے۔ پتلی اور پھدری شاخوں سے مراد کچھ گنے چنے مخلص ساتھی ہیں۔اس کی ہر نظم ایسے ہی گہرے جذبات کی عکاس ہے۔

اِن اندھی آنکھوں کے ساتھ
جو تاریک راتوں کا ہی تحفہ ہیں
میں چمکتی روشنی کا متلاشی ہوں

بچے پھولوں کے لیے
شہد کی مکھیوں کو نہیں پکڑتے
مگر دنیا اپنے لیے لوگوں کو پکڑتی ہے

موت ایک چھوٹا عمل ہے
زندگی کا ایک محض چھوٹا کٹا ہوا حصّہ
جو نشان تک نہیں چھوڑتا

بعض اوقات
بعض اوقات دھرتی ماں
بڑے پرندے کے گھونسلے کی مانند ہوتی ہے
شمال کی پتلی پتلی شاخیں مجھے گھیر لیتی ہیں
تا کہ میں سورج کو دیکھ سکوں

اور مجھے محبت سے سرشار کر دیتی ہیں
ہم چھوٹے پرندوں کی طرح ہتھیلیوں میں ہوتے ہیں
اور ایک دوسرے کے بارے میں خواب دیکھتے ہیں
ہر طرف تند ہوا ہے
اور خزاں میں زرد پتے اڑتے پھرتے ہیں

آنکھ کے جھپکنے میں
اس عظیم زمانے میں میرا خواب تھا
مجھے یقین تھا
اور میں نے کبھی آنکھ نہیں جھپکی
قوس قزح
جو فوارے میں دکھتی تھی
اور پاس سے گزرنے والے کو مبہوت کرتی تھی
اور آنکھ کے جھپکنے میں
سانپوں کے سایوں میں ڈھل گئی
گھنٹی کی سریلی آوازیں
جو دور کہیں چرچ میں سنائی دیتی تھیں
خاموشی سے وقت کے دھاروں سے دور چلی گئیں
اور آنکھ کے جھپکنے میں
گہرے کنوویں میں بدل گئیں

سرخ پھول
جو صفحہ ہستی پر کھلے
اور جو بہار کی ہواؤں کو خوش آمدید کہتے تھے
آنکھ کے جھپکنے میں
خون کے تالابوں میں بدل گئے
اور یقین کی خاطر
میری آنکھیں چوپٹ کھلی رہ گئیں

ہم لکھتے ہیں
ہم لکھتے ہیں
اُس حرارت کی طرح جو پائن کے پھلوں کے درمیان اپنا راستہ ڈھونڈتی ہے
اور شطرنج کے پیادوں کی طرح جو دھیرے دھیرے حرکت کرتے ہیں
ہم لفظ ڈھونڈتے ہیں
جو تند و تیز ہیں، جن میں بوسیدگی ہے
اور جو ایک دوسرے کو نگل لیتے ہیں
ہم اپنے چھکڑے کو چلانے میں ناکام ہو گئے
وقت پر شاہ بلوط کی بلندیوں کی طرف لے جاتے ہیں
اور بلوط کے بیج زمین پر گرتے ہیں
اور ساری زمین بلوط کے بیجوں سے بھر جاتی ہے

میرا دل دنیا سے محبت کرتا ہے
محبت کرتا ہے
اور سردیوں کی رات میں
اُسے نرمی سے چومتا ہے
اُس پاکیزہ اور خالص جنگلی آگ کی طرح
جو گھاس کو چومتی چلی جاتی ہے
چراگاہ نرم گرم ہے
جس کے اختتام پر ایک منجمد جھیل ہے
جس کی تہہ میں خوابیدہ حسن ہے

میرا دل دنیا سے محبت کرتا ہے
اور وہ شبنمی پھول کی طرح پگھلتی ہے
میرے خون میں
بہت آہستہ آہستہ
سمندر سے پہاڑوں کی طرف بہتی ہے
آنکھوں کو نیلا ہٹوں
اور صبحوں کو لالی سے بھرتی ہوئی

میرا دل دنیا سے محبت کرتا ہے
میں محبت کرتا ہوں اور اپنے خون سے

اس کی تصویریں اور خاکے بناتا ہوں
مکئی کی بالیاں اور ستارے اب چمکتے نہیں ہیں
کوئی تھک چکا ہے اور اپنے سر کو جھٹکتا ہے
کسی نادیدہ چیز کی طرف

یہ کہا جاتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں
اور اچھلنا کودنا بھول چکا ہوں
اور مسکراہٹ ٹوٹے تنکوں جیسی ہے
اور آپ کیسے کہیں کہ
سنہری شہد کے قطرے جیسی آنکھیں
دنیا پر حکمرانی کے لیے بے تاب ہیں
اور جو صبح کے سورج پر چمکتی ہیں

میرے خواب کہیں کھو گئے ہیں
میری جیب میں صرف سب سے چھوٹا خواب ہے
میں لٹ گیا تھا
میں نے سورج سے کہا
سورج جو راتوں کا پیچھا کرتا ہے
اور پھر راتوں کے جھرمٹوں کے پیچھے رہتا ہے

سچی بات ہے ایسی بے باک اور گہری شاعری جو اس کے منہ سے نکلنے کے ساتھ ہی کوٹھوں چڑھ جاتی تھی۔

وہ لکھ رہا تھا اور لکھتا چلا جا رہا تھا۔ چینی روایتی شاعری سے باغی ہو کر۔ اس کے کام کی جدّت، اس میں چھلکتا نیا پن نہ صرف اس کی فکر میں تھا بلکہ یہ اسلوب میں بھی نمایاں ہوا۔ اس کی ہر تخلیق اپنے انداز میں ایک نئی تبدیلی کی مظہر تھی۔ اور اسی چیز نے اُسے چین کی ڈھائی ہزار سال کی شاعری میں بہت نمایاں کر دیا تھا۔

جس سے پیار کیا وہ شی xie xieye تھی۔ برلن میں ٹکراؤ ہوا جہاں گو Gu جرمن اکیڈیمک فیلو شپ کے تحت مقیم تھا۔ Xieye نے اُسے بہت پسندیدگی سے دیکھا۔ سراہا اور اس کے ساتھ رہنے کی شدید خواہش کی۔ اُسے اپنی چینی روایات سے پیار تھا۔ گو کی شاعری سے عشق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دوبارہ جلاوطنی مقدر ہوئی۔ یہ نیوزی لینڈ کے ایک نسبتاً سنسان سے جزیرے Waiheke پر ہوئی تو شی Xie بھی ساتھ تھی۔

پھر ایک عجیب حادثہ ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کو کلہاڑے سے زخمی کر دیا۔ اور جب اسے اسپتال لے جایا جا رہا تھا وہ راستے میں ہی ختم ہو گئی۔

اپنی بیوی کو مارنے کے بعد اس کے ہاں جو ردّعمل پیدا ہوا وہ بھی کچھ اس کی غمازی کرتا ہے کہ وہ حملہ کرنے اور اس کا خون بہتا دیکھ کر اتنا ہراساں ہوا کہ گھر سے بھاگ کر اپنی بہن کے پاس گیا اور اعتراف کیا کہ اس سے ایک بھیانک جرم سرزد ہو گیا ہے۔

اور پھر ایسی ہی ذہنی کش مکش میں اس نے اپنی زندگی کا بھی خاتمہ کر لیا۔ اس وقت وہ صرف 37 سال کا تھا۔

اب کیسے ممکن ہے کہ یہ سوال پیدا نہ ہو کہ کسی بھی لکھنے والے کی غیر فطری موت زیرِ بحث نہ آئے۔ لکھنے والا اور وہ بھی اچھا لکھنے والا جس نے لاکھوں لوگوں کو متاثر کیا

ہو۔اس کی زندگی اور موت کے بخئیے نہ ادھیڑیں۔چین کا یہ عظیم اور جدید شاعر بھی اس زد میں آیا کہ اس کے المناک اور وحشت بھرے انجام کو لوگوں نے اس کے کام کے ساتھ نتھی کر دیا تھا۔

پہلا المیہ تو یہی تھا کہ والدین کے ساتھ پہلی جلاوطنی کا سارا وقت بڑی غربت میں گزرا۔ بیجنگ واپسی کے بعد انقلابی شاعری اور مسٹی شاعروں کی صف میں نمایاں شمار نے بھی حکومت کی مخالف صف میں کھڑا کر دیا۔تھیین آن من سکوائر میں اس کے کردار کو کوئی بھی نظر انداز کرنے کو تیار نہ تھا۔

چینی اخبارات میں اس پر بڑی لے دے ہوئی۔اس ضمن میں بہت سے انکشافات ہوئے۔ یہ بات بھی کہی جانے لگی کہ وہ زندگی کے بہت آغاز سے ذہنی بیماری کا شکار تھا۔

گو کوئی پہلا نمایاں شاعر نہیں ہے جس نے اپنی بیوی کو قتل کیا۔اس ضمن میں ولیم Burroughاور بوئس Althusser دونوں نے بھی اپنی بیویوں کو قتل کیا۔گو حالات کی نوعیت بھی اس کی سنگینی کو کم زیادہ کرتی ہے۔

Althusser ذہنی طور پر بیمار جبکہ Burroughs نے ولیم ٹیل کے ساتھ کثیر مقدار کی شراب نوشی کے بعد یہ حرکت کی تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گو بھی ذہنی طور پر بیمار تھا مگر شاید نہیں۔اس کی عسرت زدہ زندگی اور جزیرے پر تنہائی کی زندگی اس کی ذمہ دار ہو سکتی ہے۔

اب جو داستان حیات کا ورق سن رہی تھی وہ بھی تو کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا۔ Xie ye سے اس نے محبت کی تھی۔اس سے شادی کی تھی۔اس سے ایک بیٹا بھی تھا Sam۔نیوزی لینڈ کے اُس ویران جزیرے پر وہ اس کے ساتھ تھی۔تو پھر اُسے کلہاڑے

سے مارنے اور خودکشی کرنے کی کیا افتاد آن پڑی تھی۔

چلیئے پہلے ذرا اس کی تفصیلات میں چلتے ہیں۔کیونکہ مجھے تفصیل میں جانے سے بہت دلچسپی تھی۔

اکثر بڑے لوگوں کی طرح،اکثر بڑے شاعروں کی طرح اس میں بھی کچھ عجیب سی عادتیں تو تھیں۔ضدی تھا۔Waiheke جزیرے پر انگریزی سیکھنے سے تو وہ سیدھے سیدھے فرنٹ ہوگیا کہ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کی چینی زبان میں لکھنے کی صلاحیت کو متاثر کرے گی۔قطع نظر اس کے یہ بات دانشمندانہ تھی یا نہیں۔اس کے اندر اِس سلسلے میں ہٹ دھرمی تھی۔

ایک اور بھی بڑی انوکھی سی عادت اُسے اکیلے گھومنے پھرنے کی تھی۔سر پر پتلون کی کٹی ہوئی ٹانگ کا ایک ٹکڑا دھرا ہوتا۔یہ بڑا عجیب سا لگتا تھا۔جب اُسے پوچھا جاتا کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ وہ جواباً لمبی چوڑی گفتگو کرتا اور مخاطب کو بتاتا کہ یہ اس کے خیالات کی حفاظت میں بہت معاون ثابت ہوتی ہے۔

مخاطب اس کی احمقانہ بات پر قہقہہ ضرور لگاتا۔

Gu اور Xie ye کی موت پر عوامی توجہ نے شدت اس وقت کھینچی جب ان میاں بیوی کی کتاب Yinger The kingdom of girls چھپی۔Xie کا تو اس میں بس تھوڑا سا ہی حصّہ تھا۔یہ ہے تو ناول کی شکل میں مگر Gu کی زندگی کی عکاس ہے۔اب جو داستان حیات میں سن رہی تھی۔

یہ کتاب بہت سے رازوں سے پردے اٹھاتی ہے اور ناول کا مرکزی خیال بھی دونوں کے تعلقات کے ساتھ Li ying نامی لڑکی کے کردار کو بھی نمایاں کرتی ہے جو جزیرے پر ان کے ساتھ رہتی تھی اور گو کی دوست تھی۔

لی Li گو سے اپنے زمانہ طالب علمی سے شناساتھی جو رفتہ رفتہ محبت میں بدل گئی تھی کہ دونوں کے درمیان خطوط کا تبادلہ مسلسل رہا۔حتیٰ کہ 1989 میں لی نیوزی لینڈ کا ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ ویزا اس نے تھیان آن من سکوائر کے واقعے بعد سیاسی پناہ کے طور پر حاصل کیا تھا۔

حیرت انگیز طور پر لی ینگ Li ying کا جزیرے پر آنا اوران کے ساتھ رہنا بھی خاصا وجہ تضاد رہا۔ لی نے بھی Heart broken on Waiheke نامی کتاب لکھی جس میں اس نے اس گھر میں ان کے ساتھ رہنے کے تجربے کو اپنی امیدوں اور مایوسیوں کے ساتھ قارئین سے شئیر کیا۔ لی نے یہ بھی لکھا کہ اُسے تو اِس کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ گو اُس سے جنسی تعلقات قائم کرنے کا بھی خواہش مند تھا۔

یہاں دونوں کتابوں کے مطالعے سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ Xie ye کے احساسات و جذبات لی کے جزیرے پر آنے کے بعد کیسے تھے۔ بہرحال یہ واضح ہے کہ دونوں عورتوں میں دوستی کا رشتہ استوار ضرور ہوگیا۔ہاں دونوں کے درمیان حسد یا لڑائی جھگڑے کا پتہ نہیں چلتا۔تاہم گو ضرور جیلسی محسوس کرتا تھا۔

گو کا رویہ بہت عجیب ہوگیا تھا۔وہ Xie کے ساتھ ساتھ بیٹے کو بھی اذیت دینے لگا تھا۔ Xie نے نو سالہ بیٹے کے ساتھ فرار کی بھی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔معلوم ہو جانے پر بیٹے کی بھی پٹائی شروع کردی۔ اِس طرح تشدد کے آئے دن اظہار پر سام بیٹے کو سکول کی ایک ٹیچر کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔

Xie لکھتی ہے۔اب ایسے تلخ اور پرآشوب حالات میں میرے احساسات و جذبات کیا ہوں گے۔اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔کیسے ہم دو سے تین بنے اور کیسے ہماری زندگی جہنم بن گئی کہ ہم ایک دوسرے کی صورت بھی دیکھنے کے روادار نہ رہے۔

اس حقیقی کہانی کا انجام کتنا ڈرامائی تھا کہ Xie نے برلن میں کسی سے تعلقات استوار کر لیے تھے۔اور Li بھی کسی مارشل آرٹ کے درمیانی عمر کے انسٹرکٹر سے ناطہ جوڑ بیٹھی تھی۔دونوں کے معاشقوں کی خبر گو کو ہوگئی تھی۔

Xie بیٹے کے ساتھ فرار ہونے کے چکر میں تھی جب گو نے اُسے قتل کر دیا اور خود کو بھی مار ڈالا۔

☆☆☆

باب نمبر:۳۲ چین کی قومی زندگی میں ستارہ بن کر روشن ہونے والا یان

- میری نسل نے چین کی بھوک کم کرنے کی مشقت جھیلی۔
- اگلی نسل کے لیے نئے افق، نئی چراگاہیں منتظر ہیں۔

ماہ وسال تو یہی کوئی 1978 کے ہی تھے۔خزاں کا آغاز تھا۔ایک مضطرب، دکھ دینے والی اور گھائل کرتی اُداسی شمالی چینی گاؤں شیاؤ گینگ (Xiaogang) کے درو دیوار پر پھیلی ہوئی تھی۔اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی جب اِس گاؤں کا ایک باسی تیس سالہ یان فو نگ شینگ (Yan Hong Change) اپنے گھر سے باہر نکلا۔اس کی آنکھوں میں اگر گہرا اضطراب تھا، چہرے پر دبیز قسم کی مایوسی اور دُکھ کے سائے تھے تو بدن بھی ایسے ہی احساسات کا عکاس تھا۔لمبی آہ اس کے اندر سے نکلی تھی جب اُس نے کچھ فاصلے پر بنے باڑے پر نگاہ ڈالی۔وہاں مویشی تو اب رہے ہی نہیں تھے۔بس ایک بیل کھڑا تھا۔لاغر سا گویا بھوک کے ہاتھوں موت کو آوازیں دیتا ہوا۔کھیتوں پر دھول اڑتی تھی۔نہ چاول، نہ آلو اور نہ مکئی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ کمرے میں تھا۔بیجنگ ریڈیو سے چیرمین ماؤ کی موت کی دوسالہ برسی کی تفصیلات کا بیانیہ کوئی پانچویں بار نشر ہورہا تھا۔اسے سُنتے ہوئے اُسے محسوس ہوا تھا اُس کا بلڈ پریشر شوٹ کررہا ہے۔اِس کی زبان سے ماؤ اُس کے جانشین ہوا گوفنگ Hua Guo Feng کے لیے مذمّت اور دکھ میں ڈوبے ہوئے لفظ نکلے۔

''یہ مرنے والے کی ذات پر سیاست چمکا رہے ہیں۔نہیں جانتے ہیں کہ لوگ تباہ ہوگئے ہیں۔بھوک سے مر رہے ہیں۔ہمارے کھیت ، ہمارے جانور، ہمارے پیاروں کی

زندگیاں داؤ پر ہیں۔'' گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اِس گوفنگ Hua Guofeng کی تومت ماری جارہی ہے۔ چلو ثقافتی انقلاب کے اداروں پر اثرات کے خاتمے کے لیے اس کی کاوشوں کو داد دینی پڑتی ہے مگر یہ کیا کہ ماؤ کی چھتر چھاؤں سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ بیجنگ کے طاقتی ایوانوں میں بیٹھے ہوؤں کیمونسٹ پارٹی کے بااثر لوگوں کو بھی بس اِسے ہٹانے کی فکر ہے۔ لوگوں کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ اِس کی قطعاً انہیں بھی کوئی پرواہ نہیں۔ بس اقتدار کی جنگ ہے۔ لوگ جائیں بھاڑ میں۔ اِن کی غیر مساوی معاشی منصوبہ بندیوں نے ہم غریب کسانوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔ نہ انہیں خشک سالی کی فکر ہے اور نہ انہیں قحط کا کوئی خوف ہے۔

وہ اب کچھ فاصلے پر پڑے سوکھے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ فضا پر نظریں دوڑاتے ہوئے اپنے اندر کے دکھ سے پھر ہم کلامی کرنے لگا تھا۔

میری تو آنکھیں اِس چین کے شہرہ آفاق قحط کو پھر سے اِن بیچارے غریب مظلوم لوگوں پر مسلط ہوتا دیکھ رہی ہیں۔

موت اور قبریں دیکھ رہا ہوں۔'' گاؤں موت کے دہانے پر پہنچ گیا ہے۔ اِن اوندھے حکمرانوں کی غلط اور غیر مساوی معاشی پالیسیوں نے ہماری شاندار موت کا سامان کر دیا ہے۔''

وہ خود سے باتیں کرتا اپنے گھر کی طرف بڑھا کمرے میں آیا جہاں اس کا ہم عمر قریبی رشتہ دار وانگ فوچی بیٹھا تھا۔ یان کے بیٹھنے کے ساتھ ہی وانگ فوچی پھٹ پڑا۔

اندر کی بے چینی کی یلغار نے اُسے کھڑا کر دیا تھا۔

''اِس عظیم لیپ فارورڈ کی پالیسیوں کو کیا کہوں؟ مانتا ہوں قدرتی آفات پر انسان کا زور نہیں پر اس کے علاج اور کچھ چارہ گری کی تو ضرورت تھی۔ اب دیکھو 15 سے

45 ملین لوگ بھوک سے مر گئے ہیں ۔اور باقی مرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ہماری ضروریات ہی کتنی ہیں صرف دن میں دو وقت کا کھانا وہ بھی نصیب نہیں اور جس کا انہیں احساس تک نہیں۔'' یان کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔جنہیں اپنے لاغر سے ہاتھ کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے وہ وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''سُنو ۔میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔آج تم گاؤں کے ہر خاندان کے سرکردہ فرد کو بُلا لاؤ۔بات کرتے ہیں کہ انہیں مرنا ہے یا زندہ رہنا ہے۔'' گاؤں جب تاریکی میں ڈوب گیا۔یان کے کمرے میں گاؤں کے کوئی بیس کے قریب لوگ جمع تھے۔کمرے کی چھوٹی سی اکلوتی کھڑکی اور دروازہ بند کر دیا۔یان نے مجمع پر نگاہ ڈالی اور بولنے لگا۔تم میں سے ہر شخص کے چہرے پر غریبی تو لکھی ہوئی ہے مگر اس سے بھی زیادہ بھوک سے موت تحریر ہے۔کتنا وقت گزر گیا ہے؟ ہمارے گاؤں کو کیمون سے (مشترکہ زرعی اراضی کا نظام) وابستہ ہوئے۔نتائج تو سامنے ہیں اس پر میری کسی تنقید اور تبصرے کی تو کوئی ضرورت قطعاً نہیں۔

''نہیں''

یہ جواب اس نے خود ہی دیا تھا۔پہلی بات تو یہ دیکھنے والی ہے کہ اناج جہاں سٹور کیا گیا وہ علاقے گاؤں سے کتنا دور ہیں۔کسی نے ہمارے بارے سوچا تک نہیں۔اب جو تقسیم کیا گیا اسے بھی خاندان کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔اِس کا بھی نہیں خیال رکھا گیا کہ خاندان بڑا ہے یا چھوٹا۔کھانے والے منہ کتنے ہیں اور کام کرنے والے کتنے۔اجتمائیت کو کیمونسٹ دنیا کی شاہراہ پر بڑی اہمیت حاصل ہے۔میں مانتا ہوں اِسے۔مگر دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ یہ اصول، یہ رویے عام لوگوں کے لیے کس حد تک سودمند ہیں۔اب اِس اجتماعی پنے نے تو ہمیں اپنی زمین سے بے دخل کر دیا نا۔زمین سے اناج کا گوشہ حاصل کرنا کوئی معمولی بات

ہے کیا؟ اِسے بچے کی طرح پالنا پوسنا پڑتا ہے۔اس کی دیکھ بھال میں جان کو ہلکان کرنا پڑتا ہے تب کہیں دانہ منہ میں جا کر پیٹ کی آگ بجھاتا ہے۔مگر زمین تو سرکار کی ہے۔انہوں نے آپ کو اناج دینا ہے اتنا ہی جتنا انہوں نے منظور کیا ہے۔اب اِس تجربے کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔سستی، ہڈحرامی، کام چوری جیسی ساری باتیں ہم میں آ گئی ہیں۔نتیجتاً بھوکوں مرنے لگے ہیں۔گاؤں میں جیانگ کوئی پچاس کے پیٹے کا آدمی تھا۔کتابیں پڑھتا تھا۔دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس سے بھی کسی حد تک آگاہ تھا۔اس کی زندگی کا ابتدائی حصہ اپنے باپ کے ساتھ برصغیر میں بھی گزرا تھا جہاں اس کا باپ کپڑے بیچنے جاتا تھا۔اس کا باپ سٹالن کے دور میں روس گھوم آیا تھا۔دنیا دیکھے ہوئے تھا۔اس نے کہا۔

''اِن اندھوں کو تو اتنی عقل ہی نہیں کہ یہ روس سے ہی کچھ سیکھ لیتے۔اس نے بھی یہ اجتماعی فارمنگ کا سلسلہ شروع کیا تھا۔اپنی زمین، اپنے ڈھور ڈنگر، اپنے اوزار سب بانٹ لو۔سب چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ تقسیم کر لو۔ارے بھئی اپنا خاندان بھی کبھی نہ کبھی کسی بات پر الجھ پڑتا ہے۔تو کیا یہاں جھگڑے نہ ہوتے۔ہوئے اور خوب تماشے لگے۔

ایک عورت کے دس بچے۔ایک کے پانچ اور ایک کا ایک۔اب اناج ایک سا تقسیم ہونا ہے۔ہے نا بندر بانٹ۔''

ھوا گو نے اس کی بات کو شہ دیتے ہوئے کہا۔''چچا تم نے باتیں کتنی سچی کی ہیں اب خود دیکھو کہ اچھے سالوں میں ہم اناج کے سلسلے میں کم از کم نو ماہ تک تو خودکفیل تھے۔چلو باقی کے تین ماہ حکومت مدد کر دیتی تھی۔آلو، چاول اور گوبھی، کھیروں کی بھی کمی نہ تھی۔کم از کم اِس قحط سالی کا شکار تو نہ تھے۔اب کیا ہے؟ گاؤں بھوکا مر رہا ہے۔لوگ بھکاری بن گئے ہیں۔اردگرد کے گاؤں بھاگے جاتے ہیں کہ کچھ مل جائے۔

کوئی پینتیس کے ہیر پھیر میں چھن ای نامی نوجوان نے کہا۔''مجھے دیکھو میری عمر

آپ سب کے سامنے ہے۔مہینوں سے ہم دونوں یعنی میں اور میری بہن روزانہ ادھر ادھر جاتے ہیں کہ کھانے کی کوئی چیز مل جائے۔جب کبھی ہمیں زمین پر گری ہوئی کچھ کھجوریں ہی مل جاتی ہیں تو ہماری خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔کیا ہم ایسے تھے؟

اب ہا تک چانگ کا بڑا بیٹا جس کی عمر لگ بھگ پنتالیس (45) برس تھی بولا۔سچ کہتا ہوں کہ چاول کے ایک پیالے کا بھی اب میسر آنا ہمارے لیے ایک بہت بڑی عیاشی ہے۔شکر قندی اور مکئی کو تو مدت ہوئی نہیں دیکھا۔

جب بہت سے لوگوں نے اپنے دکھ کو زبان دے دی۔تب ایکا ایکی یان جو خود اس وقت چار بھوک زدہ بچوں کا باپ تھا بولا۔''اگر آپ چاہتے ہیں کہ شیاؤ گینگ کے لوگ غربت سے نکل آئیں تو پھر آپ لوگوں نے میری بات سُننی ہے اور جیسے میں کہوں اس پر عمل کرنا ہے۔

''بولو، کہو، تمہارے ذہن میں کیا تجویز ہے؟'' مجمع میں سے چند نے کہا۔

''ہم اپنے گاؤں کی اراضی کو ماضی کی طرح آپس میں بانٹ لیں۔اسی طرح اِسے اپنائیں جیسے یہ سسٹم سے پہلے ہمارے پاس تھی۔اپنے اپنے مال مویشی جو بچے ہوئے ہیں انہیں بھی۔زرعی آلات بھی۔کِسی کو کانوں کان خبر نہ لگنے دیں۔فصل کاٹنے کے بعد ٹیکس دیں اور باقی اناج خود اپنا اپنا اٹھالیں۔'' کمرے میں یکدم سناٹا چھا گیا۔دیر بعد ایک آواز ابھری۔''تم نے اِس کے نتائج پر غور کیا؟''

یان نے کہا۔''بہت کیا۔دنوں سے کیا مہینوں سے کر رہا ہوں۔مرنا تو ایسے بھی ہے اور ویسے بھی ہے۔تو پھر ڈر کس بات کا؟'' منصوبہ انتہائی خطرناک تھا۔کمرے میں موجود سب لوگ اِس سے آگاہ تھے۔ثقافتی انقلاب اور کمیونزم کی جڑوں میں زہر ڈالنے والا۔اس سرمایہ دارانہ روایتی نظام کا ایک اہم حصّہ جس کا طوق چینی معاشرے نے اپنے

گلے سے اتار پھینکا تھا۔وہی نظام منافع خوری اور انفرادی فائدے کی طرف لوٹ جانے والا جس کی ہر سطح پر بھیانک انداز میں مذمت کی جاتی رہی تھی۔اس حد تک کہ ایسی ہر کاوش بغاوت کے زمرے میں شمار ہوتی تھی۔اور باغیوں کے لیے ایک ہی راستہ تھا عمر قید یا سزائے موت۔

1956 کے اُس واقعے کو بھی دہرایا گیا جو چینی ضلع یونگ جیہ Yong Jia میں ہوا تھا۔ضلع میں قحط پھیلا ہوا تھا۔لوگوں نے ایسی ہی اصلاحات کی کوشش کی تھی۔راز فاش ہو گیا۔تحقیق پر باغی گرفتار ہوئے۔مزدور کیمپوں میں بھیجے گئے اور کچھ پھاہے لگا دیئے گئے۔

اب یان نے جی داری سے کہا۔’’دیکھو ایک تو اِس راز کی حفاظت کرنی ہے۔دوسرے اگر میں گرفتار ہو جاؤں۔سزا عمر قید میں بدل جائے یا پھانسی ہو جائے۔تب میرے بچوں کی دیکھ بھال آپ لوگوں نے کرنی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ مجھے یہ خطرہ مول لینا ہے۔یہ جوا مجھے کھیلنا ہے۔اس لیے کہ یہ میرے لوگوں کی زندگی اور ان کی بقا کا سوال ہے۔میں کیا آپ سب لوگ بھی تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے ہی دیکھ رہے ہیں۔مویشی کیا انسان کیا سب تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے ہیں۔‘‘

اب سب لوگ خاموش تھے۔وہ بھی جنہوں نے اپنے خوف اور خدشات کا اظہار کیا تھا۔بقا کی جبلت سب خطرات پر حاوی ہوگئی تھی۔پڑھے لکھوں نے یان Yan کے منصوبے پر گہری سیاہی سے دستخط کیے اوران پڑھوں نے انگوٹھے لگائے اور اپنی رضامندی پر مہر ثبت کی۔

لگن،عزم، جوش و جذبے سب مل گئے تھے۔اپنی زمینوں کے ٹکڑوں اور اپنے آلات اور ایک دوسرے کی مدد اور کچھ کر گزرنے کے جذبے پھوٹ پھوٹ کر یوں نکلے کہ سب کچھ گل و گلزار ہو گیا۔گاؤں نے تو راتوں رات خود کو غربت سے ایک طرح نکال لیا

تھا۔سرکاری لوگوں کے ٹولوں نے یہ سب حیرت سے دیکھا پر کچھ کہا نہیں۔تاہم اگلے موسم سرما میں یان Yan کو پولیس اسٹیشن بلایا گیا اور تفتیش کی گئی۔اِس مرحلے کو اس نے بہت سمجھداری اور ذہانت سے نپٹایا۔اس نے پیداوار کم بتائی۔مسائل کا ذکر بہت زیادہ کیا اور کامیاب رہا۔صبح سے شام تک وہاں رہا اور رات ہونے سے قبل رہا ہو کر گھر آ گیا۔

تاہم کب تک؟ 1980 کے اوائل میں علاقے کے پارٹی سکریٹری وان لی Wan Li نے شیاؤ گینگ کا دورہ کیا اور حیران ہوا۔مگر کوئی رکاوٹ، کوئی رخنہ نہیں ڈالا۔خاموش رہا۔تاہم آنے والے دنوں میں شہرت اردگرد پھیل رہی تھی اور لوگوں کے گروہ جوق در جوق گاؤں کو دیکھنے آرہے تھے۔بات نکل گئی تھی۔کٹڑ لوگوں نے ساتھ ساتھ اعتراضات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔

''یہ تو سراسر اشتراکیت کی راہ سے انحراف کا راستہ ہے۔یہ تو آزادی سے پہلے والے دور میں جانے کی کوشش ہے۔

یہ بھی مطالبہ ہوا کہ اپنی اِن اصلاحات کو بدل ڈالیں۔یہ سرمایہ دارنہ نظام کی طرف لے جا رہی ہیں۔ہاں اگر کہیں سے تھپکی ملی تو وہ کسان تھے کہ انہوں نے جان لیا تھا کہ اُن کے ہم عصروں کو اس سے فائدہ ہوا ہے۔تجربے نے تو آنکھیں کھول دی تھیں کہ پہلے ہی سال 22 یوآن سے 400 یوآن تک بات چلی گئی تھی۔

یہاں سچی بات ہے اونچے درجے کے سیاست دان اور سخت گیر ماؤ نواز طرز حکمرانی والے لوگ سبھی ڈگمگاتے پھر رہے تھے۔یان نے تو بصیرت سے سمجھدار افسروں کو قائل کر کے اپنے لیے راہ نکال لی تھی۔ٹیکس میں حصّہ ڈالا۔کیمون ماڈل کی فضول بیوروکریسی کے بغیر۔مگر اس کے باوجود وہ خطرات کی زد میں تھا۔مرکزی حکومت سے ہر چوتھے دن اُسے دھمکیاں ملتی تھیں۔اُس کا کہنا تھا کہ 1986 تک وہ ایک دن بھی ڈھنگ سے سویا

نہیں تھا۔ اور یہ یقیناً ایک انقلابی قدم تھا کہ پورے آٹھ سال بعد 1986 میں مرکزی حکومت نے انقلابی فیصلہ کیا۔

House hold Responsiblity System کہ اِس پالیسی کا نفاذ پورے دیہاتی علاقوں میں کروا دیا گیا۔ اِس نظام کی پُشت پر جو حکومتی سپورٹ حاصل ہوئی اُس نے تہلکہ مچا دیا۔ فالتو اناج منڈیوں میں بیچنے کا حق دوبارہ کسانوں نے حاصل کرلیا۔

تو قوموں کی زندگیوں میں بس کہیں چند لوگ ہی اٹھتے ہیں جو تبدیلی کی راہ دکھانے کا باعث بن جاتے ہیں۔ 1983 میں لوگوں کے کیمون (اجتماعی اشتراکی نظام) کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا۔ مرکزی حکومت نے زراعت کے لیے انفرادی گھرانوں کے اختیار کو در پردہ منظور کرلیا۔ کھیتی باڑی کا ماڈل جو یان کے ماڈل جیسا تھا۔ اُسے ہر سطح پر روشناس کروا دیا۔ اور پھر چین نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ آگے اور آگے۔ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال، جدید ریسرچ آج ایک ارب تیس کروڑ کی آبادی کو کھلانے پلانے میں خود کفیل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ 2018 کا سال یان کے لیے بھی حد درجہ خوشحالی اور بے مثال دولت کا منظر پیش کرتا ہے۔ ایک خاموش طبع اور کسی حد تک تنہا دکھائی دینے والا آدمی جس نے خود کو ہمیشہ قومی سطح پر اپنی پہچان کے حوالوں سے خود کو بہت بے چین اور مضطرب پایا۔

اب بہت پر امید ہو کر کہتا ہے۔

''میری نسل نے بھوک کو کم کرنے میں بہت مشقت جھیلی۔ انہوں نے ہل چلایا ہمارے بچوں کی نسل نے زراعت کو جدّت کے ساتھ جوڑتے ہوئے اِسے ترقی دی۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے پوتے مختلف النوع علوم میں طاق ہو کر اِس ملک کی اور بہتر انداز میں خدمات سرانجام دیں گے۔ نئے افق اور نئی چراگاہیں اُن کی منتظر ہیں۔''

باب نمبر۳۳:   اختتامیہ

الوداع بیجنگ، الوداع اے شہر دل ربا

الوداع چین میرے ملک کے یار غار

اور اس وقت جب اپریل کے درمیانی دنوں کی معتدل ہواؤں کے صدقے ٹنڈ منڈ درختوں پر سفید اور گلابی شگوفے کھل اٹھے ہیں۔ میں گھر کی عقبی بالکونی میں کھڑی تاریخ میں پور پور ڈوبے اس شہر سے کہتی ہوں۔ ''ارے آج کے بیجنگ، گزرے کل کے پیکنگ مجھے تو شام کے پہلے پہر تم سے رخصت ہو جانا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب بس تھوڑے ہی دنوں میں بیجنگ پھولوں کی چادروں سے سجا دل ربا سا شہر نظر آنے والا ہے۔ میرے پیارے تمہارا یہ دلہن سا روپ میں نہیں اور لوگ دیکھیں گے۔ ہمارے برصغیر کے ایک مہان گلوکار کا یہ گیت تم نے کہاں سنا ہوگا؟

یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس ہم نہ ہوں گے

اب بھلا تم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے کہ بس راز زندگی اسی آنے اور چلے جانے میں مضمر ہے۔

کچھ لوگ یادوں میں سدا فانوس کی طرح جگمگاتے ہیں۔ گونگ چو میں میکڈولنڈ کے ریسٹورنٹ میں کچھ ایسا ہی محبت بھرا منظر دیکھنے کو ملا۔ جب تھک کر آرام کے لیے وہاں گئی تھی۔ خیال تھا کچھ منہ ماری کروں گی اور نوٹس بھی بنالوں گی۔ بیٹی اور داماد جو گر لینے بازار گئے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان جوڑا تین سالہ ایک پیاری سی بچی کے ساتھ وہاں آیا اور قریبی سیٹوں پر بیٹھے۔ میں اس وقت دن بھر کی کارگزاری کے نوٹس لکھ رہی تھی۔

بچی میرے پاس آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ سر اٹھایا تو وہ حیرت بھری آنکھوں سے ایک نظر نوٹ بک اور ایک نظر میرے عجیب وغریب حلیے پر ڈالتی تھی۔

میرے پیار بھرے انداز نے اُسے بے تکلف ہونے میں پل نہیں لگنے دیا۔ مگر بیچ میں زبان آ کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی ہنستے ہوئے قریب آ گئے۔ مرد انگریزی بولتا تھا۔ اُس کا بچپن اسلام آباد میں گزرا تھا کہ باپ سفارت خانے میں تھا۔

اب تواضع تو رہی ایک طرف۔ لڑکے نے اسلام آباد کے حوالے سے بہت میٹھی یادوں کو شیئر کیا اور ساتھ ہی خواہش کی کہ میں اس کے ماں باپ سے ملوں۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔ میاں بیوی کی آنکھوں سے پھوٹتی محبت پر مجھے اتنا پیار آیا کہ میں نے اُن کے منہ ماتھے چومے اور معذرت کی کہ بیٹی بس آیا ہی چاہتی ہے اور پھر ہمیں ایر پورٹ جانا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ چین کی پرانی نسل پاکستان سے بہت مانوس ہے۔ محبت کرتی ہے۔ ''پاکستان سے ہوں'' جیسا جملہ اشاروں کی زبان سے اور پاکستان کا لفظ کہنا ہی کافی ہے۔ ان کے چہروں، ان کی آنکھوں اور ہونٹوں کے مسکرانے پر بے اختیار ہی پیار آنے لگ جاتا تھا۔ پارکوں میں، شاپنگ پلازوں میں، ریلوے اسٹیشنوں اور ایر پورٹوں پر اس محبت کے مناظر کوئی ایک دو نہیں بہت سارے ملے۔

وہ عمر رسیدہ خاتون جو بیٹی، نواسے اور شوہر کے ساتھ سمر پیلس میں ملی تھی۔ خنکی میں ڈوبی ہوئی شام مسحور کرتی تھی۔ ہر سو بکھری ہوئی ہریالی، پانی اور تعمیراتی حسن حیران کیے دیتا تھا۔ آنکھیں چہار سو بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ نظروں سے کوئی پچاس قدم دور ایک خاندان کو باتیں کرتے بھی دیکھا تھا۔ پانچ سال کا بچہ جو سائیکل پر بیٹھا بگٹٹ اُسے بھگائے میری سمت ہی چلا آ رہا تھا بھی نظروں کے حصار میں آ گیا تھا۔ دفعتاً بچہ مجھ سے کچھ فاصلے پر سائیکل سے لڑھکا اور فرش پر گر گیا۔ بھاگ کر اُسے اٹھایا۔ خاندان بھی اضطراب میں بھاگتے ہوئے پاس

آ گیا۔ بچہ خدا کا شکر ٹھیک تھا۔ اُس خاندان کی بوڑھی عورت کا پاکستان کا نام سن کر محبت کا جو انداز سامنے آیا تھا۔ اس نے بلاشبہ مسرور کر دیا تھا۔

وہ خاتون بھی ہمیشہ یاد رہے گی جو شی آن کے مسلم کواٹر کے بیل ٹاور کے سامنے والے میدان میں اپنے بیٹے، بہو اور پوتے کے ساتھ بیٹھی کھانے پینے میں مصروف تھی جس نے ہم غیر ملکی اجنبی لوگوں کو محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ اُبلے انڈوں والی پلیٹ اٹھا کر ہماری جانب آئی تھی۔ اس کی پیشکش میں جو پیار تھا اس نے میرے انسانیت کے ایمان کو تازگی دی تھی۔

تو میرے پیارے بیجنگ دیکھو سعدیہ نے آواز دی ہے۔

''اماں چار بج رہے ہیں۔ آجایئے۔''

الوداع میرے ملک کے یار غار۔ آنے والا وقت تمہیں سپر پاور کی صورت دیکھے۔

☆☆☆